یا اللہ مدد

خلافت راشدہ حق چار یار

آئین تحفظ ختم نبوت زندہ باد

مفتی محمد یوسف صاحب کے "علمی جائزہ" کا

علمی محاسبہ

از

قائد اہل سنت، وکیلِ صحابہؓ

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب دامت برکاتہم

خلیفہ مجاز حضرت مدنیؒ، بانی و امیر تحریک خدام اہل سنت پاکستان

تحریک خدام اہل السنۃ والجماعت

چکوال۔ پاکستان

یا اللہ مدد

خلافتِ راشدہ حق چار یار......☆......آئین تحفظ ختم نبوت زندہ باد

بسلسلہ ردِّ مودودیت

مفتی محمد یوسف صاحب کے "علمی جائزہ" کا

علمی محاسبہ

جس میں مسئلہ عصمت انبیاءؑ اور صحابہؓ کے معیارِ حق ہونے پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں مسئلوں کے بارے میں مودودی نظریات کی صحیح نشاندہی کی گئی ہے۔ اور ان کی رکیک تاویلات کا مدلّل جواب دیا گیا ہے۔

از

قائدِ اہل سنت، وکیلِ صحابہؓ
حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب دامت برکاتہم
خلیفہ مجاز حضرت مدنیؒ، بانی و امیر تحریک خدام اہل سنت پاکستان

ناشر
تحریک خدام اہل السنۃ والجماعت، چکوال، پاکستان

نام کتاب : علمی محاسبہ بجواب علمی جائزہ
(بسلسلہ ردِّ مودودیت)

مصنف : وکیل صحابہ، قائد اہل السنۃ والجماعت
حضرت اقدس قاضی مظہر حسین صاحب مدظلہٗ
خلیفہ مجاز حضرت مدنی قدس سرہٗ

کمپوزنگ : الحافظ کمپیوٹر کمپوزرز، ملتان

ناشر : تحریک خدام اہل السنۃ والجماعت، چکوال، پاکستان

قیمت ۱۲۰/- روپے

ملنے کے پتے

مکتبہ امدادیہ، ملتان

کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی

قدیمی کتب خانہ، آرام باغ کراچی

فہرست مضامین

عرضِ حال

"علمی محاسبہ" بجواب "علمی جائزہ" ملت اسلامیہ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔بعض تقدیری موانع کی وجہ سے اس کتاب کی اشاعت میں بہت زیادہ تاخیر ہوگئی ہے۔مودودی نظریات کی تردید میں میری پہلی تصنیف[۱] "مودودی جماعت کے عقائد و نظریات پرایک تنقیدی نظر" ہے جو ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب ماشاء اللہ بہت زیادہ مقبول ہوئی۔اس کے مطالعہ سے کئی لوگوں نے مودودی تحریک اسلامی کی فتنہ انگیزی کو سمجھا۔اس کے جواب میں گو مودودی جماعت کی طرف سے بعض رسائل و مضامین شائع کئے گئے لیکن وہ بالکل بے اثر ثابت ہوئے۔آخرکار میری اس کتاب کے جواب میں مولانا مفتی محمد یوسف صاحب سابق مدرس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور) نے ایک ضخیم کتاب (مولانا مودودی پراعتراضات کاعلمی[۲] جائزہ) تصنیف کی جو پہلی بار اگست ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں مفتی صاحب موصوف نے مسئلہ "عصمت انبیاء" اور مسئلہ "معیارحق" پر مفصل بحث کی ہے اوراپنی پوری علمی قوت مودودی صاحب کے دفاع میں خرچ کردی ہے اور مودودی جماعت کواس کتاب پر بڑا ناز ہے۔ چونکہ مذکورہ

---

۱ تنقیدی نظر کے دوایڈیشن شائع ہوئے تھے کہ میں نے ایک اور کتاب "مودودی مذہب" لکھی جس کے متعددایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

۲ مفتی محمد یوسف نے "علمی جائزہ" کا دوسرا حصہ بھی شائع کیا ہے جس میں فروعی مسائل پر بحث کی گئی ہے لیکن میں نے جائزہ کے حصہ اول ہی کا جواب لکھا ہے کیونکہ اصولی اعتقادی مسائل کی بحث اسی میں ہے جن کا جواب ضروری تھا۔

دونوں مسائل بہت اہم تھے اور مفتی صاحب موصوف نے اپنی اس کتاب میں بندہ کو جواب دینے کی بھی دعوت دی تھی۔اس لئے میں نے اس کا جواب جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور میں بعنوان "مفتی محمد یوسف کے جائزہ کی حقیقت" دیا جو ۲۵ قسطوں میں شائع ہوا۔پہلی قسط کی تاریخ اشاعت ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء اور آخری قسط کی تاریخ اشاعت ۲۹ نومبر ۱۹۶۸ء ہے۔اس کے بعد مفتی صاحب موصوف نے جواب الجواب بعنوان "یہ اتمام حجت کا آغاز ہے" ہفت روزہ "آئین لاہور" میں قسط وار شروع کردیا جس کی پہلی قسط ۲۴ دسمبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی لیکن گیارہ قسطوں کے بعد آپ نے یہ سلسلہ نامکمل چھوڑ دیا۔مفتی صاحب کے مضمون "یہ اتمام حجت کا آغاز ہے" کا جواب میں نے "ابطالِ حجت" کے نام سے شروع کردیا تھا اور یہ ارادہ تھا کہ اس کی تکمیل کے بعد اس کو ترجمان اسلام میں شائع شدہ مفصل مضمون "مفتی محمد یوسف صاحب کے جائزہ کی حقیقت" کے ساتھ ہی "علمی محاسبہ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کردیا جائے گا۔مفتی صاحب موصوف کے جواب میں "اتمام حجت" تو میں نے ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ (۲۹۔اکتوبر ۱۹۷۲ء) کو مکمل کردیا تھا لیکن پھر یہ ارادہ ہوا کہ چونکہ مسئلہ "عصمت انبیاء" اسلام کا ایک اصولی مسئلہ ہے اس لئے اس موضوع پر مستقل مضمون لکھ کر "علمی محاسبہ" کے ساتھ ہی شائع کردیا جائے تاکہ یہ بحث تشنہ تکمیل نہ رہے لیکن مختلف عوارض و موانع کی وجہ سے اس اہم موضوع "عصمت انبیاء کی حقیقت" کی تکمیل میں تاخیر ہوتی گئی اور تقریباً چار سال تک یہ کام ملتوی ہوتا رہا۔آخر کل امر مرھون بوقتہ کے تحت حق تعالیٰ کی توفیق شامل حال ہوئی اور "عصمت انبیاء کی حقیقت" کے عنوان سے یہ بحث مکمل کردی گئی۔ابھی "علمی محاسبہ" کی کتابت مکمل نہیں ہوئی تھی کہ "بانی جماعت اسلامی مودودی صاحب کے ایک مقالہ "اسلام کس چیز کا علمبردار ہے" کی حسب ذیل عبارت زیر بحث آگئی کہ "وہ یعنی رسول نہ فوق البشر ہے نہ بشری کمزوریوں سے بالاتر" حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری دام فضلھم شیخ

الحدیث وبانی مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی نے مودودی صاحب کی اس عبارت پر سخت گرفت کی اور اس کو منصب رسالت کے منافی قرار دیا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے اپنی مراد کی وضاحت کی لیکن وہ صرف ایک تاویلِ باطل تھی۔ کیونکہ خود مودودی صاحب نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن کے متعدد مقامات میں بشری کمزوریوں کا مصداق جن امور کو قرار دیا تھا اس سے ان کی جدید مراد کی تردید ہوجاتی ہے۔ چونکہ یہ بھی ایک علمی بحث تھی اور مودودی صاحب نے بجائے غلطی کے اعتراف کے اپنی زیر بحث تحریر کو صحیح قرار دیا اور ان کی کورانہ تقلید میں ان کے بعض حواریوں نے ہفت روزہ ''ایشیا'' لاہور میں علمی تلبیس سے کام لے کر حضرت مولانا بنوری کے خلاف بھی مضمون شائع کیا۔ اس لئے حسب ضرورت ''علمی محاسبہ'' میں بعنوان: ''منصب رسالت اور بشری کمزوریاں'' مودودی صاحب کی سابقہ تحریرات سے ہی مودودی صاحب کی تاویلات کی تردید کردی گئی اور یہ ثابت کیا کہ بشری کمزوریوں سے مراد انبیائے کرام علیہم السلام کے عیوب ہیں نہ کہ لوازم بشریت کھانا پینا وغیرہ۔

چنانچہ عصمت انبیاء کے سلسلہ میں ہی ایک سوال کے جواب میں مودودی صاحب نے یہ وضاحت کی ہے کہ: ان کتاب میں جس کو ہم سب پڑھ رہے ہیں اور قیامت تک پڑھتے رہیں گے۔ میں اس کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی ذاتی حیثیت میں الوہیت کی صفات نہیں رکھتے تھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی حیثیت میں ہر خطا سے بالاتر ہے اسی طرح سے نبی بھی اپنی حیثیت سے ہر خطا اور ہر لغزش اور عیب اور کمزوری سے بالاتر تھے۔ اس صورت میں نبوت اور الوہیت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔''

(ہفت روزہ آئین لاہور ۲۵ فروری ۱۹۶۸ء ص ۴)

اس سے واضح ہوا کہ مودودی صاحب کے نزدیک انبیائے کرام علیہم السلام عیب سے بھی بالاتر نہیں ہیں۔ لہٰذا حضرت مولانا بنوری کے جواب میں مودودی صاحب

کی یہ تاویل بالکل غلط ہے کہ میری مراد بشری کمزوریوں سے عیوب نہیں بلکہ کھانا، پینا خوشی، غمی، زخمی ہونا وغیرہ ہے۔

اسی سلسلہ میں علمی محاسبہ کے آخری میں ایک مضمون بعنوان ''مودودی صاحب کی تضاد بیانیاں'' بھی شامل کردیا ہے تاکہ قارئین کو مختلف پہلوؤں سے مودودی تحریک کی ہولناکیوں اور تاریکیوں سے خبردار کردیا جائے۔ علمی محاسبہ میں ایک اور اہم مضمون ''بانی جماعت اسلامی مودودی صاحب کے نام کھلی چٹھی'' بھی شامل کرنے کا ارادہ تھا لیکن کتاب کی ضخامت چونکہ پہلے ہی زیادہ ہوگئی ہے اس لئے ''کھلی چٹھی'' کو کتابی صورت میں علیحدہ شائع کیا جارہا ہے۔ جو لوگ تعصب و پارٹی بازی سے بالاتر ہوکر ''علمی محاسبہ'' اور ''کھلی چٹھی'' کا مطالعہ کریں گے ان پر انشاء اللہ تعالیٰ یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ مودودی صاحب اور ان کی ''جماعت اسلامی'' اسلام کے نام پر امت مسلمہ کے لئے دور حاضر کا ایک عظیم فتنہ ہیں۔

خادم اہل سنت
الاحقر مظہر حسین غفرلہ
خطیب مدنی جامع مسجد چکوال (پاکستان)
۱۰ ذیقعدہ ۱۳۹۶ھ، ۳ نومبر ۱۹۷۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

الحمد للہ رب العلمین o والصلوۃ والسلام علی رسولہ محمد خاتم النبیین و امام المعصومین و آلہ وصحبہ اجمعین O

مفتی محمد یوسف صاحب (مدرس جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور) کی ایک کتاب ''مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ'' حصہ اول حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے مودودی صاحب کی تائید میں ''عصمت انبیاء'' وغیرہ مسائل پر تفصیلی بحث کی ہے اور عموماً بندہ کی ایک کتاب ''مودودی جماعت کے عقائد ونظریات پر ایک تنقیدی نظر'' کی عبارات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً شیخ الاسلام حضرت مولانا السید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ نے اپنی تالیف لطیف ''مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت'' میں مودودی صاحب کی تفہیمات کی ایک عبارت کو جو عصمت انبیاء کے منافی قرار دیا ہے، اس پر بھی جواباً قلم اٹھایا ہے۔ چونکہ مفتی صاحب نے اپنی تصنیف مذکور میں راقم الحروف سے جواب کا بھی مطالبہ کیا ہے اور مفتی صاحب کی کتاب کو چونکہ مودودی جماعت زیادہ اہمیت دے رہی ہے اور ان مسائل کی حقیقت سے ناواقف لوگ غلط فہمی میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں اس لئے ضروری سمجھا کہ فی الحال ترجمان اسلام کے ذریعہ مفتی محمد یوسف صاحب کی کتاب پر مختصر تبصرہ شائع کردیا جائے جس سے طالبانِ حق مسلمانوں پر واضح ہوجائے کہ مفتی صاحب کی یہ کوشش مودودیت کے لئے کوہ کندن وکاہ برآوردن سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم.

تفہیمات کی عبارت:

مودودی صاحب کی جس عبارت کو شیخ العرب والعجم حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ

نے عصمت انبیاء کے خلاف قرار دیا ہے وہ یہ ہے:

''لیکن ان حضرات نے شاید اس امر پر غور نہیں کیا کہ عصمت دراصل انبیاء کے لوازم ذات سے نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحۃً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے ورنہ اگر اللہ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہوجائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہوسکتی ہے اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں ہوجانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں خدا نہیں ہیں۔''

(تفہیمات جلد ثانی ص۴۳۔ طبع دوم)

اس عبارت پر حضرت مدنیؒ کے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ مودودی صاحب نے یہاں صراحتاً مان لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر اپنے ارادے کے تحت ان سے ایک دو لغزشیں ہوجانے دی ہیں اس لئے تمام انبیاء اپنے زمانہ نبوت میں ہر وقت اور ہر حال میں معصوم نہ رہے اور چونکہ انبیاء کرام کی عصمت ان کی نبوت کے ساتھ ہر وقت لازم ہے اور یہ اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے اس لئے مودودی صاحب کا یہ عقیدہ جو ان کی اس عبارت سے ظاہر ہے عصمتِ انبیاء کے اصولی عقیدہ کے بالکل خلاف ہے۔

مفتی محمد یوسف کا جواب:

مفتی محمد یوسف صاحب موصوف اپنی کتاب میں یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ عصمتِ انبیاء کا عقیدہ اصولی ہے اور انہوں نے اس مسئلہ کی تفصیلات میں اہل سنت کا اختلاف بھی ذکر کیا ہے لیکن وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مودودی صاحب کی مذکورہ زیر بحث عبارت عصمتِ انبیاء کے خلاف ہے، بلکہ اس بات پر وہ مصر ہیں کہ مودودی صاحب نے

جو کچھ لکھا ہے وہ مذہب اہل سنت کے خلاف نہیں کیونکہ اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انبیائے کرام سے لغزشوں کا صدور ہوا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک تفہیمات کی عبارات سے جو کچھ مفہوم اور معنی ذہن میں آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ مولانا فرمارہے ہیں کہ:

''گناہوں سے تو انبیاء معصوم ہیں ہی۔ رہی لغزشیں تو ان سے بھی وہ عام طور پر معصوم اور محفوظ ہیں اور جو کچھ بتقاضائے بشریت لغزشیں ان سے سرزد ہوئی ہیں وہ ایک دو سے زائد نہیں۔'' یہی وجہ ہے کہ عصمت وحفاظت اٹھانے کا نتیجہ مولانا مودودی نے گناہوں کے بجائے لغزشوں کا سرزد ہونا مرتب فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک یا دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہیں۔'' (علمی جائزہ ص ۷۹۔۸۰)

الجواب (ا) (ل) مفتی محمد یوسف صاحب کے مفصل جواب کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مفتی صاحب نے نہ مودودی صاحب کی اردو عبارت کا مطلب سمجھا ہے اور نہ ہی وہ شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ کے اعتراض کو سمجھ سکے ہیں۔ اور اگر انہوں نے ان عبارات کا مطلب یہ لیا ہے تو پھر وہ ناجائز عصبیت میں مبتلا ہو کر دور از کار تاویلات کے ذریعہ مودودی صاحب کے باطل عقیدہ پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

فان کنت تدری فتلک مصیبة

وان کنت لاتدری فالمصیبة اعظم

(ب) یہ تو مفتی صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ اس عبارت میں لفظ عصمت سے مودودی صاحب کی مراد اصطلاحی عصمت ہے نہ کہ لغوی۔ لہٰذا مودودی صاحب کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام میں انبیائے کرام کی عصمت جو بنیادی عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہے وہ کبھی

کبھی انبیاء سے اللہ تعالیٰ خود ہی اٹھالیا کرتا ہے۔ خواہ ایک دو بار ہی ہو۔ اس بنا پر مفتی محمد یوسف صاحب سے میرا مطالبہ یہ ہے کہ کیا آپ مذہب اہل سنت کی یہ تشریح دکھا سکتے ہیں کہ جو عصمت اسلام کے اصولی عقائد میں تسلیم شدہ ہے وہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اللہ تعالیٰ نے خود ہی اٹھالی ہے۔ انشاء اللہ آپ کبھی بھی ایسا ثابت نہیں کرسکیں گے۔ لہٰذا آپ کا یہ لکھنا بالکل خلاف حقیقت اور التباس الحق بالباطل کی بین مثال ہے کہ:

''ہمارے نزدیک تفہیمات کی عبارات میں عصمت انبیاء کے بارے میں مولانا مودودی کا پیش کردہ عقیدہ بعینہ وہ عقیدہ ہے جو تمام اہل السنّت والجماعت کا عقیدہ رہا ہے اور دونوں کے مابین سرمو فرق نہیں''۔ (علمی جائزہ ص ۹۱)

(ج) مودودی صاحب کی یہی زیر بحث عبارت آپ کی تاویل کی بھی تردید کر رہی ہے اور مودودی صاحب کے نظریہ کی بھی۔ کیونکہ مودودی صاحب نے اس میں تصریح کردی ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر استعمال کرنے کے لئے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے''۔

جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ حفاظت وعصمت انبیاء کی ساری زندگی میں ہر آن اور ہر حال میں رہے تاکہ وہ منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر استعمال کرسکیں۔ کیونکہ بعد عطائے نبوت کوئی وقت ایسا نہیں ہے جس میں انبیاء کرام علیہم السلام منصب نبوت پر فائز نہ ہوں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مودودی صاحب کی یہ عبارت خود مفتی محمد یوسف صاحب نے بھی درج کی ہے کہ: رسول جس وقت منصب رسالت پر سرفراز ہوتا ہے اس وقت سے مرتے دم تک وہ ہر وقت اور ہر آن میں رسول ہوتا ہے اور مامور من اللہ.... اس کی زندگی کے معاملات.... سب پر اس کی حیثیت رسالت اس طرح حاوی ہوتی ہے کہ کسی حال میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے منفک نہیں ہوتی۔'' (علمی جائزہ ص ۹۸)

فرمایئے! جب رسول سے حیثیت رسالت کسی حال میں ایک لمحہ کے لئے بھی منفک نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر استعمال کرنے کے لئے ہی خطاؤں اور لغزشوں سے ان کو محفوظ فرمایا ہے تو پھر یہ بات کس طرح صحیح ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس مصلحت کے خلاف انبیاء سے لغزشیں اور خطائیں سرزد ہوجائیں اور ان کی عصمت ان سے کسی وقت منفک بھی ہوجائے۔ کیا اس صورت میں ان کی حیثیت رسالت ختم ہوجائے گی؟

الجواب (۲): اگر مفتی صاحب جواب میں یہ تاویل کریں کہ جب اہل السنّت والجماعت بالاتفاق انبیاء سے لغزشوں کا سرزد ہونا تسلیم کرتے ہیں اور مودودی صاحب نے بھی صرف لغزشوں کا سرزد ہونا لکھا ہے نہ کہ گناہوں کا۔ اس لئے مودودی صاحب کی یہ عبارت عصمتِ انبیاء کے خلاف نہیں ہوگی تو اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ اہل السنّت والجماعت انبیاء کرام سے جس لغزش کا صدور وسرزد ہونا تسلیم کرتے ہیں وہ لغزش عصمت کے ساتھ جمع ہوسکتی ہے۔ یعنی ایسی لغزش کے وقت بھی ان پر اللہ تعالیٰ کی عصمت وحفاظت کا سایہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت ان سے اٹھالی جاتی ہے۔ اگر مودودی صاحب کی مراد لغزش سے وہی تھی جو اہل سنت مراد لیتے ہیں تو پھر یہ لکھنا ان کا بالکل لغو اور جاہلانہ بات ہے کہ اس لغزش کے وقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت اٹھالی جاتی ہے۔ یا تو مفتی صاحب موصوف یہ تسلیم کرلیں کہ ان کے ممدوح مودودی صاحب کا مبلغ علم یہ ہے کہ وہ عصمت کے قائم رہنے اور اٹھائے جانے میں فرق ہی نہیں سمجھ سکتے اور یا یہ مان لیں کہ مودودی صاحب کی مراد اس جگہ وہ لغزش ہے جو عصمت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی اور وہ لغزش اور خطا ایسے گناہ کی ہی ہوسکتی ہے جو عصمت انبیاء کے منافی ہے اور اس کا قرینہ خود مودودی صاحب کی اس عبارت میں یہ الفاظ ہیں کہ:

''جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہوسکتی ہے'' ظاہر ہے کہ عام انسانوں سے تو کبیرہ گناہ بلکہ کفر

تک کی بھی غلطیاں ہوسکتی ہیں تو کیا حفاظت اٹھائے جانے کے وقت نعوذ باللہ انبیاء سے بھی ایسی غلطیاں ہوسکتی ہیں؟ اور اگر مفتی صاحب یہ جواب دیں کہ یہاں غلطی سے مراد مودودی صاحب کے نزدیک صرف لغزش ہے نہ کہ گناہ وغیرہ تو ہم کہتے ہیں کہ کیا انبیاء اور عام انسانوں سے لغزشوں کے صدور کی نوعیت ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں۔

معنی زَلت:

لفظ زلت بمعنی لغزش مستعمل ہوتا ہے اور لغزش کا مصدر لغزیدن ہے۔ جس کا معنی ہے پھسل جانا۔ اس میں قصد وارادہ کا دخل نہیں ہوتا۔ اسی لئے انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے زَلت اور لغزش کا لفظ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ ان سے قصد وارادہ کے تحت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں ہوتی چنانچہ:

۱۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں:

کبھی بھولے چوکے یا بتقاضائے محبت بھی انبیاء سے مخالفت ہوجاتی ہے البتہ عمداً نہیں ہوتی..... اگر بوجہ نسیان یا بوجہ تقاضائے محبت وعظمت مخالفت سرزد ہوجائے تو پھر اس کو گناہ نہیں کہتے بلکہ زلت کہتے ہیں جس کا ترجمہ لغزش ہے۔''

حاشیہ میں لکھتے ہیں: ''ظاہر ہے کہ لغزش اس حرکت کو کہتے ہیں جو بے اختیارانہ صادر ہو۔ (مباحثہ شاہجہان پور ص ۳۶)

۲۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ آیت واستغفر لذنبک کے تحت فرماتے ہیں:

اور اگر احیاناً کوئی خطا سرزد ہوجائے جو کمال دین میں مخل ہے سوگو وہ آپ سے سرزد ہونے کے وقت میں بوجہ آپ کے معصوم ہونے کے واقع میں خطا نہ ہوگی بلکہ مباح ہوگی بعض اوقات من وجہ عبادت ہوگی اور نیز بوجہ اسکے کہ اجتہاد سے اس کا صدور ہوا ہے۔ وہ عبادت اور موجب اجر ہے۔ لیکن

چونکہ اس اعتبار سے کہ اس فعل کا اشتغال مخل ہوگیا ہے اس سے افضل عمل میں اور عملِ افضل کا ترک آپ کی شان ارفع کے اعتبار سے صورۃً خطا ہے۔ اس لئے آپ اس خطائے صوری کی معافی مانگتے رہیے'' (بیان القرآن سورہ محمد)

اب مفتی محمد یوسف صاحب ہی فرمائیں کہ کیا عام انسانوں کی غلطی اور خطا اسی طرح کی ہوتی ہے جس طرح انبیاء کرام علیہم السلام کی ہے۔ ہرگز نہیں لہٰذا عام انسانوں کی طرح انبیاء کرام کی لغزش اور غلطی کو تسلیم کرنے کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ ان سے نعوذ باللہ کبھی کبھی گناہ سرزد ہوں، اور اسی صورت میں ہی عصمت کا اٹھایا جانا مقصود ہوسکتا ہے۔ ورنہ زلت، خطا صوری اور لغزش میں تو عصمت بحالہ قائم رہتی ہے۔

ب: لغزش سے مراد مودودی صاحب کی عبادت میں گناہ ہونے کا قرینہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق دوسری جگہ لکھ دیا کہ یـــا داؤد انـــا جعلناک خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الهوی فیضلک عن سبیل اللہ . . . . . . یہ وہ تنبیہ ہے جو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بلندی درجات کی بشارت دینے کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کو فرمائی۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوجاتی ہے کہ جو فعل ان سے صادر ہوا تھا اس کے اندر خواہش نفس کا کچھ دخل تھا اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا اور وہ ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا۔''

(تفہیم القرآن جلد۴، سورۃ ص، صفحہ ۳۲۷، طبع ششم ۱۹۷۴ء)

قارئین کرام کی سہولت کے لئے یہ بھی عرض ہے کہ تفہیمات جلد ثانی کی مذکورہ زیر بحث عبارت بھی مودودی صاحب نے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ہی ایک آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھی ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے وہ لکھ چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ معاملہ اور یاہ کی بیوی ہی کا تھا۔ مگر اس کی اصلیت صرف اس قدر تھی کہ حضرت داؤد نے اپنے عہد کی اسرائیلی سوسائٹی کے عام رواج سے متاثر ہو کر اور یاہ سے طلاق کی درخواست

کی تھی . . . . . . اس تاویل کو قبول کرنے میں لوگوں نے صرف اس بنا پر تامل کیا ہے کہ انبیاء کی طرف اس قسم کی لغزشوں کا انتساب عصمت انبیاء کے خلاف معلوم ہوتا ہے، لیکن ان حضرات نے شاید اس امر پر غور نہیں کیا کہ عصمت دراصل انبیاء کے لوازم ذات سے نہیں ہے الخ۔ اب تفہیمات اور تفسیر تفہیم القرآن کی ان دونوں عبارتوں کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک حضرت داؤد علیہ السلام سے اور یاہ کی بیوی کے معاملہ میں جو لغزش ہوئی تھی وہ کوئی ادنیٰ لغزش نہیں تھی۔ جس کو علمائے اہل سنت ترک اولیٰ اور زلت سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ انبیاء کرام سے جو لغزش ہوتی ہے اس میں ان کی نفسانی خواہش کا دخل نہیں ہوتا بلکہ منشاء اور مقصد ان کا رضائے الٰہی کا حصول ہی ہوتا ہے۔ لیکن مودودی صاحب حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش کے متعلق صاف لکھ رہے ہیں کہ:

''جو فعل ان سے صادر ہوا تھا اس کے اندر خواہش نفس کا کچھ دخل تھا'' (العیاذ باللہ)

اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ فعل یہودی سوسائٹی سے متاثر ہو کر کیا تھا۔ (تفہیمات، ج۲، حاشیہ ص ۳۵، بار دوم دسمبر ۱۹۵۵ء)

اب مفتی محمد یوسف صاحب ہی بتلائیں کہ معاملہ بھی ایک منکوحہ عورت کا ہو (جس کا خاوند زندہ ہے) اور وہ یہودی سوسائٹی کے اثر کا بھی نتیجہ ہو۔ اور پھر اس میں ان کی نفسانی خواہش کا بھی دخل ہو تو کیا ایسا فعل ترکِ اولیٰ یا عام لغزش میں شمار ہوگا یا گناہ اور معصیت اور عصمت انبیاء کے خلاف۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ محققین نے اور یاہ کے واقعہ کو بالکل بے بنیاد قرار دیا ہے اور بعض مفسرین نے جو اس کا کچھ حصہ تسلیم کیا ہے اس میں بھی انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کی نفسانی خواہش کا دخل تھا۔ اور مودودی صاحب کے لئے کسی مفسر کا قول حجت بھی نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے جن باتوں کو حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب کیا ہے ان کا ثبوت کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دینا چاہیے۔ کیا ہم مفتی صاحب سے توقع رکھ

سکتے ہیں کہ وہ مودودی صاحب کے ان اوہام کو کتاب وسنت سے ثابت کرسکیں گے؟

تفسیر حضرت تھانویؒ:

آیت لاتتبع الھوی کے تحت لکھتے ہیں:

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا۔ سو جس طرح اب تک کرتے رہے ہو اسی طرح آئندہ بھی لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور جس طرح اب تک کبھی نفسانی خواہش کی پیروی نہیں کی اسی طرح آئندہ بھی نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا کہ (اگر ایسا کروگے تو) وہ خدا کے رستہ سے تم کو بھٹکا دے گی (اور) جو لوگ خدا کے رستہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہوگا اس وجہ سے کہ وہ روزِ حساب کو بھولے رہے (یہ بات اوروں کو سنادی جو بھٹک رہے ہیں'') (بیان القرآن)

فرمایئے! عصمت انبیاء کے بارہ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تصور پاکیزہ ہے یا مودودی صاحب کا۔ ببیں تفاوت راہ از کجاست تابکجا۔

خواہش نفس کا دخل:

محققین اہل سنت کے نزدیک انبیائے کرام کے افعال نفسانی خواہشات سے پاک ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی قدس سرہٗ آیت وماینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ کے تحت لکھتے ہیں کہ:

وکذا کل مایتکلم لیس منشاہ الھوی النفسانیۃ الخ (تفسیر مظہری) اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام بھی فرماتے ہیں اس کا منشا نفسانی خواہش نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں مودودی صاحب نے حضرت نوح علیہ السلام کی اپنے کافر بیٹے کے لئے دعا کے متعلق لکھا ہے کہ:

''جب اللہ تعالیٰ انہیں تنبیہ فرماتا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا اس کو محض اس لئے اپنا سمجھنا کہ وہ تمہارے صلب سے پیدا ہوا ہے محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے''۔ الخ

(تفہیم القرآن ج ۲ سورہ ہود ص ۳۴۳)

فرمایئے کیا انبیاء جاہلیت کے جذبہ کے تحت کوئی کام کرتے ہیں۔ سبحانک ھذا بھتان عظیم حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اس حکم کے پیش نظر یہ دعا کی تھی جو حق تعالیٰ نے فرمایا تھا قلنا احمل فیھا من کل زوجین اثنین و اھلک الا من سبق علیہ القول ومن آمن (سورۃ ہود ع ۴)

''کہا ہم نے چڑھالے کشتی میں ہر قسم سے جوڑا دو عدد اور اپنے گھر کے لوگ مگر جس پر پہلے ہو چکا ہے حکم اور سب ایمان والوں کو''۔

یہاں حضرت نوح علیہ السلام نے اھلک (گھر کے لوگوں) کے عموم میں اپنے اس بیٹے کو بھی شمار کرلیا۔ لیکن اس اجتہاد میں آپ سے لغزش ہوگئی نہ کہ آپ نے جاہلیت کے جذبہ کے تحت ایسی دعاء کی تھی۔ لہٰذا مودودی صاحب نے جب انبیاء کے افعال میں نفس کا دخل اور جاہلیت کا جذبہ تسلیم کرلیا تو پھر مفتی صاحب موصوف کی یہ بات کس طرح قابل تسلیم ہے کہ مودودی صاحب بھی علمائے اہل السنّت کی طرح عصمت انبیاء کے قائل ہیں۔ اور زیر بحث عبارت میں لغزش اور غلطی سے مراد گناہ اور معصیت نہیں۔ علاوہ ازیں اگر بقول مودودی صاحب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اس معاملہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کی نفسانی خواہش کا دخل تھا تو نعوذ باللہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ گمراہی میں پڑ گئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ لاتتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ (یعنی آپ نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرنا ورنہ وہ آپ کو اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی) کیا مفتی محمد یوسف صاحب یہ نتیجہ ماننے کے لئے تیار ہیں؟ اور کیا انبیاء کے بارے میں مودودی صاحب کا یہی وہ پاکیزہ تصور ہے جس کی مدح سرائی مفتی صاحب ان الفاظ میں کررہے ہیں کہ:

''اس طرح مولانا مودودی کے عقیدہ عصمت میں دوسرے اہل السنّت کی بہ نسبت انتہائی احتیاط پائی جاتی ہے۔ لہٰذا مناسب تو یہی تھا کہ مولانا کے اس

عقیدہ کی بڑی تعریف اور تحسین کی جاتی مگر افسوس کہ اس بہترین عقیدہ عصمت کی وجہ سے انہیں الٹا گروہ اہل السنّت سے کیا بلکہ اسلام ہی سے نکال دیا گیا اور ان کا یہ پاکیزہ عقیدہ عقائد واصول اسلامیہ کے خلاف قرار دیا گیا۔"

(علمی جائزہ ص ۸۱)

مفتی صاحب کی عجیب منطق:

مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

اس مسلّم حقیقت کو پیش نظر رکھ کر جب ہم تفہیمات کی اس عبارت پر نظر ڈالتے ہیں کہ:

"یہ عصمت انبیاء علیہم السلام کے لوازم ذات سے نہیں بلکہ نبوت و رسالت کے لوازمات میں سے ہے"، (علمی جائزہ ص ۶۶)

لیکن یہ عبارت بعینہٖ مودودی صاحب کی نہیں۔ نہ اس میں "یہ" کا لفظ ہے اور نہ یہ الفاظ ہیں کہ:

"بلکہ نبوت و رسالت کے لوازمات میں سے ہے"۔ اور مودودی صاحب کے جو یہ الفاظ ہیں:

"عصمت انبیاء علیہم السلام کے لوازم ذات سے نہیں۔"

ان کی یہاں ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ علمائے حق میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے کہ عصمت بحیثیت بشریت انبیاء کے لوازم ذات میں سے ہے بلکہ علماء یہ فرماتے ہیں کہ عصمت انبیاء کی رسالت و نبوت کے لوازم ذاتیہ سے ہے۔ چنانچہ حضرت دنی قدس سرہٗ نے اس کی تصریح فرمادی ہے کہ:

"انبیائے علیہم السلام کی عصمت نبوت کے لوازم ذاتیہ میں سے ہی ہے۔ ہاں بحیثیت نبوت لوازم ذاتیہ میں سے ہے بحیثیت بشریت نہیں ہے"

(مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت ص ۲۹)

اور اگر مفتی صاحب یہ فرمائیں کہ مودودی صاحب کی عبارت کی مراد یہی ہے کہ عصمت نبوت و رسالت کے لوازمات میں سے ہے۔ تو اس پر ہمارا اعتراض یہ ہے کہ جب یہ عصمت نبوت و رسالت کے لوازمات میں سے ہے تو پھر مودودی صاحب کی یہ بات بالکل غلط ہے کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے ارادے سے یہ عصمت انبیاء سے بھی اٹھالیتے ہیں۔ کیونکہ انبیاء کی نبوت جب دائمی ہے اور کسی وقت بھی ان سے جدا اور منفک نہیں ہوسکتی تو پھر عصمت جو نبوت کے لئے لازم ہے وہ کس طرح ان سے اٹھالی جاتی ہے۔ حالانکہ لازم و ملزوم تو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔ عصمت کا اٹھنا تو اسی وقت متصور ہوسکتا ہے جب انبیاء کی نبوت بھی اٹھالی جائے۔

اب مفتی صاحب یا تو یہ مان لیں کہ عصمت کی طرح انبیاء کی نبوت بھی تھوڑی دیر کے لئے ختم ہوجاتی ہے اور یا ابوالاعلیٰ صاحب کے اس نظریے کو باطل قرار دینے کی جرأت کریں کہ عصمت انبیاء کرام سے کسی وقت اٹھالی جاتی ہے۔

دیکھئے! مفتی محمد یوسف صاحب جیسے محقق کونسی صورت اختیار کرتے ہیں۔

نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

لغزشوں کی تعداد:

مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"نیز اہل السنّت نے لغزشوں پر کوئی حد بندی بھی قائم نہیں کی ہے بلکہ مطلقاً ان کا صدور انبیاء سے جائز مانا ہے اور مولانا مودودی نے صرف دو تک لغزشوں کا صدور تسلیم کیا ہے اور زائد کا انہوں نے ذکر تک نہیں کیا ہے۔ اس طرح مولانا مودودی کے عقیدہ عصمت میں دوسرے اہل السنّت کی بہ نسبت انتہائی احتیاط پائی جاتی ہے۔" (علمی جائزہ ص ۸۱)

الجواب (ا) یہ تو آپ نے دبی زبان میں مان لیا کہ مودودی صاحب اہل السنّت سے جدا ہی چلتے ہیں۔ مبارک ہو۔

(ب) مودودی صاحب اور آپ کے پاس اس امر کی کیا دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے دو سے زیادہ لغزشیں سرزد نہیں ہوئیں۔ کیا اس پر آپ کوئی نص پیش کر سکتے ہیں؟ مودودی صاحب نے تو یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے ایک دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہیں۔ لیکن کیا اہل السنّت نے یہ تصریح کی ہے کہ ہر نبی سے ضرور لغزش کا صدور ہوا ہے۔ اگر ایسا ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دو لغزشیں ثابت کریں۔؟

(ج) یہ آپ کا لکھنا بھی بالکل جھوٹ ہے کہ مودودی صاحب نے دو سے زائد لغزشوں کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ مودودی صاحب نے ڈاکٹر عبدالودود کے جواب میں لکھا ہے کہ:

”حضورؐ سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس وہی چند لغزشیں ہوئی ہیں جس کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرمادی۔ (منصب رسالت نمبر ۷ ص ۸۷)

کیا مفتی صاحب کے نزدیک لفظ چند کا اطلاق صرف دو پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ:

”پھر آپ نے کچھ تو سوچا ہوتا کہ وہ لغزشیں ہیں کیا جن پر اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اپنے نبی کو ٹوکا ہے۔

(۱) جنگ میں فوجی خدمت سے استثناء کی درخواست پر کسی کو مستثنیٰ کر دینا۔
(۲) کسی حلال چیز کو نہ کھانے کا عہد کر لینا۔
(۳) ایک صحبت میں چند اہم شخصیتوں کو دین کی دعوت دیتے ہوئے بظاہر ایک غیر اہم شخصیت کی طرف توجہ نہ کرنا“ (ایضاً ص ۸۷)

یہاں مودودی صاحب نے تین لغزشوں کا خود ذکر کر دیا۔

پانچ لغزشیں.

اور طرفہ یہ کہ خود مفتی محمد یوسف صاحب نے اپنی کتاب کے ص ۱۰۴ میں مودودی صاحب کے حوالہ سے امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی جو لغزشیں درج کی ہیں ان کی تعداد پانچ ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

مولانا مودودی نے فرمایا ہے:

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کبھی باقتضائے بشریت اجتہادی لغزش ہوئی ہے، وحی جلی سے اس کی اصلاح کی گئی ہے۔

(۱) عبس وتولّٰی ان جآء ہ الاعمٰی (عبس)
(۲) ماکان لنبی ان یکون له اسرٰی (انفال)
(۳) عفا الله عنک لم اذنت لهم (توبه)
(۴) ولا تصل علی احد منهم مات ابداً (توبه)
(۵) یآ ایها النبی لم تحرم ما احل الله لک (تحریم)

(تفہیمات ج ۱، ص ۲۲۹، طبع پنجم ۱۹۴۹ء، رسالت اور اس کے احکام)

ماشاء اللہ مفتی صاحب نے تو یہاں مدعی سست گواہ چست کی مثل تازہ کر دی ہے۔ کیا مفتی صاحب اپنی اس غلط بیانی سے رجوع کر لیں گے کہ مودودی صاحب نے دو سے زائد لغزشوں کا ذکر تک نہیں کیا۔ مفتی صاحب کیا آپ مودودی صاحب کے مخالفین کو اسی قسم کے خوف خداوندی کی تلقین فرمایا کرتے ہیں ؎

اتنی نہ بڑھا پاکئ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

عصمت کا عطائی ہونا:

مودودی صاحب کے باطل عقیدہ کی تائید کے لئے مفتی محمد یوسف صاحب موصوف نے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ:

”یہ عصمت عطائی ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی نے انہیں عطا فرمائی ہے، اگر ان سے تھوڑی دیر کے لئے اللہ تعالیٰ کی حفاظت اٹھ جائے تو عام انسانوں کی طرح ان سے بھی بھول چوک اور لغزش ہو سکتی ہے“۔

اس کے بعد (تبصرہ) کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"اس جزء کو جب عقل اور نقل دونوں کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں تو ذہن میں انکار کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں آتی۔ کیونکہ ابھی شق (۲) کے تبصرے میں یہ بات واضح ہوگئی کہ عصمت وصفِ نبوت و رسالت کے لوازمات میں سے ہے اور نبوت و رسالت دونوں عطائی نعمتیں ہیں جو انبیاء کو بوقت بعثت من جانب اللہ عطا کی جاتی ہیں۔ وہ ذاتی اور پیدائشی نہیں ہیں اور جب نبوت عطائی نعمت قرار پائی تو کیوں یہ نہ تسلیم کیا جائے کہ عصمت بھی اپنے ملزوم کی طرح اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی صفت ہے۔ جو انبیاء کو من جانب اللہ نصیب ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں بھی اس حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

"ولو لا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئاً قلیلاً ○ الآیۃ (بنی اسرائیل ع ۱۸) اگر ہم نے تم کو حق پر ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف تھوڑا سا مائل ہوتے۔ اور ہم اس وقت تم کو دنیا میں بھی دوگنی سزا دیتے اور آخرت میں بھی۔ پھر تم ہمارے بالمقابل کوئی مددگار نہ پاتے۔

(علمی جائزہ ص ۶۸۔۶۹)

الجواب (ا): اس میں کسی کو انکار نہیں کہ نبوت اور عصمت دونوں عطائی نعمتیں ہیں۔ لیکن عطائی ہونے سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ اللہ تعالیٰ عطا کرنے کے بعد ان کو سلب بھی کرلیتا ہے۔ اگر مفتی صاحب کے نزدیک عصمت اٹھائے جانے کی علت عطائی ہونا ہے تو نبوت بھی اٹھائی جانی چاہیے کیونکہ وہ بھی عطائی ہے۔ علاوہ ازیں اگر آپ خواہ مخواہ اس عقیدہ پر مصر ہیں کہ بوجہ عطائی ہونے کے عصمت اٹھالی جاتی ہے تو پھر ملزوم (نبوت و رسالت) اٹھایا جانا بھی تسلیم کرنا پڑے گا اور چونکہ اس میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے اس لئے جب تک نبوت و رسالت قائم ہے لامحالہ عصمت بھی قائم رہے گی۔ مفتی صاحب کی یہ ایک مثالی بوالعجبی ہے کہ ملزوم کا وجود اور لازم کا عدم دونوں ایک آن میں تسلیم کرتے ہیں۔ کیا سالہا سال تدریس کرنے کے بعد بھی یہی فہمِ کلام کی نعمت نصیب ہوئی ہے۔

(ب) اپنے موقف کی تائید میں جن آیات سے استدلال کیا ہے اس نے تو مفتی صاحب کے علم و فہم کا پردہ بالکل ہی فاش کر دیا ہے کیونکہ آیت لولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلاً ○ تو صاف صاف ان کے نظریہ کی تردید کر رہی ہے۔ آیت میں لولا حرف شرط پایا جاتا ہے جو جملہ اولیٰ کے اثبات اور جملہ ثانیہ کی نفی پر دلالت کرتا ہے۔ آیت کا مفاد یہ ہے کہ چونکہ حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ثبات و استقامت بخشی ہے اس لئے کفار کی طرف ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی نہیں پایا گیا۔ کیا مفتی صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ بحث اس میں ہے کہ انبیاء سے عصمت اٹھالی جاتی ہے یا نہیں۔ آیت سے تو مودودی صاحب کے نظریہ کے خلاف یہ ثابت ہوا کہ عصمت نہیں اٹھائی گئی۔ اس کے بعد مفتی صاحب نے جو امام رازیؒ اور علامہ آلوسیؒ کے اقوال پیش کئے ہیں ان کا اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور نہ وہ آپ کے مؤید ہیں۔ کیونکہ بحث اس میں نہیں کہ عصمت عطائی ہے یا ذاتی بلکہ اس میں ہے کہ باوجود عطائی ہونے کے کیا عصمت انبیاء کی دائمی ہے یا کسی وقت اٹھالی جاتی ہے کیا مفتی صاحب کی قرآن فہمی کا یہی منتہیٰ ہے؟ کاش کہ وہ اپنے کسی شاگرد سے ہی آیات کا مطلب سمجھ لیتے۔ اس آیت کے تحت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ آپ (ﷺ) پیغمبر معصوم ہیں جن کی عصمت کی سنبھال حق تعالیٰ اپنے فضلِ خصوصی سے کرتا ہے تو ان چالاک شریروں کی فریب بازیوں سے بہت ہی تھوڑا سا ادھر جھکنے کے قریب ہو جاتے۔ مگر انبیاء کی عصمت کا تکفل ان کا پروردگار کر چکا ہے۔ اس لئے اتنا خفیف جھکاؤ بھی نہ پایا گیا۔"

(ج) اسی آیت کے تحت علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں:

"اگر بفرضِ محال ادنیٰ سے ادنیٰ غلطی ہو تو دنیا میں اور برزخ و آخرت میں دوگنا مزہ چکھنا پڑے۔"

فرمائیے! مفتی صاحب تو اس آیت سے عصمت اٹھائے جانے کے وقوع پر

استدلال کر رہے ہیں۔ اور علامہ عثمانیؒ عصمت کے اٹھنے کو محال فرما رہے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم مفتی صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ اس قسم کی آیات سے اگر آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عصمت کا کسی وقت اٹھایا جانا تسلیم کرتے ہیں تو اس کا وہ نتیجہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر ایسا ہوا تو (نعوذ باللہ) محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا و آخرت میں دوگنی سزا ملے گی۔ کیا مودودیت کی حمایت میں آپ یہ نتیجہ ماننے کے لئے آمادہ ہیں؟

نہ تم انکارِ حق کرتے نہ ہم تردیدیوں کرتے
نہ کھلتے راز سربستہ نہ یوں رسوائیاں ہوتیں

حضرت شیخ المدنی قدس سرہٗ نے مودودی صاحب کی زیر بحث عبارت پر جو اعتراض کیا تھا اس کا صحیح جواب انشاء اللہ مفتی محمد یوسف صاحب اور مودودی صاحب سمیت ان کی ساری پارٹی کبھی نہیں دے سکتی۔ کاش کہ مفتی صاحب موصوف حضرت مدنیؒ جیسے علم وتقویٰ کے پہاڑ سے اپنا سر مارنے کی کوشش نہ کرتے۔



حضرت یونس علیہ السلام اور فریضۂ رسالت

بحث دوم:

بندہ نے اپنی کتاب "تنقیدی نظر" میں مودودی صاحب کی اس عبارت پر گرفت کی تھی جو انہوں نے اپنی تفسیر میں حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق لکھی ہے۔ مفتی صاحب موصوف نے مودودی صاحب کی حمایت میں اس مقام پر بھی تفصیلی تبصرہ کیا ہے جس کا مفصل جواب، تو انشاء اللہ مستقل کتاب میں دیا جائے گا۔ فی الحال مختصر گذارشات پر اکتفاء کرتا ہوں۔

مودودی صاحب کی عبارت:

مودودی صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"قرآن میں اس قصہ کی طرف دو تین جگہ صرف اشارات کئے گئے ہیں، کوئی تفصیل نہیں دی گئی، اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قوم کن خاص وجوہ کی بنا پر خدا کے اس قانون سے مستثنیٰ کی گئی کہ عذاب کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کسی کا ایمان اس کے لئے نافع نہیں ہوتا ...... تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفہ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یونس سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے جب آثارِ عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ واستغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا۔ قرآن مجید میں خدائی دستور کے جو اصول وکلیات بیان کئے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت پوری نہیں

کرلیتا۔ پس جب نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کر گیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا کیونکہ اس پر اتمامِ حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں'' (تفہیم القرآن جلد دوم سورہ یونس ص ۳۱۲۔۳۱۳۔طبع اول)

اس عبارت پر گرفت کرتے ہوئے بندہ نے تنقیدی نظر میں یہ لکھا تھا کہ:

''یہاں مودودی صاحب نے حضرت یونس علیہ السلام کی طرف تین باتیں منسوب کی ہیں:

(۱) ان سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود بے صبر ہو کر اپنے مقام سے ہٹ گئے۔

(۳) آپ قوم پر اتمامِ حجت نہ کر سکے۔

حالانکہ یہ تینوں الزامات غلط ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی وقت مقرر نہیں فرمایا تھا جس کا حضرت یونس علیہ السلام کو علم ہوتا۔ پیغمبر بے صبر ہو کر امتحان گاہ سے نہیں ہٹتے۔ بلکہ وہ صبر کا کامل نمونہ ہوتے ہیں، نیز انبیاء فریضہ رسالت کی ادائیگی میں معصوم ہوتے ہیں۔ الخ۔

بندہ کے ان اعتراضات کے جواب میں مفتی محمد یوسف صاحب نے گو تفصیل سے کام لیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صحیح جواب دینے سے قاصر رہے ہیں کیونکہ نمبر۲ کا تو بالکل جواب ہی نہیں دیا۔ جس میں میرا مطالبہ یہ تھا کہ مودودی صاحب یہ ثابت کریں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کے لئے کوئی وقت مقرر کیا تھا اور اسی کا جواب زیادہ ضروری اور مقدم تھا۔

چیلنج: اب بھی میری طرف سے مفتی محمد یوسف صاحب کو چیلنج ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کے لئے کوئی وقت مقرر فرمایا تھا۔ اور اگر وہ یہ ثابت نہ کر سکیں اور انشاء اللہ کبھی بھی ثابت نہیں کر سکیں گے تو مودودی صاحب کے اس الزام سے برأت کا اعلان کریں۔ جو نہ صرف حضرت یونس علیہ السلام بلکہ خود اللہ

تعالیٰ پر بھی افتراء ہے۔ کیا یہ معمولی جرم ہے کہ ایک پیغمبر کے معاملہ میں ایک خود ساختہ بات حق تعالیٰ کی طرف منسوب کردی جائے۔ سبحانک ھذا بھتان عظیم۔

۲۔ نمبر۲ کی جز دوم کے متعلق عرض یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے مقام کو بے صبری کی وجہ سے نہیں چھوڑا بلکہ انہوں نے اس میں اجتہاد سے کام لیا اور عذاب الٰہی کی خبر دینے کے بعد قوم میں ٹھہرنا ضروری نہ سمجھا۔ ہاں یہ بات جدا ہے کہ اس اجتہاد میں آپ سے لغزش ہوگئی۔ کیونکہ آپ کے لئے بہتر یہی تھا کہ بلا اذن خداوندی وہاں سے نہ جاتے۔ ہاں اگر حضرت یونس علیہ السلام قوم میں ٹھہرنا ضروری سمجھتے اور پھر محض حوصلہ ہارنے کی وجہ سے وہاں سے چلے جاتے تو یہ بے صبری پر محمول ہو سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ چنانچہ امام رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ان ذنبہ کان لان اللہ تعالٰی وعدہ انزال الاھلاک بقومہ فظن انہ نازل لامحالۃ فلاجل ھذا الظن لم یصبر علی دعائھم الخ (تفسیر کبیر جلد۷ ص ۱۵۸)

یعنی حضرت یونس علیہ السلام کی لغزش یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کے ساتھ قوم پر عذاب نازل کرنے کا وعدہ فرمایا تھا، پس آپ علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ لامحالہ عذاب تو نازل ہوگا اس لئے اس خیال کی وجہ سے آپ علیہ السلام قوم میں دعوت کے لئے نہ ٹھہرے۔ الخ

امام رازی کی اس عبارت کو مفتی صاحب نے بھی اپنی کتاب کے ص ۱۲۹ پر درج کیا ہے۔ لیکن اس کے ترجمہ میں انہوں نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ انہوں نے لفظ ذنب کا ترجمہ گناہ سے کیا ہے تاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں یہ بات آئے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے اس معاملہ میں کوئی گناہ ہوگیا تھا۔ حالانکہ لفظ ذنب کا اطلاق ادنیٰ سے ادنیٰ لغزش پر بھی ہوتا ہے جس کا گناہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وضاحت فرمائیں۔

کیونکہ اس میں اللہ کے انتخاب پر بھی حرف آتا ہے''

اس سوال کا جواب مودودی صاحب سے یہ منقول ہے کہ:

''اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس طرح کے سارے اعتراضات جمع کر لیجئے اور اللہ تعالیٰ کے پاس بھیج دیجئے اور اس سے پوچھئے یہ آپ نے کیا کیا ہے؟''

اب مفتی محمد یوسف صاحب ہی بتائیں کہ یہ بھی کوئی جواب ہے اگر کوئی سائل آیات قرآنی کے متعلق دوسرے مسائل میں بھی اس قسم کا سوال کرے تو سب کا مودودی صاحب یہی جواب دیں گے؟ اس کے علاوہ مودودی صاحب نے یہ جواب دیا ہے کہ:

''قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی ایسے واقعہ کا ذکر فرمایا ہے جو کسی نبی سے صادر ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے یہ گذارش کرنا کہ اس کو بچالیا جائے وغیرہ'' .....

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو یہ خبر نہیں تھی کہ نبی سے یہ کام ہونے والا ہے۔ اگر خبر نہیں تھی کہ نبی سے یہ کام ہونے والا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے علم پر الزام آتا ہے یعنی نبوت کے بجائے خود الوہیت معرض خطر میں پڑ جاتی ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کو خبر تھی تو اس کے کیا معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ نبی عنقریب ایسا کام کرنے والا ہے جو اسے پسند نہیں لیکن وہ اسے ہوجانے دیتا ہے۔ عصمت انبیاء کا تقاضا تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس فعل کے سرزد ہونے سے پہلے اپنے نبی کو روک دیتا۔

عصمتِ انبیاء کا تقاضا تو یہ تھا مگر قرآن مجید کی گواہی یہ ہے کہ بعض واقعات ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء سے صادر ہوجانے دیئے ہیں۔ کسی سے ایک واقعہ کسی سے دو واقعے صادر ہوجانے دیئے ہیں۔ اور صادر ہوجانے کے بعد پھر متنبہ کیا۔ اور چونکہ فریضہ رسالت اور منصب نبوت کی ذمہ داری ایک ایسا اہم اور بنیادی امر ہے کہ اسی کے لیے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا جاتا ہے۔ اسلئے اس بارے میں مودودی صاحب اور مفتی

محمد یوسف صاحب کے اپنے قیاسات اور استنباطات کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اگر وہ اپنے اس موقف کو صحیح اور حق سمجھتے ہیں تو ان کو کوئی نص قرآن و حدیث سے پیش کرنی چاہیے لیکن وہ انشاء اللہ ایسی کوئی نص نہیں پیش کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مودودی صاحب نے اپنے اس الزام اور دعویٰ کی بنیاد قرآن کے اشارات اور صحیفہ یونس کی تفصیلات پر رکھی ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفہ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یونسؑ سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں۔''

اگر مودودی صاحب کے پاس اس بارے میں کوئی نص ہوتی تو وہ محرف صحیفہ یونس کی تفصیلات کا سہارا نہ لیتے۔ باقی رہے اشارات قرآنی تو وہ ان کے اوہام ہیں جن کو قرآن کے اشارات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مودودی صاحب کی بیچارگی:

حال ہی میں مودودی جماعت کے نقیب ''آئین'' لاہور مورخہ ۲۵ فروری ۱۹۶۸ء میں بعنوان ''عصمت انبیاء کا حقیقی مفہوم'' مودودی صاحب کی مجلس درس قرآن و حدیث کی کارروائی درج ہوئی ہے جس میں عصمت انبیاء کے متعلق سوال و جواب منقول ہے۔ کسی شخص نے اس مجلس میں مودودی صاحب سے سوال کیا کہ:

''قرآن مجید میں حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق جو الفاظ آتے ہیں ان سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت یونس کو اپنے فرائض کی خبر نہ تھی۔ اگر تھی تو کیا جان بوجھ کر بستی چھوڑ کر چلے گئے؟ اس سے نبی معصوم کیسے رہا؟ فیض الباری شرح البخاری میں ہے۔ الذنب غیر المعصیة یعنی ذنب معصیت سے جدا امر ہے اور قرآن مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی ذنب

کالفظ آیا ہے واستغفر لذنبک (آپ اپنے ذنب کے لئے استغفار کریں) حالانکہ یہاں ذنب سے مراد گناہ نہیں ہے۔

علاوہ ازیں مفتی صاحب نے امام رازی کی عبارت لم یصبر علی دعائھم کا ترجمہ کیا ہے کہ ''پس وہ اپنے اس خیال کی وجہ سے یہ صبر نہ کر سکے کہ قوم کو دعوت حق برابر دیتے رہیں'' اور بندہ نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ: ''اس لئے اس خیال کی وجہ سے آپ قوم میں دعوت کے لئے نہ ٹھہرے'' اور امام رازی کی عبارت کا مفہوم یہی ہے جو ہم نے پیش کیا ہے۔ کیونکہ یہاں عدم صبر سے مراد وہ نہیں جو ہارنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ امام رازی کی اس عبارت پر آئندہ صفحات میں مزید بحث آرہی ہے۔

کیا حضرت یونس علیہ السلام نے فریضۂ رسالت میں کوتاہیاں کیں؟

حضرت یونس علیہ السلام کی عصمت کے سلسلے میں یہاں اہم بحث یہی ہے کہ فریضہ رسالت کی ادائیگی میں حضرت یونس علیہ السلام نے کوتاہیاں کیں یا نہ؟ مفتی صاحب کا موقف مودودی صاحب کی حمایت میں یہی ہے کہ حضرت یونس نے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں کیں ___ اور بندہ کا موقف علمائے حق کی پیروی میں یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی لغزش کا تعلق فریضہ رسالت سے نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب موصوف نے اپنی تائید میں گو متعدد تفاسیر کے حوالے نقل کئے ہیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی صراحت نہیں ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی اس لغزش کا تعلق فریضہ رسالت سے تھا، چپکے سے نہیں کر دیا کہ جبرئیلؑ آتے اور چپکے سے کہتے کہ یہ کام آپ نے ٹھیک نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے متنبہ بھی ڈنکے کی چوٹ پر کیا اور اپنی کتاب میں اس تنبیہ کو درج فرمایا۔ اس کتاب میں جس کو ہم سب پڑھ رہے ہیں اور قیامت تک پڑھتے رہیں گے۔ میں اس کا مطلب یہ سمجھا ہوں کہ اللہ تعالیٰ یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنی ذاتی حیثیت میں الوہیت کی

صفات نہیں رکھتے تھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی حیثیت میں ہر لحاظ سے بالاتر ہے، اس طرح سے نبی بھی اپنی حیثیت سے ہر خطا اور ہر لغزش اور عیب اور کمزوری سے بالاتر تھے۔ اس صورت میں نبوت اور الوہیت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ انبیاء علیہم السلام جو بے خطا ہیں تو اپنی ذاتی حیثیت میں نہیں بلکہ نبی ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ انہیں بچاتا ہے۔ اور عصمت انبیاء کے معنی بھی یہی ہیں۔

عصمت کے معنی بچانے کے ہیں، بے خطا ہونے کے نہیں ہیں۔ (خود عصمت کے معنی بچانے کے ہیں) یعنی اگر نبی سے خطا نہیں ہوتی تو اس لئے نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ ان کو بچاتا ہے ___ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن مجید کے ذریعہ بتاتا ہے کہ یہ انسان تھے لیکن بے خطا اس لئے تھے کہ ہم ان سے کام ایسا لینا چاہتے تھے۔ اگر یہ خطا کار ہوتے تو پھر دنیا کی اصلاح کیسے کر سکتے تھے۔ اس لئے ہم نے انہیں خطاؤں سے بچا رکھا تھا۔ لیکن دیکھ لو تھوڑی دیر کے لئے ہم نے ذرا اپنی عصمت ان سے اٹھائی تو ان سے یہ فعل سرزد ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ انسان ہیں۔ اللہ کے بچانے سے بچے ہیں۔ الٰہ نہیں ہیں الخ۔

(آئین لاہور ۲۵ فروری ۱۹۶۸ء ص ۴)

تبصرہ:

(الف) مودودی صاحب کا یہ جواب لیڈرانہ تو ہے لیکن عالمانہ اور محققانہ نہیں۔ کیونکہ سائل نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ انبیاء کرام سے لغزشوں کے صدور میں کیا حکمت ہے بلکہ سوال خاص حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق تھا اور یہ کہ کیا حضرت یونس کو اپنے فرائض کی خبر نہ تھی۔ اگر تھی تو کیا جان بوجھ کر بستی چھوڑ کر چلے گئے الخ ___ اس کا جواب مودودی صاحب کو سب سے پہلے نصوص کتاب وسنت سے یہ دینا چاہیے تھا کہ جس فریضہ رسالت میں حضرت یونس نے کوتاہی کی اس کی ان کو پہلے خبر تھی اور پھر جان بوجھ کر بستی سے چلے گئے لیکن مودودی صاحب نے اس کا جواب نہیں دیا۔ اور نہ ہی وہ کبھی دے سکتے ہیں۔

(ب) سوال یہ نہیں کہ حضرت یونسؑ سے لغزش کیوں ہوئی تھی۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ لغزش کا تعلق اگر فریضہ رسالت سے مانا جائے تو نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے انتخاب پر بھی اعتراض لازم آتا ہے کہ نبی وہ بھیجا جو اپنے فرائض رسالت ہی نہیں ادا کر سکا۔

(ج) مودودی صاحب نے جو عصمت کا لغوی معنی کر کے عصمت کا مفہوم بیان کیا ہے یہاں اس سے بحث نہیں بلکہ بحث اصطلاحی عصمت میں ہے کہ اہل اسلام کے نزدیک جس معنی میں انبیاء معصوم ہیں تو کیا وہ مخصوص عصمت ان سے کسی وقت اٹھالی جاتی ہے۔ اگر وہ عصمت نبوت و رسالت کے لوازمات میں سے ہے تو پھر یہ تو محال ہے کہ نبوت ہو اور عصمت نہ ہو۔ علاوہ ازیں ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام سے وہی لغزش سرزد کرائی تھی جس کا تعلق فریضہ رسالت سے ہو _____ مودودی صاحب کی منطق کے تحت تو دوسری قسم کی لغزش سے بھی انبیاء کی الوہیت کی نفی ہو سکتی ہے۔ اور پھر اس میں لغزش کی بھی کیا حاجت ہے۔ کیا انبیاء علیہم السلام کا کھانا پینا، نکاح و اولاد، زخمی اور شہید تک ہونا الوہیت کی نفی کے لئے کافی نہیں۔ کیا نفی الوہیت کے لئے عیب دار بنانا ضروری ہے۔ مودودی صاحب نے جو اپنے جواب میں انبیاء کے اندر عیب کا ہونا بھی ضروری مانا ہے تو اس سے کیا مراد ہے؟ مفتی محمد یوسف صاحب ہی اس کی تشریح کر دیں۔

(د) مودودی صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ "یہ (انبیاء) انسان تھے لیکن بے خطا اس لئے تھے کہ ہم ان سے کام لینا چاہتے تھے کہ اگر یہ خطا کار ہوتے تو پھر دنیا کی اصلاح کیسے کر سکتے تھے" یہ تعارض بھی عجیب ہے۔ انبیاء کو خطا کار بھی ثابت کرتے ہیں اور ساتھ بے خطا بھی فرما رہے ہیں۔ یہاں جو توجیہ مودودی صاحب نے انبیاء کے بے خطا ہونے کی کی ہے علمائے حق کے نزدیک اسی بنا پر انبیاء ایسی خطا سے پاک ہیں جس کا تعلق ان کے فریضہ رسالت سے ہو کیونکہ اگر یہ اپنے فرائض میں ہی خطا کار ہوتے تو دنیا کی اصلاح کیسے کر سکتے تھے؟ ؏ لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

زیر بحث مسئلہ کی توضیح:

گو مودودی صاحب اور مفتی محمد یوسف صاحب اور ان کی ساری پارٹی اس بات پر مصر ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوئی تھیں اور وہ اس کو عقیدہ عصمت انبیاء کے منافی نہیں سمجھتے۔ لیکن مودودی صاحب کی اپنی ہی عبارت ان کے اس نظریے سے متعارض ہے جو انہوں نے تفہیمات جلد ثانی ص ۴۳ میں لکھی ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر استعمال کرنے کے لئے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے۔"

ہم پوچھتے ہیں کہ جب انبیاء کو خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ رکھنے کی مصلحت ہی یہی ہے کہ وہ منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر استعمال کریں۔ تو پھر ایسی خطاؤں کا صدور ان سے ہرگز نہ ہونا چاہیے جن کی وجہ سے ان ذمہ داریوں کے صحیح استعمال کرنے میں خلل واقع ہو۔ اور چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کا فریضہ یہی ہے کہ وہ منصب رسالت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر استعمال کریں اور اس کا تعلق ان کی ساری مقدس زندگی سے ہے۔ اس لئے ان سے ایسی خطاؤں اور لغزشوں کا صدور محال ہونا چاہیے جو اس عظیم مقصد میں حارج ہوں۔ یا تو مودودی صاحب اس ضابطہ اور اصول کو قبول ہی نہ کریں اور اگر اس ضابطہ کو ضروری تسلیم کرتے ہیں تو پھر اس بات کو تسلیم نہ کریں کہ اس ضابطہ کے خلاف اللہ تعالیٰ بالارادہ خود ہی ان سے ایسی خطائیں اور لغزشیں ہو جانے دیتا ہے جن کی وجہ سے فریضہ رسالت کما حقہ ادا نہ ہو سکے۔ فرمائیے کون سی صورت آپ کے نزدیک حق تعالیٰ کی مصلحت اور انبیاء کی عصمت کے لئے مفید ہے۔

فریضہ رسالت اسی فعل کو کہا جائے گا جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کو صریح حکم ہو۔ اس لئے مفتی محمد یوسف صاحب پر لازم ہے کہ وہ پہلے اس بات کا تعین کریں

کہ کس کس فریضہ رسالت میں حضرت یونس علیہ السلام نے کوتاہیاں کیں۔ اور اس کا ثبوت ان کو نصوص قطعیہ سے دینا چاہیے۔ کیونکہ اس کا اسلامی عقیدہ سے تعلق ہے اور مفتی صاحب یہ تصریح کر چکے ہیں کہ عقائد اسلامیہ کے اثبات کے لیے قطعیات کا ہونا ضروری ہے۔

مفتی صاحب موصوف نے عربی تفاسیر کی جو عبارات پیش کی ہیں ان سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار نہ کیا اور چلے گئے لیکن ان میں کسی نے یہ تصریح نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام سے یہ فرمایا تھا کہ جب تک میرا حکم نہ آئے آپ قوم کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے تو پھر فریضہ رسالت کی مخالفت کیسے لازم آئی۔ اگر کوئی ایسا حکم ثابت ہے تو مفتی صاحب پیش کریں۔ محض اشارات اور خود ساختہ اجتہادات سے ایک پیغمبر معصوم پر الزام لگانا بہت بڑی جسارت ہے۔ کاش کہ مفتی صاحب جس طرح اپنے ممدوح مودودی صاحب کی براءت اور صفائی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اس طرح وہ حضرت یونس علیہ السلام کے لئے کرتے؟

امام رازی کی عبارت:

تمام تفاسیر عربی، اردو سے مفتی صاحب کو صرف امام رازی کی تفسیر کبیر میں سے یہ ایک جملہ ملا ہے کہ:

فکان الواجب علیه ان یستمر علی الدعاء اس کا ترجمہ مفتی صاحب نے یہ لکھا ہے کہ: ”حالانکہ ان پر یہ واجب تھا کہ وہ دعوت پیش کرنے پر قائم رہتے“۔ (علمی جائزہ ص ۱۲۹) ان الفاظ کی بنا پر مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

”یہ عبارت اس بارے میں صریح ہے کہ حضرت یونس پر یہ کام لازم اور واجب تھا کہ وہ قوم کو تبلیغ کر کے دعوت حق پیش کرنے پر تا اذن ہجرت قائم رہتے اور بے صبر ہو کر اپنا مقام نہ چھوڑتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ بے صبری کی وجہ سے اپنا مقام چھوڑ کر چلے گئے۔ اب معترضین حضرات بتائیں کہ حضرت یونسؑ بے صبری کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہٹے تھے یا نہیں اور جب ان پر یہ واجب اور لازم تھا کہ وہ اپنی قوم میں رہ کر تبلیغ

کرتے اور بے صبر ہو کر نہ چلے جاتے تو ان کی یہ کوتاہی فرائض رسالت کی ادائیگی سے متعلق ہوئی یا نہیں۔ اب اگر ان باتوں کی وجہ سے مولانا مودودی کو عصمت انبیاء کا منکر اور گروہ اہل السنۃ سے خارج قرار دیا جائے تو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی۔ یہ باتیں تو انہوں نے بھی لکھی ہیں۔“ (علمی جائزہ ص ۱۲۹-۱۳۰)

الجواب: (۱) کیا امام رازی کا قول آپ کے لئے حجت ہے اور وہ آپ کے نزدیک معیار حق ہیں؟ آپ کو تو کتاب و سنت کی قطعیات کو ثبوت میں پیش کرنا چاہیے۔

(۲) امام رازی کی عبارت بھی آپ کے نظریہ کی مؤید نہیں ہے۔ چنانچہ امام موصوف کی عبارت یہ ہے:

والاقترب فیه وجهان الاول ان ذنبه کان لان الله تعالیٰ وعده انزال الاهلاک بقومه فظن انه نازل لا محالة فلاجل هذا الظن لم یصبر علی دعآئهم فکان الواجب علیه ان یستمر علی الدعاء. (تفسیر کبیر ج ۷ ص ۱۵۸)

”یعنی حضرت یونس علیہ السلام کی لغزش کے بارے میں دو وجہیں زیادہ قریب ہیں ان میں سے اول یہ ہے کہ آپ کی لغزش (کوتاہی) یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے قوم پر ہلاکت کا عذاب نازل کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ پس آپ اس خیال سے کہ قوم پر عذاب تو لامحالہ (یقیناً) نازل ہو گا ان میں دعوت کے لئے نہ ٹھہرے۔ تاہم آپ کے لئے یہ بہتر تھا کہ دعوت دینے میں آخر تک رہتے“

اس عبارت میں اصل بحث یہ ہے کہ لفظ واجب سے امام رازی کی کیا مراد ہے۔ بندہ کے نزدیک یہاں واجب کے لفظ سے شرعی وجوب مراد نہیں بلکہ عرفی وجوب مراد ہے۔ کیونکہ واجب شرعی وہ فعل ہوتا ہے جس کا حکم نص شرعی سے ثابت ہو۔ حالانکہ قرآن و احادیث صحیحہ سے کوئی ایسا حکم ثابت نہیں اور امام رازی بھی اس لفظ سے شرعی وجوب مراد نہیں لے رہے کیونکہ:

(الف) امام موصوف نے دوسری جگہ حضرت یونس علیہ السلام کی اس لغزش کو ترکِ اولیٰ

قرار دیا ہے۔ حالانکہ واجب شرعی کا ترک کرنا معصیت اور گناہ ہے نہ کہ معمولی لغزش اور ترکِ اولیٰ ۔ آج جن قیاسات کی بنیاد پر مودودی صاحب اور مفتی صاحب سمیت ان کی پارٹی حضرت یونس علیہ السلام پر یہ الزام عائد کر رہے ہیں امام رازی نے تو اپنے زمانے کے ایسے ہی کوتاہ بین مخالفین عصمت کے شبہات کی تردید میں دلائل پیش فرمائے ہیں اور ہر ایک کا تسلی بخش تحقیقی جواب دیا ہے چنانچہ آیت و ذا النون اذ ذھب مغاضباً کی تفسیر میں فرماتے ہیں ''احتج القائلون بجواز الذنب علی الانبیاء علیھم السلام بھذہ الآیۃ من وجوہ'' یعنی ''اس آیت سے ان لوگوں نے کئی وجوہ سے استدلال کیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کے لئے گناہ کو جائز مانتے ہیں'' اس سلسلہ میں مخالفین نے آیت فاصبر لحکم ربک ولا تکن کصاحب الحوت بھی پیش کی تھی اور مفتی محمد یوسف صاحب نے بھی اب یہی آیت پیش کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ آپ اپنے رب کے حکم کا انتظار کریں اور مچھلی والے کی طرح نہ ہوں''۔

اس کے متعلق مخالفین کا استدلال اور اپنا جواب امام رازی ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں: وذلک یقتضی ان ذلک الفعل من یونس کان محظوراً قلنا لانسلم انھا کانت محظورۃ فان اللہ تعالیٰ امرہ بتبلیغ تلک الرسالۃ الیھم وما امرہ ان یبقی معھم ابداً فظاھر الامر لا یقتضی التکرار فلم یکن خروجہ من بینھم معصیۃ.

یعنی ''مخالفین کے نزدیک یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ حضرت یونسؑ کا وہ فعل یعنی قوم کو چھوڑ کر چلا جانا ممنوع تھا ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ آپ کا وہاں سے جانا ممنوع تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا تھا کہ رسالت ان لوگوں تک پہنچائیں لیکن آپ کو خدا نے یہ حکم نہیں دیا تھا کہ ان کے ساتھ ہمیشہ ٹھہرے رہیں۔ پس تبلیغ رسالت کے ظاہری حکم سے تکرار یعنی ہمیشگی لازم نہیں آتی پس آپ کا ان لوگوں کے درمیان سے نکل جانا نافرمانی نہ تھا۔''

فرمائیے! جب امام رازی اپنے زمانے کے منکرین عصمت کے جواب میں خود

فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس کو اپنی قوم میں ہمیشہ ٹھہرنے کا حکم ہی نہیں دیا تھا تو امام رازی کی عبارت سے مفتی محمد یوسف صاحب کا یہ استدلال کرنا کہ آپ پر لازم اور واجب تھا کہ آخر تک قوم کے پاس ٹھہرے رہیں کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ بلکہ امام رازی کی عبارت سے تو مفتی صاحب کے استدلال کی بنیاد ہی اکھڑ گئی ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ مفتی صاحب کا موقف مودودی صاحب کی تائید میں آج وہی ہے جو امام رازی کے زمانے کے منکرین عصمت انبیاء کا تھا۔

(ب) امام رازی تو حضرت یونس علیہ السلام کے اس فعل کو صراحتاً ترک اولیٰ قرار دے رہے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

بل کان الاولیٰ لہ ان یصبر وینتظر الاذن من اللہ فی المھاجرۃ عنھم ولھذا قال تعالیٰ ولا تکن کصاحب الحوت کان اللہ تعالیٰ اراد لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم افضل المنازل واعلاھا (تفسیر کبیر)

''بلکہ حضرت یونسؑ کے لئے بہتر (اولیٰ) یہی تھا کہ وہاں برقرار رہتے اور قوم کو چھوڑنے کے لئے اذن خداوندی کا انتظار کرتے۔ اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے فرمایا کہ آپ مچھلی والے کی طرح نہ ہوں گویا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ اور افضل درجہ حاصل کریں۔''

تو امام رازی خود حضرت یونس علیہ السلام کے قوم کو نہ چھوڑنے کو اعلیٰ اور افضل قرار دے رہے ہیں۔ تو ثابت ہو گیا کہ امام رازی کی سابقہ عبارت میں فوجب علیہ کے الفاظ سے مراد واجب شرعی ہرگز نہیں ہے یعنی حضرت یونس نے کسی واجب حکم کو ترک نہیں کیا بلکہ ایک اولیٰ وافضل صورت کو ترک کیا۔ کیا مفتی صاحب موصوف نے امام رازی کی یہ عبارت نہیں پڑھی۔ اور کیا مفتی صاحب سالہا سال کی تدریس کے باوجود ترک واجب اور ترک اولیٰ میں فرق نہیں سمجھ سکے

گر ہمیں مکتب و ہمیں مفتی ۔۔۔ کارِ دیں بس تمام خواہد شد

(ج) شرح عقائد نسفی کی شرح نبراس میں زلات انبیاء کی بحث میں فرماتے ہیں:

فعوتبوا علیه لان ترک الافضل منهم کترک الواجب من الغیر (ص ۴۵۴)

یعنی ''انبیاء کرام پر زلات (لغزشوں) کی بنا پر عذاب اس لئے ہوا کہ ان سے کسی افضل صورت کا ترک ہونا اسی طرح سمجھا جاتا ہے جیسا کہ غیر انبیاء سے واجب کا ترک ہونا'' اس سے امام رازی کے الفاظ ''فوجب علیہ'' استعمال کرنے کی توجیہ معلوم ہوئی یہ نہیں کہ حضرت یونس نے حقیقتاً کسی واجب اور فریضہ شرعی کو چھوڑ دیا تھا''۔

(۴) اور یہی مراد صاوی حاشیہ جلالین میں لکھی ہے۔

آیت: اذ ابق الی الفلک المشحون فالاولی له انتظار الا ذن من الله هذا هو الصواب فی تحقیق المقام. یعنی اس مقام کی تحقیق میں صحیح بات یہی ہے کہ حضرت یونسؑ کے لئے اولی (بہتر) یہی تھا کہ اللہ تعالی کے حکم کا انتظار کرتے''۔

(۵) تفسیر خازن میں آیت فظن ان لن نقدر علیه کے تحت لکھتے ہیں:

''فقد تقدم معناه ای لن نضیق علیه وذلک ان یونس ظن انه مخیر ان شاء اقام و ان شاء خرج.

''پس پہلے یہ گذر چکا ہے کہ معنی اس کا یہ ہے ہم ان پر تنگی نہیں کریں گے اور یہ بوجہ اس کے ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یہ خیال فرمایا کہ آپ کو اس میں اختیار دیا گیا ہے کہ اگر چاہیں تو قوم میں ٹھہریں اور اگر چاہیں تو نکل جائیں۔''

اس سے بھی صاف ثابت ہوا کہ حضرت یونس علیہ السلام پر واجب اور ضروری نہیں تھا کہ آپ اپنی قوم میں ٹھہرے رہیں بلکہ دونوں میں اختیار تھا ورنہ حکم کے بعد تو دوسرے پہلو یعنی نکل جانے کا احتمال ہی باقی نہیں رہتا۔

انبیاء اور فریضہ تبلیغ رسالت:

تعجب ہے کہ مفتی محمد یوسف صاحب یہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ انبیاء کرام

کی عصمت کا تعلق دراصل فریضہ رسالت کے ساتھ ہی ہوتا ہے اگر اس دائرہ میں وہ معصوم نہیں ہیں تو ان کی عصمت کی حکمت و مصلحت ہی فوت ہو جاتی ہے چنانچہ حق تعالی نے اس مسئلہ کی اہمیت سمجھانے کے لئے امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں خطاب فرمایا ہے:

یآ ایها الرسول بلغ مآ انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالته والله یعصمک من الناس (مائدہ) اے رسول پہنچا دے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے، اور اگر ایسا نہ کیا تو، تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام۔ اور اللہ تجھ کو بچالے گا لوگوں سے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

علامہ عثمانیؒ:

اس آیت کے تحت شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ صاحب فرماتے ہیں:

''اگر بفرض محال کسی ایک چیز کی تبلیغ میں بھی آپ سے کوتاہی ہوئی تو بحیثیت رسول (خدائی پیغمبر) ہونے کے رسالت اور پیغام رسانی کا جو منصب جلیل آپ کو تفویض ہوا ہے سمجھا جائے گا کہ آپ نے اس کا حق کچھ بھی ادا نہ کیا ..... حضور ﷺ کے اس احساس قوی اور تبلیغی جہاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے وظیفہ تبلیغ میں مزید استحکام و تثبت کی تاکید کے موقع پر مؤثر ترین عنوان یہی ہوسکتا تھا کہ حضور ﷺ کو یآایها الرسول سے خطاب کر کے صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ اگر بفرض محال تبلیغ میں ادنی سی کوتاہی ہوئی تو سمجھو کہ آپ اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے، لہٰذا یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ کسی ایک پیغام کے پہنچانے میں ذرا سی بھی کوتاہی کریں''۔

یہاں علامہ عثمانیؒ نے بفرض محال کے الفاظ سے یہ ظاہر کر دیا کہ تبلیغ رسالت اور اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں ادنیٰ سے ادنیٰ سی کوتاہی بھی ہو جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ انبیاء اپنے فرض منصبی اور فریضہ رسالت کے ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ کیا

مفتی محمد یوسف صاحب یہ چاہتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام تو اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں کامیاب نہ ثابت ہوں اور مودودی صاحب کو ان کے پیش کردہ نظریات میں ضرور کامیابی ہوجائے۔

ع   بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

علامہ حقانیؒ:

حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں آیت:

فازلھما الشیطن عنھا کے تحت علامہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"واضح ہو کہ انبیاء کے عقائد اور تبلیغ اور فتوی میں عمداً یا سہواً خطا واقع ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ تمام اہل اسلام ان تینوں باتوں میں معصوم ہونے کے مقر ہیں۔ ہاں ان کے افعال وعادات میں کچھ اقوال ہیں"

(تفسیر حقانی ج ۲ ص ۱۵۳)

اب مفتی صاحب ہی بتائیں کہ مودودی صاحب کا یہ نظریہ جو انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے اور آپ زور شور سے اس کے حامی بنے ہوئے ہیں یہ قول اہل السنّت کے کس کھاتے میں ہے۔ اور کیا آپ مذہب اہل السنّت سے یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ انبیاء کرام سے فریضہ رسالت اور منصبِ تبلیغ کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوجاتی ہیں اور یہ بھی فرمائیں کہ اگر انبیاء علیہم السلام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوجائیں تو اہل ایمان تبلیغ رسالت کے متعلق ان کے اقوال واعمال پر من کل الوجوہ کس طرح اعتماد رکھ سکتے ہیں۔ اور اس صورت میں انبیائے کرام مطاع مطلق کیونکر ثابت ہوسکتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ط۔

"اور ہم نے ہر رسول کو صرف اسی لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے ان کی

اطاعت کی جائے" ______ یہ بھی فرمائیں کہ اگر فرض منصبی میں کسی نبی سے کوتاہی ہوجائے تو کیا اس سے اللہ تعالیٰ کے انتخاب میں نقص نہیں لازم آئے گا۔ اور جس مقصد کے لئے حق تعالیٰ انبیاء کو معصوم بناتا ہے کیا اس کے لئے ان کی عصمت دائمی نہیں رکھ سکتا۔ اگر دور حاضر میں کسی افسر کے متعلق، متعلقہ محکمہ کی یہ رپورٹ ہوجائے کہ اس نے اپنے فرائض منصبی میں کوتاہیاں کی ہیں تو کیا یہ اس کی نالائقی اور نااہلیت کی دلیل نہیں ہوگی۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اگر خود مودودی صاحب کے متعلق یہ اشتہار دیا جائے کہ انہوں نے اپنی خود ساختہ جماعت اسلامی کے ضوابط اور اصول کے بارے میں کوتاہیاں کی ہیں تو مودودی صاحب سے اس الزام کو دور کرنے کے لئے مودودیت کی ساری مشینری حرکت میں آجائے گی لیکن تعجب ہے کہ ایک پیغمبر معصوم حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق مودودی صاحب صراحتاً لکھتے ہیں کہ: ان سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوگئی تھیں ______ لیکن اس کو عصمت نبوت کی توہین نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ سالہا سال کی تدریس کے باوجود مفتی محمد یوسف صاحب ان کی کورانہ تقلید میں مودودی صاحب کی براءت اور حضرت یونس علیہ السلام کی خطا متعلقہ تبلیغ کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کاش کہ مفتی صاحب حقیقتِ عصمت سمجھ لیتے۔

مسئلہ اتمام حجت

مودودی صاحب نے حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ:

"جب آثار عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ واستغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کردیا۔ قرآن مجید میں خدائی دستور کے جو اصول وکلیات بیان کئے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک کہ اس پر اپنی حجت پوری نہیں کرلیتا۔ پس جب نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کرگیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے

بطور خود اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا کیونکہ اتمام حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔"

(تفہیم القرآن جلد۲ حاشیہ ص ۳۱۲-۳۱۳-سورہ یونس)

ہمارے پاس تفہیم القرآن جلد۲ کا جو نسخہ ہے وہ طبع اول کا ہے اس میں یہی الفاظ ہیں۔ لیکن مفتی صاحب نے اپنی کتاب ص ۱۶۴ پر جو الفاظ لکھے ہیں ان میں کچھ تغیر کے ساتھ یہ الفاظ ہیں:

"پس جب نبی سے ادائے رسالت میں کوتاہی ہوگئی اور اپنی جگہ سے ہٹ گئے" شاید دوسرے ایڈیشن میں یہ ترمیم کی گئی ہو۔ واللہ اعلم۔ بہرحال مودودی صاحب کی اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"چونکہ حضرت یونس علیہ السلام بطور اتمام حجت وہ قانونی شرائط پوری نہیں کر سکے جن کی بنا پر قوم عذاب کی مستحق ہوتی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس قوم سے عذاب اٹھالیا۔"

اس عبارت پر بندہ نے "تنقیدی نظر" میں اعتراض کیا تھا جس کے جواب میں مفتی محمد یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ:

"محترم مولانا قاضی مظہر حسین صاحب کے اعتراض کی آخری شق جس کو خلاصہ اعتراض میں نمبر۴ کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے یہ ہے کہ:

"مودودی صاحب کا یہ کہنا غلط ہے کہ قوم یونس پر اتمام حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں" کیونکہ اس طرح بعثت کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔ کیونکہ بعثت کا مقصد قرآنی اعلان کے مطابق بجز اتمام حجت کے اور کوئی چیز نہیں رسلاً مبشرین ومنذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل."

ہمارے نزدیک یہ اعتراض مولانا مودودی کی اصل عبارت پر اصلاً وارد نہیں ہوا۔ اور اگر محترم قاضی صاحب قرآن کریم ہی سے "مسئلہ اتمام حجت" کی تفصیلات

معلوم کر کے پھر مولانا مودودی کی عبارت پر غور کرتے تو شاید وہ اس طرح کے اعتراضات کرنے اور سوالات اٹھانے کی جرأت نہ کرتے۔ الخ

الجواب:

زیر بحث آیت کی تفسیر:

مفتی محمد یوسف صاحب کا جواب دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ سورہ یونس کی زیر بحث آیت کا مطلب بیان کردیا جائے تاکہ قارئین کو امر حق سمجھنے میں آسانی ہو، آیت یہ ہے:

فلولا کانت قریة آمنت فنفعها ایمانها الا قوم یونس ء لما آمنوا کشفنا عنهم عذاب الخزی فی الحیوة الدنیا و متعناهم الی حین O (سورہ یونس ع ۱۰)

مودودی صاحب نے اس کا ترجمہ یہ لکھا ہے:

"پھر کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لئے نفع بخش ثابت ہوا ہو، یونس کی قوم کے سوا (اس کی کوئی نظیر نہیں) وہ جب ایمان لے آئی تو البتہ ہم نے اس پر سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا تھا۔ اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیا تھا۔"

ترجمہ شیخ الہندؒ:

"سو کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ ایمان لاتی پھر کام آتا ان کے ایمان لانا۔ مگر یونس کی قوم جب وہ ایمان لائی، اٹھالیا ہم نے ان پر سے ذلت کا عذاب دنیا کی زندگانی میں اور فائدہ پہنچایا ہم نے ان کو ایک وقت تک"

ترجمہ حضرت تھانویؒ:

"چنانچہ جن بستیوں پر عذاب آچکا ہے ان میں سے کوئی بستی ایمان نہ

لائی کہ ایمان لانا ان کا اس کو نافع ہوتا (کیونکہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق نہیں ہوئی تھی) ہاں مگر یونس (علیہ السلام) کی قوم (کہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق ہوئی تھی اس لئے وہ عذابِ موعود کے آثار ابتدائیہ کو دیکھ کر ایمان لے آئے) اور جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے رسوائی کے عذاب کو دنیوی زندگی میں ان پر سے ٹال دیا اور ان کو ایک وقت خاص (یعنی وقت موت) تک (خیر وخوبی کے ساتھ) عیش دیا۔" (بیان القرآن)

ترجمہ مولانا عبدالحق حقانیؒ:

"پھر کوئی گاؤں بھی تو ایسا ہوتا کہ اس کا ایمان لانا اس کو نفع دیتا مگر یونس کی قوم جبکہ ایمان لائی تو زندگی دنیا میں ہم نے ان سے رسوائی کا عذاب ہٹالیا اور ایک مدت تک ہم نے رسایابسایا۔" (تفسیر حقانی)

ترجمہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ:

پھر کیوں ایسا ہوا کہ قوم یونس کی بستی کے سوا اور کوئی بستی نہ نکلی کہ (نزول عذاب سے پہلے) یقین کر لیتی اور ایمان کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتی۔ یونس کی قوم جب ایمان لے آئی تو ہم نے رسوائی کا وہ عذاب ان پر سے ٹال دیا جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا، اور ایک خاص مدت تک سروسامان زندگی سے بہرہ مند ہونے کی مہلت دیدی۔"

(قصص القرآن ج ۲ ص ۲۰۰)

ان تراجم میں سے مودودی صاحب کا ترجمہ چھوڑ کر باقی سب حضرات علماء نے اس آیت کا جو ترجمہ کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے سوا اور کوئی قوم آثارِ عذاب دیکھ کر ایمان نہ لائی۔ اور اگر وہ لوگ بھی ایمان لے آتے تو وہ بھی عذابِ دنیوی سے بچالئے جاتے" عموماً مفسرین نے آیت کی یہی تفسیر کی ہے اور یہی راجح ہے۔

آیت کی یہ تفسیر اختیار کرنے کے بعد حضرت یونس علیہ السلام کی عصمت بے غبار ہو جاتی ہے اور اس بحث کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اتمامِ حجت کی قانونی شرائط پوری کی تھیں یا نہیں۔ اگر مودودی صاحب بھی یہ تفسیر اختیار کرتے تو ان کو یونس علیہ السلام کے متعلق یہ نہ لکھنا پڑتا کہ انہوں نے اتمامِ حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں کی تھیں اور نہ علماء کو ان پر اعتراض کرنے کی گنجائش رہتی اور نہ ہی مفتی صاحب موصوف کو اس کے جواب میں تاویلات کی ضرورت پڑتی۔ اور انبیاء کرام کے معاملہ میں یہی محتاط طریق ہے، چنانچہ امام رازیؒ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

ومعلوم ان کل مذهب کان افضی الی عصمة الانبیاء علیهم السلام کان اولی بالقبول" اور ظاہر ہے کہ جو مذہب عصمۃ انبیاء کی طرف زیادہ لے جانے والا ہو وہ قبول کرنا اولیٰ بہتر ہے"۔

تفسیر دوم:

آیت کی دوسری تفسیر جو مودودی صاحب نے اختیار کی ہے اس کا مطلب یہ ہے "کہ سوائے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے اور کسی کی توبہ نزولِ عذاب کے وقت قبول نہیں کی گئی" یہ تفسیر گو مرجوح ہے لیکن اس کی روشنی میں بھی مودودی صاحب کا یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ قوم سے عذاب دنیوی ہٹائے جانے کی علت یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اتمامِ حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں کی تھیں کیونکہ:

ا۔ اللہ تعالیٰ نے کشفِ عذاب (عذاب ہٹالینے) کی جو علت بیان فرمائی ہے وہ آثارِ عذاب دیکھ کر قوم کا ایمان لے آنا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

لما آمنوا کشفنا عنهم عذاب الخزی فی الحیوة الدنیا.

"جب وہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ہٹادیا۔"

اور خود مودودی صاحب نے بھی یہ تسلیم کرلیا ہے کہ:

''جب آثار عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ و استغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کردیا''۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اگر قومِ یونس ایمان نہ لاتی تو ان سے عذاب نہ اٹھایا جاتا، اس بناء پر مفتی محمد یوسف صاحب سے ہم دریافت کرتے ہیں کہ اگر حضرت یونس علیہ السلام اتمامِ حجت نہیں کرسکے تو عذاب الٰہی کے آثار کیوں نمودار ہوئے۔ عذاب کا آنا اور پھر قوم کی توبہ و ایمان کی وجہ سے اس کو ہٹالینا اس بنا پر تھا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے فرائضِ رسالت پوری طرح ادا کردیئے تھے اور اس معنی میں بھی اتمام حجت ہوچکا تھا جس کی بنا پر مفتی صاحب دنیوی عذاب کا نزول تسلیم کررہے ہیں۔ لہٰذا حضرت یونسؑ پر مودودی صاحب اور ان کی تقلید میں مفتی صاحب کا یہ ایک بے بنیاد الزام ہے کہ انہوں نے قانونی شرائط کے تحت اتمام حجت نہیں کیا تھا۔

۲۔ مودودی صاحب نے اس زیر بحث عبارت کی ابتداء میں خود لکھ دیا ہے کہ:

''قرآن میں اس قصہ کی طرف دو تین جگہ صرف اشارے کئے گئے ہیں۔ کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قوم کن خاص وجوہ کی بنا پر خدا کے اس قانون سے مستثنٰی کی گئی کہ عذاب کا فیصلہ ہوجانے کے بعد کسی کا ایمان اس کے لئے نافع نہیں ہوتا۔''

فرمایئے! جب آپ کے پاس قوم کے عذاب سے مستثنٰی ہونے کی کوئی یقینی وجہ نہیں ہے تو پھر محض اٹکل اور ظن کی بنا پر ایک پیغمبرِ معصوم پر کیوں اس بہتان تراشی کے اثبات میں اوراق سیاہ کررہے ہیں ''ان بعض الظن اثم'' ادھر یقین بھی نہیں اور ادھر یہ بھی تحریر فرمارہے ہیں کہ چونکہ حضرت یونس نے قانونی شرائط پوری نہیں کی تھیں اس لئے قوم عذاب سے بچالی گئی

ے

بروز حشر گر پرسند خسرو را چرا کشتی
چہ خواہی گفت قربانت شوم تا من ہماں گویم

مفتی صاحب کا عجیب موقف:

فنانی المودودیت ہونے کی وجہ سے مفتی صاحب موصوف نے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ عذابِ آخرت کے لئے تو اتمام حجت اس معنی میں کافی ہے کہ انبیائے کرام قوم تک احکام خداوندی پہنچادیں اور آیت رسلاً مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل کا یہی مطلب ہے لیکن دنیوی عذاب کے نزول کی یہ شرط ہے کہ نبی آخری دم تک قوم میں دعوت و تبلیغ کرتا رہے۔ لیکن یہ فرق مفتی صاحب کا خود ساختہ نظریہ ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کسی مستند تفسیر کے حوالہ سے یہ فرق ثابت نہیں کیا، ورنہ وہ اس سے کب چوکنے والے تھے۔ اور جو آیات انہوں نے اس موقف کی تائید میں پیش کی ہیں ان سے یہ اصول ثابت نہیں ہوتا۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ مستقل کتاب میں آئے گی۔

یہاں حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے ایک حوالہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

ذلک ان لم یکن ربک مهلک القریٰ بظلم و اهلها غفلون (۱) (پ ۸، انعام)

یہاں حضرت تھانویؒ نے دنیوی عذاب کے لئے اتمام حجت کے طور پر صرف رسولوں کا مبعوث ہونا اور احکام خداوندی کا ان تک پہنچادینا علت قرار دیا ہے اور یہ شرط نہیں لگائی کہ دنیوی عذاب کے لئے انبیاء کا آخر تک قوم میں ٹھہرنا ضروری ہے اور مفتی صاحب کا یہ نظریہ تو انتہائی کوتاہ اندیشی پر مبنی ہے کہ اخروی عذاب کے لئے تو جو ابدالآباد تک رہے گا صرف احکام خداوندی کی تبلیغ کافی ہو اور دنیوی عذاب کے لئے جو وقتی ہے اور اخروی عذاب سے اخف ہے، محض تبلیغ احکام کافی نہ ہو۔ ان هذا لشئ عجاب.

بہر حال کیا مفتی صاحب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر بھی یہی حکم لگائیں گے

---

(۱) یہ اس وجہ سے ہے کہ آپ کا رب کسی بستی والوں کو کفر کے سبب ایسی حالت میں ہلاک نہیں کرتا کہ اس بستی کے رہنے والے بے خبر ہوں۔ (پ ۸، الانعام، ع ۱۶)

کہ انہوں نے قرآن کریم سے اتمام حجت کی تفصیلات کو نہیں سمجھا اور بے موقع اور بے محل قرآنی آیات کو استدلال میں پیش کر دیا؟

اصحابِ سبت کا عذاب:

مفتی محمد یوسف صاحب سے ہم دریافت کرتے ہیں کہ اگر آپ کا یہ ضابطہ صحیح ہے کہ دنیوی عذاب کے لئے نبی کا قوم میں آخر تک ٹھہرنا ضروری ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اصحابِ سبت، جو ہفتہ کے دن خود ساختہ حیلہ سے مچھلیوں کے شکار کے مرتکب ہوئے، کو دنیوی عذاب میں مبتلا کر کے بندر اور خنزیر بنا دیا گیا۔ حالانکہ اس موقع پر ان میں کسی نبی کی موجودگی کا ثبوت نہیں ملتا۔ قوم کے علماء و مبلغین ہی ان کو تبلیغ و نصیحت کرتے رہے۔ تو کیا انبیاء کی طرح انہوں نے دعوت و تبلیغ میں اتمام حجت کر دیا تھا جس بناء پر عذاب کا آنا لازمی ہوگیا۔ یہاں مفتی صاحب یہ تاویل نہیں پیش کر سکتے کہ علماء و مبلغین قوم میں آخر تک ٹھہرے رہے۔ کیونکہ ہمارا سوال یہ ہے کہ مبلغین کی دعوت و تبلیغ کیا اس نوعیت کی کامل و مکمل تھی جو انبیاء کرام کی خصوصیت ہوتی ہے، اور کیا ان سے فریضہ تبلیغ میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا جب تک مفتی صاحب ان علماء و مبلغین کو معصوم نہ قرار دیں ہمارے اعتراض کا جواب نہیں دے سکتے۔ دیدہ باید

کیا حضرت یونسؑ نے اخروی عذاب کے لئے اتمامِ حجت کر دیا تھا؟

مفتی محمد یوسف صاحب نے لکھا ہے کہ:

''اخروی عذاب کے لئے جو اتمام حجت ضروری ہے وہ صرف بعثت سے پورا ہوسکتا ہے۔ اس لئے جس قوم کے پاس بھی خدا نے اپنا کوئی نبی اور رسول بھیجا ہے اور قوم اس پر ایمان نہیں لائی ہے اس پر عذاب جہنم کے لئے۔ ''اتمام حجت'' پورا ہو چکا ہے اور قیامت کے روز اسے ضرور عذاب جہنم دیا جائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن کی مختلف اور متعدد آیتوں میں بیان کی گئی ہے۔ مثلاً

وما کنا معذبین حتی نبعث رسولاً ۝ الآیۃ

(علمی جائزہ ص ۱۶۳)

یہاں مفتی صاحب نے یہ تصریح کر دی ہے کہ اخروی عذاب کے لئے بعثتِ رسول کافی ہے لیکن اس کے ساتھ غالباً وہ یہ تسلیم کرتے ہوں گے کہ بعثتِ رسول سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کسی قوم میں صرف رسول آ جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ رسول اپنی قوم میں فرائض رسالت کو صحیح طور پر انجام دے جس پر رسلاً مبشرین و منذرین کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ لیکن مودودی صاحب نے آیت زیر بحث کی تفسیر میں جو یہ لکھا ہے کہ:

''حضرت یونس سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں'' تو اس سے مراد صرف یہ تو نہیں ہے کہ حضرت یونسؑ بلا اذن خداوندی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ کیونکہ وہ تو ایک ہی کوتاہی ہے۔ لہٰذا اس سے مراد نعوذ باللہ اس سے پہلے کی وہ کوتاہیاں ہوں گی جن کا تعلق بقول مودودی صاحب فریضہ رسالت سے ہے۔ اس بنا پر ہمارا اعتراض یہ ہے کہ پھر اخروی عذاب کے استحقاق کے لئے بھی حضرت یونس علیہ السلام کی طرف سے اتمام حجت کرنا ثابت نہ ہوا۔ کیونکہ کوتاہی اور کمی کے ہوتے ہوئے اس کو اتمام کے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے، اگر اتمام ہوگا تو اس دائرہ میں کوتاہی اور کمی نہیں ہوگی جیسا کہ اتممت علیکم نعمتی کا مفہوم ہے۔ لہٰذا مفتی صاحب کا یہ جواب بھی صحیح نہ رہا کہ مودودی صاحب کی عبارت آیت لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل کے خلاف نہیں ہے۔ اور ''تنقیدی نظر'' میں، میں نے مودودی صاحب پر جو اعتراض کیا تھا وہ بحالہ قائم رہا۔ کاش کہ مفتی صاحب جو علمی کاوشیں مودودی صاحب کی پاکدامنی کے لئے کر رہے ہیں وہ حضرت یونس علیہ السلام کی عصمت کے لئے کرتے۔

فسوف تری اذا انکشف الغبار
افرس تحت رجلک ام حمار

مسئلہ دجال:

مفتی محمد یوسف صاحب نے باب پنجم میں مسئلہ دجال پر بحث کی ہے۔ مفتی صاحب کی عادت ہے کہ وہ عموماً غیر ضروری تفصیلات درج کر کے اصل بحث پر شعوری یا غیر شعوری طور پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور یہی ان کا طریق دجال کی بحث میں ہے۔ بندہ نے ''تنقیدی نظر'' میں مودودی صاحب کے ان نظریات پر تنقید کی تھی جو انہوں نے دجال کے بارے میں لکھے ہیں۔ اس کے جواب میں مفتی صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ:

محترم مولانا قاضی مظہر حسین صاحب اپنی کتاب (''مودودی جماعت کے عقائد ونظریات پر ایک تنقیدی نظر'') میں مولانا کی مذکورہ بالا عبارت کے کچھ اقتباسات پیش کرنے کے بعد ان کا خلاصہ درج ذیل چار چیزوں کی صورت میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

بہرحال مذکورہ اقتباسات میں مودودی صاحب نے حسب ذیل امور کی تصریح کردی ہے۔

ا۔ حضورؐ کو دجال کے متعلق تفصیلات کا علم نہ تھا کہ کہاں اور کب ظاہر ہوگا۔

۲۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ شاید حضورؐ کے عہد میں ظاہر ہوجائے۔

۳۔ حضورؐ نے یہ باتیں صرف اپنے قیاس کی بنا پر فرمائی تھیں نہ کہ وحی کی بنا پر۔

۴۔ ساڑھے تیرہ سو سال کے تاریخی تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ دجال کے متعلق حضورؐ کا اندیشہ کہ وہ کہیں مقید ہے یا آپ کے عہد میں یا اس کے بعد قریبی زمانہ میں ظاہر ہونے والا ہے صحیح نہ تھا۔

پھر اس کے بعد محترم قاضی صاحب ان چار چیزوں کا رد اس طرح کرتے ہیں:

''دجال کے متعلق حضورؐ کے ارشادات پیش گوئی سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ بات منصب رسالت سے بعید ہے کہ حضور ﷺ دینی امور میں اپنے قیاس کی بنا پر پیش گوئی فرمائیں۔ انبیاء علیہم السلام آئندہ کے متعلق کوئی غیر ذمہ

دارانہ بات نہیں فرماتے، اور نہ ہی انبیاء دینی امور میں شک کی بنا پر قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم شک کی بنا پر پیشگوئی نہیں فرماتے۔ بلکہ جو کچھ آئندہ کے متعلق کہتے ہیں وحی کی بناء پر کہتے ہیں وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ لہٰذا مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ حضورؐ دجال کے ظہور کے بارے میں خود شک میں تھے۔ منصب رسالت پر ایک ناپاک حملہ ہے۔ (تنقیدی نظر ص ۸۸)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''دجال کے بارے میں حضورؐ کے تمام ارشادات کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ وہ پیش گوئی سے تعلق رکھتے ہیں حد درجہ غلط ہے۔ پیشن گوئی سے صرف وہ ارشادات تعلق رکھتے ہیں جو ظہور دجال اور صفات دجال سے متعلق ہیں اور یہ ارشادات مولانا مودودی کے نزدیک بھی مبنی بروحی ہیں۔ اور جن ارشادات کو مولانا مودودی نے مبنی برظن قرار دیا ہے وہ ارشادات وہ ہیں جو شخصیتِ دجال۔ مقامِ خروج دجال سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ وہ بھی مبنی بروحی ہیں نہ صرف غلط ہے بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے الخ۔

(علمی جائزہ ص ۳۷۷۔۳۷۸)

الجواب (۱):

بندہ نے ''تنقیدی نظر'' میں جو چار باتیں مودودی صاحب کی طرف منسوب کی ہیں ان میں سے تین کا تو مفتی صاحب نے انکار نہیں کیا البتہ انہوں نے ایک بات کی نسبت کو صحیح نہیں تسلیم کیا۔ چنانچہ ''علمی جائزہ'' ص ۳۸۱ پر لکھتے ہیں کہ:

''مودودی صاحب کے متعلق محترم قاضی صاحب کا یہ دعویٰ کرنا کہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ:

ا۔ ''حضورؐ دجال کے ظہور کے بارے میں خود شک میں تھے'' (تنقیدی

نظر" ص ۸۸) محض افتراء ہے اور صریح بہتان الخ"

اس کے متعلق عرض ہے کہ میری مراد اس سے نفس ظہور دجال کے بارے میں شک کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے خود ہی ص ۸۶ پر مودودی صاحب کے یہ الفاظ درج کر دیئے ہیں کہ:

"حضورؐ کو اللہ کی طرف سے اس معاملہ میں جو علم ملا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ بڑا دجال ظاہر ہونے والا ہے" بلکہ میری مراد لفظ ظہور سے اس کی تفصیل تھی اور تفصیل سے بھی مودودی صاحب کی وہ عبارت مراد تھی جس میں لکھا ہے کہ:

"حضورؐ کو اپنے زمانے میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید دجال آپ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے یا آپ کے بعد کسی قریبی زمانہ میں ظاہر ہو۔ لیکن کیا ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ حضورؐ کا یہ اندیشہ صحیح نہ تھا"۔ الخ

۲۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ پیش گوئی سے صرف وہ ارشادات تعلق رکھتے ہیں جو ظہور دجال اور صفات دجال سے متعلق ہیں اور یہ ارشادات مولانا مودودی کے نزدیک بھی مبنی بروحی ہیں"۔ (علمی جائزہ ص ۳۷۸)

لیکن یہ بھی غلط ہے کیونکہ مودودی صاحب صفات دجال کے بارے میں بھی بعض ارشادات کو مبنی بروحی نہیں سمجھتے بلکہ نعوذ باللہ ان کو افسانہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ کسی سائل کے جواب میں لکھا ہے کہ:

"یہ کانا دجال وغیرہ تو افسانے ہیں، جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ ان چیزوں کی تلاش کرنے کی ہمیں ضرورت بھی نہیں"۔ الخ۔

(رسائل ومسائل حصہ اول ص ۵۳۔ طبع دوم جون ۱۹۵۴ء)

یہاں صراحتاً مودودی صاحب نے دجال کے کانا ہونے کو افسانہ قرار دیا ہے حالانکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کی صفات میں سے اس کا کانا ہونا بھی بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ خود مفتی صاحب نے احادیث صحیحہ سے دجال کی جو دس صفات درج کی

ہیں ان میں پہلی صفت اس کا اعور (کانا) ہونا بھی لکھی ہے۔ (ملاحظہ ہو علمی جائزہ ص ۳۱۷) اور یہ بھی مفتی صاحب نے تسلیم کر لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کی یہ صفات مبنی بروحی ارشاد فرمائی ہیں۔ تو اب مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ کیا وحی کی ایک بات یعنی دجال کے کانا ہونے کو افسانہ کہہ کر مودودی صاحب نے وحی کی تکذیب اور رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشاد کی مخالفت نہیں کی؟ اس کے جواب میں مفتی صاحب، مودودی صاحب کی یہ تاویل پیش نہیں کر سکتے کہ: "میں نے جس چیز کو افسانہ قرار دیا ہے وہ یہ خیال ہے کہ دجال کہیں مقید ہے"۔

(رسائل ومسائل حصہ اول طبع دوم ص ۵۳-۱۹۵۴ء)

کیونکہ "دجال کہیں مقید ہے" تو مودودی صاحب کی "وغیرہ" میں داخل ہو سکتا ہے لیکن کانا دجال کو افسانہ کہنا ان کے صریح الفاظ ہیں۔ اور جواب کی تفصیل میں مودودی صاحب نے یہ نہیں کہا کہ میں دجال کا کانا (اعور) ہونا تو مانتا ہوں صرف اس کے کہیں مقید ہونے کو افسانہ قرار دیتا ہوں۔ اب مفتی صاحب سے ہمارا یہ پرزور مطالبہ ہے کہ وہ اپنے امام مودودی صاحب سے صراحتاً یہ تسلیم کرائیں کہ دجال کانا ہوگا۔ تو ہم اس اعتراض سے رجوع کر لیں گے۔ لیکن جب تک مودودی صاحب اس کو تسلیم نہ کریں مفتی صاحب موصوف مدعی سست اور گواہ چست کا مصداق ہی سمجھے جائیں گے۔

(ب) مودودی صاحب کا یہ جواب بھی منصب رسالت کی توہین پر مبنی ہے کہ:

"میں نے جس چیز کو افسانہ قرار دیا ہے وہ یہ خیال ہے کہ دجال کہیں مقید ہے"

(رسائل ومسائل حصہ اول)

کیونکہ مودودی صاحب نے خود ہی تسلیم کر لیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت تمیم داریؓ کی بات کو صحیح قرار دیا تھا کہ دجال فلاں جزیرہ میں مقید ہے اور خود مفتی صاحب نے بھی مودودی صاحب کی یہ عبارت درج کی ہے کہ:

"تمیم داریؓ کے بیان کو حضورؐ نے اس وقت تک تقریباً صحیح سمجھا تھا۔ مگر کیا

ساڑھے تیرہ سو برس تک بھی اس شخص کا ظاہر نہ ہونا جسے حضرت تمیمؓ نے جزیرے میں محبوس دیکھا تھا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ اس نے اپنے دجال ہونے کی جو خبر حضرت تمیمؓ کو دی تھی وہ صحیح نہ تھی‘‘۔

(علمی جائزہ ص ۴۷،۴۸ بحوالہ رسائل ومسائل حصہ اول طبع ثانی ص ۴۷ تا ص ۵۰)

میرے پاس رسائل ومسائل کا جو ایڈیشن ہے اس کے یہ الفاظ ہیں کہ:

’’تمیم داری کے بیان کو حضورؐ نے اس وقت غلط نہ سمجھا تھا۔ مگر کیا ساڑھے تیرہ سو برس تک بھی اس شخص کا ظاہر نہ ہونا الخ‘‘۔

اب مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ جب مودودی صاحب نے یہ مان لیا ہے کہ حضرت تمیم داریؓ کے اس بیان کو کہ دجال جزیرہ میں محبوس ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح سمجھا تو اس سے یہی لازم آتا ہے کہ ابوالاعلیٰ صاحب نے نعوذ باللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم کے اس خیالِ مبارک کو ہی افسانہ قرار دیا ہے۔

اب مفتی محمد یوسف صاحب ہی دیانتداری سے یہ فیصلہ کردیں کہ اس میں محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص وتوہین ہے یا نہیں۔ جہاں اللہ تعالیٰ صحابہ کرامؓ کو راعِنا کہنے سے منع فرمائیں اور جس دربار رسالت میں محض آواز بلند کرنے سے اعمال ضائع ہوجائیں لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی وہاں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ سلم کی ایک بات کو افسانہ کہنے کا کیا حکم ہوگا۔ کاش کہ مفتی صاحب مقام رسالت محمدیہ علی صاحبہا الصلواۃ والتحیۃ کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور مودودی فتنہ سے خود بھی بچتے اور دوسروں کو بھی بچانے کی کوشش کرتے۔

(ج) مودودی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

’’یہ تردد اول تو خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ باتیں آپ نے علم وحی کی بناء پر نہیں فرمائی تھیں اور آپ کا گمان وہ چیز نہیں ہے جس کے صحیح نہ ثابت ہونے سے آپ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو۔ یا جس پر ایمان لانے کے لئے ہم

مکلّف کئے گئے ہوں۔ پھر جب کہ بعد کے واقعات سے ان باتوں کی تردید بھی ہوچکی ہے جو اس سلسلہ میں آپ نے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ خواہ مخواہ ان کو عقائد میں داخل رکھنے پر اصرار کیا جائے‘‘

(رسائل ومسائل حصہ اول بار دوم ص ۵۶)

مفتی صاحب فرمائیں کہ مودودی صاحب کی یہ عبارت کیا گستاخانہ نہیں ہے۔ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض باتوں کی بعد کے واقعات سے تردید بھی ہوچکی ہے، العیاذ باللہ۔ اگر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض باتوں کی بعد میں تردید ہوجائے تو کیا منصب رسالت کی کوئی حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ کیا ابوالاعلیٰ کی یہ باتیں مرزا غلام احمد قادیانی کی غلط پیشگوئیوں کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتیں؟

دجال کا قتل:

(د) مودودی صاحب کا یہ لکھنا بھی بالکل جھوٹ اور افتراء ہے کہ:

’’حضورؐ کو اپنے زمانے میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید دجال آپ کے عہد میں ہی ظاہر ہوجائے۔ یا آپ کے بعد کسی قریبی زمانے میں ظاہر ہو۔ لیکن کیا ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ نے یہ ثابت نہیں کردیا کہ حضور کا یہ اندیشہ صحیح نہ تھا‘‘

(ترجمان القرآن فروری ۴۶ء ص ۵۸۔۵۹)

اس کے بعد ترمیم کرکے مودودی صاحب نے یہ الفاظ لکھے کہ:

’’کیا ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ نے یہ ثابت نہیں کردیا کہ حضورؐ کا اندیشہ قبل از وقت تھا‘‘ (رسائل ومسائل حصہ اول ص ۵۷)

روایات کی روشنی میں یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء میں یہ اندیشہ ہوا کہ شاید دجال آپ کے عہد ہی میں ظاہر ہوجائے۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر وقت تک یہ اندیشہ رہا اور اسی حالت میں آپ وصال

فرما گئے۔ کیونکہ صحیح احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ صریح ارشاد موجود ہے کہ دجال قرب قیامت میں ظاہر ہوگا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کو باب لُدّ پر قتل کریں گے، چنانچہ خود مودودی صاحب نے بھی یہ حدیث درج کی ہے:

''پھر ابن مریم دجال کا پیچھا کریں گے اور لُدّ کے دروازے پر اسے جا پکڑیں گے۔ اور قتل کر دیں گے'' (ختم نبوت ص ۴۶)

اس کے حاشیہ پر مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''واضح رہے کہ لُدّ (Lydda) فلسطین میں ریاست اسرائیل کے دارالسلطنت تل ابیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اور یہودیوں نے وہاں بہت بڑا ہوائی اڈہ بنا رکھا ہے۔''

اب مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تصریح فرما دی کہ باب لُدّ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کریں گے اور خود ابوالاعلیٰ صاحب بھی یہ حدیث نقل کر رہے ہیں تو پھر ان کا اس بات پر اصرار کرنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر تک یہ اندیشہ رہا کہ شاید دجال آپ کے عہد میں ہی ظاہر ہو جائے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ سے اس کو صحیح نہ قرار دینا۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم کے مذکورہ صریح ارشاد کی خلاف ورزی نہ ہوگی۔ اور یہاں اس تاویل کی بھی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ کی مقدس زندگی میں ہی آسمان سے نازل ہو جائیں۔

حافظ ابن حجرؒ اور مودودی:

میرے اس اعتراض کے جواب میں مفتی محمد یوسف صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''آپ مانیں یا نہ مانیں۔ مگر ہے یہ حقیقت کہ ان یخرج وانا فیکم کو مولانا مودودی کی طرح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی شک اور تردد پر حمل کیا ہے۔ چنانچہ اس جملہ کی شرح کرتے ہوئے حافظ موصوف لکھتے ہیں:

''انہ محمول علی ان ذلک کان قبل ان یتبین لہ وقت خروجہ وعلاماتہ فکان یجوز ان یخرج فی حیاتہ ثم بین لہ وقت خروجہ فاخبربہ

(فتح ج ۱۳ ص ۸۱)

''حضور ﷺ کا یہ ارشاد اس وقت کا تھا جبکہ آپ کو خروج دجال کا وقت اور علامات نہیں بتائے گئے تھے تو اس وقت آپ سمجھتے تھے کہ شاید دجال آپ کے زمانے میں ظاہر ہو جائے۔ پھر آپ کو وقت خروج بتایا گیا تو آپ نے اس کی خبر دے دی۔'' (علمی جائزہ ص ۳۸۰)۔

''تو کیا آپ کے نزدیک حافظ ابن حجرؒ نے بھی منصب نبوت پر ناروا حملہ کیا ہے''؟

الجواب:

مفتی محمد یوسف صاحب یا تو مودودی عقیدت کے غلو میں مبتلا ہو کر صحیح فکر و نظر سے محروم ہو چکے ہیں یا باوجود سمجھنے کے مودودی صاحب کی تائید میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں ورنہ ایک عام اردو دان شخص کے لئے بھی یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اور ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا یہ نظریہ اس بارے میں بالکل متضاد ہے کیونکہ علامہ ابن حجرؒ صاف طور پر لکھ رہے ہیں کہ گو ابتداء میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو ممکن سمجھتے تھے کہ دجال شاید آپ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے لیکن بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خروج دجال کا وقت بتایا گیا اور آپ نے اس کی صحابہ کرام کو خبر بھی دے دی۔ لیکن اس کے برعکس مودودی صاحب لکھ رہے ہیں کہ:

''حضور ﷺ کو اللہ کی طرف سے اس معاملہ میں جو علم ملا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ بڑا دجال ظاہر ہونے والا ہے۔ اس کی یہ اور یہ صفات ہوں گی اور وہ ان خصوصیات کا حامل ہوگا لیکن یہ آپ کو نہیں بتایا گیا کہ وہ کب ظاہر ہوگا۔ کہاں ظاہر ہوگا۔ اور یہ کہ آیا وہ آپ کے عہد میں پیدا ہو چکا ہے یا آپ کے بعد کسی بعید زمانہ میں پیدا ہونے والا ہے۔ ان امور کے متعلق جو مختلف

باتیں حضور ﷺ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے۔" الخ

(رسائل و مسائل حصہ اول و ترجمان القرآن ص ۵۸-۵۹۔ فروری ۱۹۴۶ء)

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ مودودی صاحب کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر وقت تک بھی بذریعہ وحی یہ علم نہیں دیا گیا کہ دجال قرب قیامت میں ظاہر ہوگا بلکہ یہی خیال رہا کہ شاید آپ کے زمانے میں ہی ظاہر ہو جائے۔ حالانکہ ابن حجر عسقلانیؒ نے تصریح فرمادی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دجال کے نکلنے کا وقت بتلا دیا گیا ہے۔ اور آپ نے امت کو اس کی خبر بھی دے دی۔ تو اس کے بعد مفتی صاحب موصوف یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ابن حجر اور مودودی دونوں نے ایک ہی نظریہ پیش کیا ہے۔ لہٰذا بندہ کا یہ لکھنا بالکل صحیح ہے کہ "مودودی صاحب کا یہ لکھنا کہ حضور ﷺ دجال کے ظہور کے بارے میں خود شک میں تھے منصب رسالت پر ایک ناپاک حملہ ہے"۔ (تنقیدی نظر ص ۸۸)

یہاں مفتی صاحب یہ ملحوظ رکھیں کہ میری عبارت میں "دجال کے ظہور" کے الفاظ سے مراد یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو (بقول مودودی) آخر تک یہ شک رہا کہ شاید آپ کے عہد میں ہی دجال آجائے اور اللہ تعالیٰ نے قرب قیامت میں آنے کا علم نہیں دیا۔ لہٰذا مودودی صاحب کی عبارت یقیناً قابل اعتراض رہے گی اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کا دامن اس الزام سے پاک رہے گا۔ ہاں اگر مودودی صاحب اب بھی مان لیں کہ من جانب اللہ بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خروج دجال کا وقت بتلا دیا گیا تھا۔ جس کی بنا پر یہ اندیشہ نہ رہا کہ دجال شاید حضورؐ کے عہد میں ہی ظاہر ہو جائے اور رسائل و مسائل کی زیر بحث عبارت سے رجوع کرلیں تو ہمارا یہ اعتراض ختم ہو جائے گا۔

چیلنج: ہم جناب مفتی محمد یوسف صاحب اور تمام مودودی پارٹی کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ ابن حجر عسقلانیؒ یا کسی اور مستند محدث سے اس بات کی تصریح ثابت

کردیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر تک یہ اندیشہ رہا کہ شاید دجال حضورؐ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے لیکن بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اندیشہ صحیح نہ تھا۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین O اور اگر آپ یہ ثابت نہیں کر سکتے، اور انشاء اللہ ثابت بھی نہیں کر سکیں گے، تو بجائے اس کے کہ آپ ابوالاعلیٰ صاحب کے اس بہتان کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ آپ پر لازم ہے کہ محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کو محفوظ رکھنے کے لئے مودودی صاحب کی اس بے جا جسارت اور دیدہ دلیری کی تردید کرکے اپنے ایمان کو بچائیں۔

مفتی صاحب کے غلط استدلالات

۱۔ غلط استدلال

مودودی صاحب کے نظریہ کی تائید کرتے ہوئے مفتی محمد یوسف صاحب لکھتے ہیں:

"ہمارے اس دعویٰ کے ثبوت کے لئے حضور کا یہ ارشاد واضح دلیل اور بین برھان ہے: ان یخرج وانا فیکم فانا حجیجه وان یخرج ولست فیکم فامرء حجیج نفسه. جو لوگ عربی زبان کے محاورے سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ارشاد شک اور تردد پر مبنی ہے۔ کیونکہ عربی محاورات میں یہ لفظ انْ شک اور تردد کے لئے وضع کیا گیا ہے اور شک اور تردد ہی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر کس طرح عقل سلیم یہ باور کرے گی کہ زمانہ خروج کے بارے میں حضور ﷺ کے یہ ارشادات از قسم پیشین گوئی ہیں۔ اور ان کی بنیاد علم وحی پر رکھی گئی ہے۔ کیا انبیاء علیہم السلام کو بھی اپنی وحی کے بارے میں شک اور تردد لاحق ہو سکتا ہے؟

الجواب:

(۱) مفتی صاحب کا بطور حصر یہ لکھنا بالکل غلط ہے کہ انْ شک اور تردد ہی میں

استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرمایا ہے قل ان کان للرحمن ولد فانا اول العٰبدین (سورہ الزخرف آخری رکوع) آپ کہہ دیں کہ اگر اللہ کا کوئی بیٹا ہوتا تو میں سب سے اول اس کی عبادت کرنے والا ہوتا۔ اس آیت میں بھی ان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اب مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ کیا اللہ تعالیٰ کو بھی اس میں تردد اور شک تھا کہ اس کی اولاد ہے یا نہیں۔ پھر آپ نے بطور حصر یہ کیونکر لکھ دیا کہ لفظ اِن شک اور تردد میں ہی استعمال کیا جاتا ہے، علاوہ ازیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم " کیا پس اگر آپ پر موت آجائے یا آپ قتل کئے جائیں تو کیا تم (مسلمان) اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاؤ گے" یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اِن کے لفظ کے ساتھ موت اور قتل دو صورتیں پیش فرمائیں ہیں۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طبعی موت ہی آئی اور قتل سے محفوظ رہے تو کیا مفتی صاحب بالقابہ یہ کہنے کی جرأت کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی شک تھا کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم قتل کئے جائیں۔لیکن بعد میں جب موت واقع ہوئی تو یہ شک رفع ہوگیا۔ (العیاذ باللہ)

(ب) ابن صیاد کی روایت میں بھی اِن کا لفظ آیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابن صیاد کو قتل کرنا چاہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے آپ سے یہ فرمایا کہ ان یکن ھو فلن تسلط علیہ "اگر ابن صیاد دجال ہے تو آپ اس پر قابو نہیں پا سکیں گے" اس جملہ کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

"الثانی ان العرب قد تخرج الکلام مخرج الشک وان لم یکن فی الخبر شک "یعنی دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کبھی کلام کو شک کے طور پر بولتے ہیں۔ اگرچہ اس خبر میں کوئی شک نہیں ہوتا" فرمایئے ابن حجر صاحب فتح الباری بھی عربی محاورات کو سمجھتے ہیں یا نہ؟ اس سے ثابت ہوا کہ حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے بارے میں جو اِن کا لفظ فرمایا ہے وہ شک کی وجہ سے نہیں فرمایا۔

(ج) امام نووی بھی امام بیہقی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

یحتمل انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان کالمتوقف فی امرہ ثم جاءہ البیان انہ غیرہ کما صرح بہ فی حدیث تمیمؓ (یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس بات کا احتمال ہے کہ ابن صیاد کے دجال ہونے کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم متوقف سے تھے پھر حق تعالیٰ کی طرف سے یہ بات کھول دی گئی کہ دجال ابن صیاد کے علاوہ کوئی اور ہے جیسا کہ تمیم داری کی حدیث میں اس کی تصریح ہے") اور مفتی صاحب موصوف غالباً شک اور توقف میں فرق سمجھتے ہوں گے۔ شک میں دونوں جانب کی طرف میلان ہوتا ہے اور توقف میں دونوں طرف سے صرفِ نظر ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کے علم واطلاع پر موقوف کر رکھا تھا کہ ابن صیاد دجال ہے یا نہیں؟ امام نووی اور امام بیہقی اور حافظ ابن حجر وغیرہ محدثین یہ توجیہات اس لئے کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف شک کی نسبت نہ کی جائے۔

(د) مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی "ان" وغیرہ کے الفاظ سے احادیث میں تعارض ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی جس کا رد کرتے ہوئے علامہ سید محمد انور شاہ صاحب محدث دیوبندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

"وھذا الآخر الزنیم لعین القادیان یزعم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم تکشف لہ حقیقۃ الدجال کما ھی والعیاذ باللہ ولا یدری ان قولہ ان لم یکن لیس للشک بل ھو علیٰ حد قولہ ان کان للرحمن ولد فانا اول العبدین وانما یخرج التعبیر ھکذا حیث یقصد ابراز الجزء الواحد علیٰ طریق الضابطۃ الکلیۃ تتأتی فیہ العبارۃ کما تریٰ او کقولہ فی المحدث ان یکن من امتی احد فعمرؓ (فیض الباری ج۲،ص۴۸۳)

"یعنی یہ ملعون قادیانی گمان کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ سلم پر دجال کی حقیقت اصلیہ نہیں کھولی گئی العیاذ باللہ۔ اور وہ یہ نہیں جانتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ: لو ان لم یکن ھوا شک کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ ایسا ہی

ہے جیسا کہ آیت ان کان للرحمن ولد فانا اول العبدین میں ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کے لئے کوئی بیٹا ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا اور جہاں ایک جز کے اظہار واثبات کا بطور ضابطہ کلیہ کے ارادہ کیا جاتا ہے وہاں اس قسم کے الفاظ سے ہی اس کی تعبیر کی جاتی ہے اور جیسا کہ تو یہاں دیکھ رہا ہے اسی طرح کی عبارت لائی جاتی ہے یا یہ اس طرح ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ اگر میری امت میں کوئی محدث (صاحب الہام) ہوتا تو عمرؓ ہوتے"

امید ہے کہ اب تو مفتی محمد یوسف صاحب کی تسلی ہوگئی ہوگی کہ کلام عرب میں "اِنْ" کا لفظ ہمیشہ شک کے لئے ہی نہیں بولا جاتا۔ واللہ الہادی۔

دجال کے بارے میں قادیانی اور مودودی نظریات:

گو دجال کے بارے میں مرزا غلام احمد قادیانی اور ابوالاعلیٰ مودودی کے عقیدہ میں فرق ہے کیونکہ مودودی صاحب کہتے ہیں کہ دجال اکبر آئے گا۔ اور مرزا قادیانی کہتا ہے کہ ابن صیاد ہی دجال اکبر تھا، جو مر چکا ہے۔ اب جس کے آنے کی خبر احادیث میں دی گئی ہے وہ کوئی شخص خاص نہیں بلکہ عیسائی پادریوں کا گروہ ہے جس میں دجال کی صفات پائی جاتی ہیں۔ لیکن ارشادات نبویہ علیٰ صاحبھا الف الف تحیۃ میں مستقل تعارض موجود ہونے کے بارے میں دونوں قریباً ایک جیسا نظریہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم کے جواب میں مرزا قادیانی نے لکھا ہے کہ:

"اور ایک نقص حدیثوں میں یہ بھی ہے کہ بعض حدیثیں اجتہادی طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں اس وجہ سے ان میں باہم تعارض ہوگیا ہے۔ جیسا کہ ابن صیاد کے دجال معہود ہونے کی نسبت جو حدیثوں(۱) ہیں ـــ ان حدیثوں

---

(۱) مرزا قادیانی کے خط میں بجائے حدیثیں کے حدیثوں کا لفظ ہی لکھا ہے۔ ۱۲

سے صریح اور صاف طور پر معارض ہیں۔ جو گرجا والے دجال کی نسبت ہیں جس کا راوی تمیم داری ہے۔ اب ہم ان دونوں حدیثوں میں سے کس کو صحیح سمجھیں، دونوں حضرت مسلم کی صحیح میں موجود ہیں۔ ابن صیاد کے دجال معہود ہونے کی نسبت یہاں تک وثوق پایا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو قسم کھا کر بیان کیا کہ دجال معہود یہی ہے تو آپ چپ رہے، ہرگز انکار نہیں کیا" (مباحثہ لدھیانہ ۱۸۹۱ء)

اس کا جواب مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے یہ دیا تھا کہ:

"حضرت عمر کی قسم دجال کے متعلق تھی نہ معہود کے متعلق لہٰذا تعارض نہیں"

(ب) مگر یہ غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے کہ دجال کی پیشانی پر ک ف ر لکھا ہوا ہوگا تو پھر اوائل دنوں میں ابن صیاد کی نسبت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیوں شک اور تردد میں رہے۔ اور کیوں یہ فرمایا کہ شاید یہی دجال معہود ہو اور شاید کوئی اور ہو الخ - ازالہ اوہام حصہ اول ص ۲۲۶)

(ج) "تعجب کہ معمورہ دنیا کی حقیقت بخوبی کھل گئی اور پہاڑوں اور جزیروں کا حال بھی بخوبی معلوم ہوگیا اور تفتیش کرنے والوں نے یہاں تک اپنی تفتیش کو کمال تک پہنچا دیا جو ایسی آبادیاں جو ابتداء دنیا سے معلوم نہ تھیں وہ اب معلوم ہوگئیں۔ مگر اب تک اس حبابہ اور دجال اور ابن صیاد مفقود الخبر اور دابۃ الارض اور یاجوج ماجوج کے کروڑہا انسانوں کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔" (ازالہ اوہام ص ۵۰۷)

ابوالاعلیٰ مودودی:

(ا) بخلاف اس کے ظہور دجال کے زمانہ و مقام کے بارے میں روایات باہم متعارض ہیں۔ جن میں تطبیق کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ وہ علم وحی پر مبنی نہیں ہیں الخ

(رسائل ومسائل حصہ اول ص ۵۵)

(ب) اور پھر جبکہ بعد کے واقعات سے ان باتوں کی تردید بھی ہو چکی ہے جو اس سلسلے

میں آپ نے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ خواہ مخواہ ان کو عقائد میں داخل رکھنے پر اصرار کیا جائے (ایضاً)

(ج) لیکن یہ آپ کو نہیں بتلایا گیا کہ وہ کب ظاہر ہوگا۔ کہاں ظاہر ہوگا اور یہ کہ آیا وہ آپ کے عہد میں پیدا ہو چکا ہے یا آپ کے بعد کسی بعید زمانہ میں پیدا ہونے والا ہے۔ ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے۔

(ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۶ء)

۲۔ غلط استدلال:

حضرت تمیم داریؓ کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے مفتی محمد یوسف صاحب نے یہ تو تسلیم کر لیا ہے کہ:

''محدثین کی اکثریت اسی روایت کے بموجب اسی محبوس اور مقید فی الجزیرہ شخص کے دجال اکبر ہونے کی قائل ہے'' لیکن وہ محدثین کے اس مذہب پر تنقید کرتے ہوئے اپنے جوابات کے سلسلہ میں تیسرا جواب یہ لکھتے ہیں کہ:

''فاطمہ بنت قیس کی زیر بحث حدیث میں جب حضورؐ سے تمیم داری نے قیدی شخص کا قصہ بیان کیا تو حضورؐ نے صحابہ کرام کے سامنے اس قصہ کے بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ **الا انه فی بحر الشام او بحر الیمن لابل من قبل المشرق** (رواہ مسلم) یاد رکھو دجال بحیرہ شام یا بحیرہ یمن میں ہے، نہیں بلکہ وہ جانب مشرق سے نکلے گا اور اپنے ہاتھ سے حضورؐ نے جانب مشرق اشارہ فرمادیا۔ حدیث کے یہ الفاظ تو صاف طور پر یہ بتلا رہے ہیں کہ حضورؐ نے مقید شخص کو دجال اکبر نہیں قرار دیا ہے۔ نہ آپ نے تمیم داری کی اس روایت کی توثیق فرمائی ہے۔''

الجواب: (۱) لیکن مودودی صاحب تو یہی سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

تمیم داری کی روایت کی توثیق فرمائی ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''تمیم داری کے بیان کو حضورؐ نے اس وقت تک تقریباً صحیح سمجھا تھا'' الخ

(علمی جائزہ ص ۴۷،۳۷ بحوالہ رسائل و مسائل حصہ اول)

ہم کہتے ہیں کہ جس طرح آپ دوسرے اکابر محدثین کے مذہب کا دلائل سے رد کر رہے ہیں اسی طرح آپ اس بارے میں مودودی صاحب کی بھی تردید فرمادیتے تو آپ کا غیر متعصب ہونا بھی ثابت ہوتا اور منصب رسالت پر زد بھی نہ پڑتی۔ کیونکہ محدثین تو حضور صلی اللہ علیہ سلم کے ارشاد کے تحت اپنا ایک مذہب قرار دے رہے ہیں۔ اور برعکس اس کے ابوالاعلیٰ صاحب نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کو ساڑھے تیرہ سو سال کے تاریخی تجربہ سے غلط ثابت کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن آپ ہیں کہ اکابر محدثین کے مذہب کو تو اپنا پورا علمی زور صرف کر کے رد کر رہے ہیں اور رکیک احتمالات کا سہارا لے کر مودودی صاحب کے غلط مؤقف کی تائید کر رہے ہیں۔ کیا یہی علمی دیانت اور دینی انصاف ہے۔ جس کے آپ مدعی ہیں۔

ع قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا حوالہ:

(ب) محدثین کے مذہب کا رد کرتے ہوئے مفتی صاحب موصوف نے اپنی تائید میں شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت بھی پیش کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں: شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس جملے کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: لما ابهم الله تعالى امر الساعة واوقات ظهور اماراتها بالتعين ولهذا وقع الاختلاف فى الاحاديث فى ترتيبها ابهم مكان الدجال موثقاً مردداً بين هؤلاء الاماكن الثلث مع غلبة الظن فى آخرها وهو ايضا غير متعين بل الذى علم كونه من قبل المشرق و هذا معنى نفى الاولين و اثبات الثالث اه (لمعات برحاشیہ مشکوٰۃ)

"خداوند تعالیٰ نے جب قیامت کا معاملہ مبہم کر کے رکھا اور ظہور علامات کے اوقات بھی متعین نہیں کر دئے اور احادیث میں اسی لئے علامات کی ترتیب میں اختلاف بھی واقع ہو گیا تو دجالِ مقید کے مکان کو بھی تینوں مقاموں کے درمیان مبہم کر کے رکھا جن میں سے آخری مقام کے متعلق گمان غالب یہی ہو سکتا ہے کہ وہی مقامِ دجال ہو اگر چہ یقینی وہ بھی نہیں ہے۔ یقینی بات صرف یہ ہے کہ مشرق کی جانب سے وہ ظاہر ہو گا اور یہی مطلب ہے پہلے دونوں کی نفی کا اور تیسرے کے اثبات کا" اھ

تو اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو گئی کہ دجال اکبر جزیرے میں وہ مقید شخص نہیں ہے جس کا قصہ تمیم داری نے حضورؐ سے بیان کیا تھا کیونکہ الا انہ میں یہ ضمیر مطلق دجال کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ مقید فی الجزیرہ کی طرف۔ کیونکہ اگر اس مقید شخص کی طرف یہ ضمیر لوٹا دی جائے تو اس پر یہ حکم صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ بحر شام یا بحر یمن میں ہے۔ نہیں بلکہ وہ مشرق کی جانب ہے" الخ (علمی جائزہ ص ۳۵۶۔۳۵۷)

الجواب (ا):

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی عبارت سے مفتی محمد یوسف صاحب کا یہ نتیجہ نکالنا کہ جزیرہ میں مقید شخص دجال اکبر نہیں ہے توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ میں داخل ہے۔ کیونکہ شیخ دہلویؒ کے نزدیک وہی دجال اکبر ہے۔ چنانچہ تمیم داریؓ کی روایت کے الفاظ قال اما ان ذلک خیر لهم ان یطیعوه "یعنی جزیرہ میں اس مقید شخص نے کہا کہ ان لوگوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ نبی الامیین کی اطاعت کرلیں" کی شرح میں فرماتے ہیں:"وهذا یدل علی انه عارف بفضله وصدقه صلی الله علیه وسلم وانما یجحد کفراً وعناداً کما هو شان الیهود اور یہ بات اس کی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ (دجال مقید) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل وصدق کو پہچانتا ہے اور اس کا انکار کفر وعناد کی وجہ سے ہے جیسا کہ یہودیوں کی عادت ہے"۔

(ب) شیخ محدث دہلویؒ کی جو عبارت مفتی صاحب نے پیش کی ہے اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہ کی ضمیر کا مرجع وہی قیدی شخص ہے چنانچہ فرمایا۔ ایهم مکان الدجال موثقاً۔ اس کا ترجمہ خود مفتی صاحب نے یہ لکھا ہے کہ:

"دجالِ مقید کے مکان کو بھی تینوں مقاموں کے درمیان مبہم کر کے رکھا"

اس سے واضح ہو گیا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے نزدیک دجال تو وہی ہے جو جزیرہ میں مقید تھا۔ البتہ اس کی جگہ کو تینوں مقامات کا ذکر کر کے مبہم رکھا۔"

(ج) حضرت محدث دہلویؒ کی عبارت میں مردداً کا لفظ ہے نہ متردداً کا۔ اگر متردداً کا لفظ ہوتا تو اس میں شک کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جاسکتی تھی۔ لیکن "مردداً" کا لفظ استعمال کر کے نسبتِ شک کا ازالہ کر دیا۔ کیونکہ "مردداً" کا معنی یہ ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو شک نہیں تھا مگر مصلحتاً اس کی تعیین نہیں فرمائی اور تینوں مقامات کا ذکر فرما کر اس کو مبہم رکھ دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے سامنے قیامت کا معاملہ مبہم رکھا ہے اور اس کے وقت کی تعیین نہیں فرمائی (لما ابهم الله فی امر الساعة) تو جس طرح امر قیامت کو مبہم رکھنا اس بات کی دلیل نہیں کہ اللہ تعالیٰ خود بھی اس کو نہیں جانتے اسی طرح دجال مقید کے مقامات کو مبہم رکھنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ حضور ﷺ کو خود بھی اس میں شک تھا اور من جانب اللہ اس کا علم نہیں دیا گیا تھا۔ شیخ دہلویؒ کی عبارت کا مطلب یہی ہے۔ اور جو مفتی صاحب نے سمجھا وہ غلط ہے۔

امید ہے کہ مفتی صاحب موصوف مردداً اور متردداً کے فرق کو ملحوظ رکھ کر عبارت کا صحیح مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

(د) علمی خیانت:

مفتی صاحب نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی عبارت پوری نہیں لکھی اور آخری وہ الفاظ ترک کر دیئے جن سے محدث دہلویؒ کی مراد واضح ہو جاتی ہے اور وہ الفاظ یہ ہیں:

ویمکن ان یکون هذا الترديد لاجل ان ينقل من بعض الى بعض (لمعات حاشیہ مشکوۃ) اور ممکن ہے کہ یہ تردید یعنی حرف اَوْ بمعنی یا کے ساتھ تینوں مقامات کا ذکر کرنا اس لئے ہو کہ دجال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل کردیا جائے۔ اور یہ اللہ کی قدرت سے بعید نہیں ہے کہ جزیرہ میں اسی مقید شخص کو بحر یمن میں بھی رکھا جائے اور بحر شام میں بھی، پھر آخر میں مشرق کی جانب سے اس کا خروج ہو۔ اور مشرق کی جانب سے نکلنے کے الفاظ کو مفتی صاحب بھی وحی پر محمول کر رہے ہیں۔ بہرحال شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی عبارت بجائے تائید کے خود مفتی صاحب کے مؤقف کی تردید کر رہی ہے۔ خواہ مفتی صاحب اس کو مانیں یا نہ مانیں۔

۳۔ غلط استدلال:

مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''دجال بھی چونکہ قیامت ہی کی ایک علامت ہے تو چاہیے کہ اس کی خصوصی شخصیت کا علم بھی مخلوق سے پوشیدہ ہو۔ کیونکہ تعین شخصیت کے ساتھ شریعت کا کوئی مقصد وابستہ نہیں ہے۔ اور نہ شخصیت کا ابہام کسی شرعی اصل سے متصادم ہے..... اسی طرح قیامت کی علامات میں یاجوج ماجوج اور مغرب سے سورج کا طلوع بھی ہیں۔ حالانکہ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کی خصوصیات اور تفصیلات کسی کو معلوم نہیں ہیں الخ۔ (علمی جائزہ ص ۳۴۹)

الجواب:

یہ صحیح ہے کہ دجال قیامت کی علامات میں سے ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ قیامت کی علامات کی تفصیلات نہیں بتلائی گئیں لیکن اس سے یہ استدلال کرنا بالکل کم فہمی پر مبنی ہے کہ دجال کی شخصیت بھی متعین نہیں۔ کیونکہ قیامت کی بعض علامات وہ ہیں جن کی شخصیت معلوم و متعین ہیں مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سورج سب جانتے ہیں کہ وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام قرب قیامت میں آسمان سے نازل ہوں گے جو ابن مریم ہیں اور

بلا باپ پیدا ہوئے تھے اور جن کو قرآن مجید میں کلمۃ اللہ اور روح اللہ فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح جو سورج قبل از قیامت مغرب سے طلوع ہوگا، اس کی شخصیت بھی متعین ہے اور مفتی صاحب بھی روزانہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مشرق سے طلوع ہوا کرتا ہے۔ تو اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک دجال بھی ایک متعین شخصیت ہو، جس کو تمیم داری نے جزیرہ میں مقید دیکھا تھا۔ تو اس میں کیا استحالہ ہے اور تعین اور تشخص کے بعد وہ علامات قیامت میں کیوں شمار نہیں ہو سکے گا؟ بینوا توجروا۔

۴۔ غلط استدلال:

بندہ نے ''تنقیدی نظر'' ص ۸۸ پر مودودی صاحب کے نظریہ کی تردید میں یہ لکھا تھا کہ:

''دجال اکبر کے معاملہ میں حضور ﷺ نے تصریح فرمادی ہے کہ اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے دوبارہ نزول فرما کر باب لدّ پر قتل کریں گے۔ اور چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قرب قیامت میں نازل ہوں گے اس لئے یہ معین ہوگیا کہ دجال کا ظہور بھی اسی وقت ہوگا۔ لہٰذا یہ شبہ جاتا رہا کہ حضورؐ کو یہ اندیشہ تھا کہ دجال آپ کے عہد میں ظاہر ہوجائے۔ اسی طرح دجال کی دوسری علامات بھی جو احادیث میں منقول ہیں قرب قیامت سے تعلق رکھتی ہیں''۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''جناب عالی یہ بات سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ دجال قیامت کے قریبی زمانہ میں ظاہر ہوگا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسے آکر قتل کریں گے لیکن اس سے یہ شبہ کیسے رفع ہوا کہ حضورؐ کو ان یخرج وانا فیکم کے ارشاد فرمانے کے وقت یہ اندیشہ تھا کہ دجال آپ کے عہد میں ظاہر ہوجائے۔ یہ علم کہ دجال قیامت کے قریب ظاہر ہوگا یہ تو بنا بر قول جمہور بعد میں دیا گیا تھا، نہ کہ ابتداء میں''۔ (علمی جائزہ ص ۳۸۳)

الجواب:

مودودی صاحب پر میری تنقید کا تعلق اس بحث سے نہیں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو یہ علم دیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کریں گے یہ ابتدا میں بھی تھا یا نہ۔ بلکہ میرا اعتراض یہ تھا اور اب بھی ہے کہ رسائل و مسائل میں مودودی صاحب کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر عمر تک یہی اندیشہ رہا کہ شاید دجال آپ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے اور ساڑھے تیرہ سو برس تک چونکہ دجال کہیں نہیں ملا اس لئے حضور ﷺ کا یہ اندیشہ صحیح نہ تھا''۔ اگر وہ یہ مانتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ اندیشہ وحی کے ذریعہ زائل فرما دیا گیا تو وہ یہاں باب لد پر دجال کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے کی حدیث پیش کرتے نہ کہ ساڑھے تیرہ سو سالہ ناقص تاریخی تجربہ''۔

۵۔ غلط استدلال:

مفتی صاحب چونکہ بندہ کے اعتراض کی اہمیت سمجھ چکے تھے۔ اور اپنے امام مودودی صاحب کی تائید وتصدیق کا بیڑا بھی بہرحال انہوں نے اٹھا رکھا ہے۔ اس لئے ایک دوسرا نکتہ اٹھاتے ہوئے یہ تحریر فرمادیا کہ:

''ثانیاً حضورؐ کی مجرد اس تصریح سے کہ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو باب لد پر قتل کریں گے'' آپ کا یہ اندیشہ کیسے زائل ہو سکتا ہے کہ دجال آپ کے عہد میں نہ ظاہر ہو جائے؟ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ قرب قیامت میں نازل ہوں گے مگر حضورؐ کا یہ عہد بھی تو قیامت کے قریب کا عہد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بعثت انا والساعة کھاتین. کہا میں اور قیامت دونوں دوانگلیوں کی طرح ایک ساتھ بھیجے گئے ہیں' اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب مبین میں فرمایا ہے اقتربت الساعة وانشق القمر ۔ قیامت قریب ہوگئی اور چاند پھٹ گیا۔ نیز فرمایا ہے۔ اقترب للناس حسابهم لوگوں کا وقت حساب قریب

ہو گیا'' نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنحضورؐ نے ابتداءً یہ خیال فرمایا ہو کہ شاید دجال کا خروج میرے عہد میں ہو اور نزول مسیح وقتل دجال بعد میں واقع ہو۔ دراصل آپ حضرات کے دل و دماغ پر تعصب کا جذبہ غالب آ گیا ہے اس لئے آپ مولانا مودودی کی ہر بات کی تردید کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں حالانکہ ہر بات قابل تردید نہیں ہوا کرتی۔'' (علمی جائزہ ص ۳۸۳)

الجواب (۱):

بے شک ہر بات قابل تردید نہیں ہوا کرتی لیکن یہ بھی تو مان لیں کہ ہر بات قابل تائید بھی نہیں ہوتی۔ ہمارے اور آپ کے نظریئے میں فرق یہ ہے کہ ہم منصب رسالت کے تحفظ کے لئے مودودی نظریہ پر اعتراض کرتے ہیں۔ اور اس کے برعکس آپ علم وفضل کا سارا زور مودودی صاحب کی غلط باتوں کو صحیح ثابت کرنے پر لگا دیتے ہیں۔ خواہ اس میں منصب رسالت مجروح ہی ہو جائے۔ ع

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

کیا آپ نے ایمان مفصل میں ایمان بالرسل کے ساتھ ایمان بالمودودی کو بھی شامل کر لیا ہے؟

علم وفہم کا شاہکار:

(۲) مفتی محمد یوسف صاحب کا مذکورہ استدلال ان کے علم وفہم کا ایک شاہکار ہے جو علمی تاریخی نوادرات میں شمار ہونا چاہئے۔ قارئین حضرات! ذرا مفتی صاحب کے اس استدلال کا جائزہ لیں۔ بات کتنی صاف اور واضح تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ علم دے دیا گیا تھا کہ قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام باب لد پر دجال کو قتل کریں گے تو اب یہ بات کیونکر قابل قبول ہو سکتی ہے کہ اس کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اندیشہ رہا کہ دجال آپ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے۔ لیکن مفتی

صاحب نے چونکہ مودودی صاحب کی تحقیق پر آمنا و صدقنا کہنا ہی ہے اس لئے ایک مضحکہ خیز یہ توجیہ پیش کردی ہے کہ:

"مگر حضور کا عہد بھی تو قیامت کے قریب کا عہد ہے" آپ نے فرمایا ہے۔

"میں اور قیامت دونوں دو انگلیوں کی طرح ایک ساتھ بھیجے گئے ہیں" حالانکہ اس مثال اور اس ارشاد مبارک سے مفتی صاحب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کا مطلب یہ ہے کہ:

(الف) میرے اور قیامت کے درمیان اور کسی کی شریعت اور امت کا زمانہ نہیں ہے اب قیامت تک میری ہی امت ہوگی اور میری ہی شریعت۔

(ب) اور امام نووی نے یہ فرمایا کہ واما معناه فقيل المراد بينهما شي يسير كما بين الاصبعين في الطول وقيل اشارة الى قرب المجاورة.

اور اس کے معنی بعض کے نزدیک یہ ہیں کہ جس طرح دونوں انگلیوں (یعنی سبابہ (شہادت کی انگلی) اور درمیانی انگلی کی لمبائی میں تھوڑا سا فرق ہے اسی طرح میرے عہد اور قیامت کے درمیان تھوڑا سا زمانہ ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس نے اپنے عہد اور قیامت کے باہمی پڑوسی ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے (شرح مسلم) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش فرمودہ مثال سے تو یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حضور کا زمانہ حیات اور زمانہ قرب قیامت دونوں ایک نہیں بلکہ جدا جدا ہیں۔ اور دونوں کے درمیان کچھ فاصلہ ہے کیا مفتی صاحب موصوف کی دونوں انگلیاں جدا جدا نہیں بلکہ آپس میں متداخل یعنی ایک دوسرے میں داخل ہیں اور ان میں کسی طرح کا انفصال نہیں ہے؟ یا ان کی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی دونوں لمبائی میں برابر ہیں؟ تعجب ہے کہ اس مثال سے یہ کیسے لازم آگیا کہ حضور کا زمانہ اور قربِ قیامت کا زمانہ بالکل ایک ہے۔ نعوذ باللہ من سوء الفھم

(ج) علاوہ ازیں جو آیتیں مفتی صاحب نے پیش فرمائی ہیں ان سے تو صرف

قیامت کا نزدیک ہونا ثابت ہوتا ہے نہ کہ قیامت اور عہد رسالت کا بالکل متصل ہونا۔

دعویٰ تو مفتی صاحب کا یہ ہے کہ شاید حضور ﷺ کے زمانہ میں ہی دجال آجائے اور دلیل میں قیامت کا نزدیک ہونا پیش فرما رہے ہیں۔ کیا دعویٰ اور دلیل میں کوئی مطابقت ہے؟

اور طرفہ یہ کہ مفتی صاحب خود یہ الفاظ لکھ رہے ہیں کہ:

"حضور کا عہد بھی تو قیامت کے قریب کا عہد ہے" گویا مفتی صاحب قرب اور اتحادِ حقیقی کا فرق ہی نہیں سمجھ سکتے۔ ع

گر ہمیں مکتب و ہمیں مفتی — کار دیں بس تمام خواہد شد

(د) مسلم شریف میں ہے: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ليفرن الناس من الدجال حتى يلحقوا بالجبال قالت ام شريك قلت يا رسول الله فاين العرب يومئذ قال وهم قليل. "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ دجال سے بھاگ کر پہاڑیوں میں چلے جائیں گے۔ ام شریک نے کہا۔ اے اللہ کے رسول! پس عرب اس دن کہاں ہوں گے۔ فرمایا اور وہ قلیل ہوں گے"۔

اس کی شرح میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

وقد ثبت من الاحاديث ما يدل على ان خروجه في آخر الزمان ولكنه قال هذا ايقاعاً للخوف على الامة حتى يلتجئوا الى الله من شره وايضا هذه كناية عن تحقق وقوعه البتة واشارة الى الابهام في زمانه كالساعة (لمعات حاشیہ مشکوٰۃ)

"اور احادیث سے جو باتیں ثابت ہیں وہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ دجال کا خروج آخری زمانہ میں ہوگا۔ لیکن حضور صلی اللہ عیہ وسلم نے امت کو خوف دلانے کے لئے اس طرح فرمایا تاکہ لوگ دجال کے شر سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف التجا کریں اور نیز یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ قیامت ضرور واقع ہونے والی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح زمانہ قیامت مبہم رکھا گیا ہے اسی طرح زمانہ دجال بھی مبہم رکھا گیا ہے، یعنی وقت نہیں بتایا گیا"

حدیث شریف میں ہے: قلنا یا رسول اللہ وما لبثہ فی الارض قال اربعون یوماً یوم کسنۃ ویوم کشھر ویوم کجمعۃ وسائر ایام کایامکم (مسلم شریف) یعنی صحابہ کرام نے عرض کی کہ دجال کتنی عمر پائے گا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ چالیس دن جن میں ایک دن سال کا، ایک دن مہینہ کا اور ایک دن ہفتہ کا ہوگا۔ اور باقی دن تمہارے دنوں کی طرح ہوں گے"۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دجال ۴۰ دن زمین میں رہے گا نیز یہ کہ اسی زمانہ میں ایک دن سال کے برابر بھی ہوگا تو معلوم ہوا کہ اس سے حضور سے بعد کا زمانہ مراد ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی دن سال یا مہینہ کے برابر نہیں ہوا۔

(س) حدیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے کہ:

ینزل عیسیٰ بن مریم الی الارض فیتزوج ویولد لہ ویمکث خمساً واربعین سنۃ ثم یموت فیدفن معی فی قبری (مشکوۃ شریف)

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر نازل ہوں گے پھر نکاح کریں گے اور آپ کے اولاد ہوگی اور ۴۵ سال ٹھہریں گے، پھر وفات پائیں گے اور میرے ساتھ میری قبر میں دفن ہوں گے" اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوجائے گا۔ اور یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت تمیم داریؓ کی روایت کا واقعہ ۹ھ کا ہے۔ تو کیا مفتی صاحب کا یہ خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کے آخری ایک سال میں ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے یہ سارے واقعات پیش آنے کا احتمال تھا۔ عقلی احتمالات اور امکانات کا دائرہ تو وسیع ہے لیکن مفتی صاحب نے یہ بھی سوچا ہے کہ محض مودودی صاحب کی تائید میں ایک عقلی احتمال نکال کر کتنی نصوص کا انکار لازم آئے گا۔ کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے الخلافۃ بعدی ثلثون سنۃ۔ یعنی میرے بعد خلافت ۳۰ سال رہے گی اور اس سے مراد خلافتِ راشدہ موعودہ کا زمانہ ہے جس میں دجال کا ظہور نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ دور

مسلمانوں کی ترقی اور عروج کا ہے اور دجال کا ظہور مسلمانوں کے تنزل کے زمانہ میں ہوگا۔ حتیٰ کہ اس کے ساتھ ستر ہزار یہودی بھی ہوں گے۔

مفتی صاحب اگر آپ نے احتمال عقلی نکالنا ہی تھا تو یہ کیوں نہیں فرمادیا کہ اس بات کا بھی احتمال تھا کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں ہی قیامت قائم ہوجائے۔ اگر ایسا تحریر فرمادیتے تو دینی مسائل ومباحث کا قصہ ہی ختم ہوجاتا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

۶۔ غلط استدلال:

مفتی صاحب کا ایک اور استدلال بھی تاریخی شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے جس میں لکھتے ہیں کہ:

"ثانیاً حضور سے پہلے جتنے انبیاء گذرے ہیں ان سب کے متعلق حضور ہی نے یہ فرمایا ہے کہ ہر نبی نے دجال کے فتنہ سے اپنی قوم کو ڈرایا ہے ما من نبی الا وقد انذر قومہ الدجال (بخاری) تو کیا ان انبیاء علیہم السلام کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ دجال کے متعلق ان کے اس قسم کے تخویفی ارشادات مبنی بر وحی تھے۔ کیا ان کو اس قسم کی کوئی وحی خدا کی طرف سے آئی تھی کہ دجال آپ کی امتوں میں ظاہر ہوگا جبکہ امر واقعہ یہی تھا کہ دجال خاص حضور ہی کی امت میں ظاہر ہوگا اور ان کا زمانہ خروجِ دجال کا زمانہ تھا ہی نہیں پھر کس بنیاد پر آپ سارے انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے یہ تمام ارشادات مبنی بر وحی تھے؟ (علمی جائزہ ص ۳۷۹)

الجواب: (ا)

بے شک پہلے انبیاء نے جو اپنی اپنی امت کو دجال کے فتنے سے ڈرایا ہے تو اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی وحی ہی تھی کیونکہ انبیاء کرام اسی کی طرف سے بشیر ونذیر بن کر آتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: ولقد ارسلنا فیھم منذرین (الصٰفٰت ع ۲) اور ہم نے ان میں

ڈرانے والے رسول بھیجے" خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں انا ارسلنک شاهداً و مبشراً ونذيراً وداعياً الى الله باذنه وسراجاً منيراً (سورۃ الاحزاب)۔

بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے شہادت دینے والا اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔ اور اللہ کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اس کے حکم سے اور سراج منیر بنا کر۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دوسری صفات کے علاوہ نذیر ہونے کی صفت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے جو رسالت کے لئے لازم ہے۔ لہٰذا انبیاء کرام نے امتوں کو جن امور سے ڈرایا وہ وحی کی بنا پر ہی تھا۔

(ب) باقی رہا یہ شبہ کہ جب دجال نے سابقہ امتوں کے زمانہ میں آنا ہی نہ تھا تو پھر کیوں ڈرایا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح سابقہ انبیاء اور ان کی صفات پر ایمان لانا ہمارے لئے ضروری ہے گو ہم نے ان کا زمانہ نہیں پایا۔ اسی طرح ہر ایسی چیز کے شر اور فتنہ سے ڈرانا ضروری ہے جس کا تعلق دین سے ہو۔ خواہ ہمیں اس میں مبتلا ہونے کا موقع نہ ملے مثلاً خود رحمۃ للعالمین ﷺ بعض ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محال ہیں چنانچہ مسلم شریف میں حدیث ہے:۔

عن عائشة رضی الله عنها ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یدعو بهؤلاء الدعوات اللهم انی اعوذبک من فتنة النار و عذاب النار وفتنة القبر وعذاب القبر ..... واعوذبک من شر فتنة المسیح الدجال. "اے اللہ بے شک میں تیری پناہ لیتا ہوں دوزخ کے فتنہ اور عذاب سے اور قبر کے فتنہ اور عذاب سے۔ . . . اور تیری پناہ لیتا ہوں مسیح دجال کے فتنہ کے شر سے۔"

فرمایئے! یہاں جن چیزوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے اور ان میں دجال اکبر بھی ہے ان کے شر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قطعاً مامون و محفوظ ہیں۔ تو باوجود اس کے کہ سرور کائنات محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عذاب جہنم وغیرہ محال ہیں پھر بھی آپ نے ان کے شر سے پناہ مانگی ہے۔ تو اگر پہلی امتوں کو دجال کے شر

سے ڈرانے اور تعوذ کرنے کی تعلیم دی گئی ہو تو اس سے یہ کیسے لازم آئے گا کہ اس کی بنیاد وحی نہیں بلکہ انبیاء کے اپنے قیاسات ہیں۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ، مفتی صاحب! کچھ سنبھلنے کی کوشش کریں، یہ کیسا دین وایمان ہے اگر مودودی صاحب سے ایک باطل نظریہ بیان ہو جائے تو آپ اس کی تائید میں انبیاء معصومین کو مجروح کرنے کے دلائل ڈھونڈنے لگ جائیں۔

(ج) قرآن حکیم میں ہے: یآ ایها الناس اتقوا ربکم ان زلزلة الساعة شیٔ عظیم ○ یوم ترونها تذهل کل مرضعة عما ارضعت وتضع کل ذات حمل حملها وتری الناس سکاریٰ وماهم بسکاریٰ ولکن عذاب الله شدید ○ (سورۃ الحج ع ۱) اے لوگو اپنے رب سے ڈرو بے شک قیامت کا زلزلہ ایک بڑی چیز ہے، جس دن اس کو دیکھو گے بھول جائے گی ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پلانے کو اور ڈال دے گی ہر پیٹ والی اپنا پیٹ اور تو دیکھے گا لوگوں پر نشہ اور ان پر نشہ نہیں لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے۔"

اس کے حاشیہ میں علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قیامت کے عظیم الشان زلزلے (بھونچال) دو ہیں ایک عین قیام قیامت کے وقت نفخہ ثانیہ کے بعد، دوسرا قیامت سے کچھ پیشتر جو علامات قیامت میں سے ہے۔ اگر یہاں دوسرا مراد ہو تو آیت اپنے ظاہر معنی پر رہے گی اور پہلا مراد ہو تو دونوں احتمال ہیں الخ۔

فرمایئے! یہاں قیامت سے پہلے اس زلزلے سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو ڈرا رہے ہیں جو علامات قیامت میں سے ہے۔ حالانکہ اس زلزلہ میں وہی لوگ مبتلا ہوں گے جو اس وقت زندہ ہوں گے۔ لیکن باوجود اس کے اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کو اس سے ڈرا رہے ہیں جو صدیوں پہلے وفات پا چکے ہیں اور جو اس وقت تک زندہ نہیں رہیں گے تو کیا مفتی صاحب یہاں بھی اشکال اٹھائیں گے کہ نعوذ باللہ خود اللہ تعالیٰ بھی اپنے قطعی علم کی بنا پر سب لوگوں کو نہیں ڈرا رہے بلکہ خلاف واقعہ اپنے قیاس کی بناء پر اپنے ان بندوں کو بھی ڈرا دیا جو اس زلزلہ سے پہلے یقیناً وفات پا چکے ہیں یا وفات پا جائیں گے؟ کیا مفتی صاحب اپنے اس انوکھے استدلال کی بنا پر علام الغیوب خداوند عالم کے بارے میں بھی

وہی حکم لگانے کے لئے تیار ہیں جو انبیاء کرام کے بارے میں صادر فرمایا ہے، حفظت شیئاً و غابت عنک اشیاء.

۷۔ غلط استدلال:

مفتی صاحب نے ان محدثین کے جواب میں جو اس مقید شخص کو دجال اکبر قرار دیتے ہیں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ:

''مقید شخص کو دجال اکبر قرار دینے اور تمیم داری کی اس روایت کی توثیق کرنے کی صورت میں حضور کے الفاظ وہ نہ ہوتے جو یہاں ہم دیکھ رہے ہیں بلکہ صاف طور پر آپ یہ فرماتے کہ: الا انہ ھو الدجال الاکبر وسیخرج من تلک الجزیرۃ لیکن اس کی بجائے آپ نے یہ فرمایا کہ الا انہ فی بحر الشام او بحر الیمن لا بل من قبل المشرق ان الفاظ سے تو صریح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے دجال کی شخصیت اور مقام خروج دونوں کو مبہم اور نامعلوم قرار دے دیا اور تمیم داری کی روایت سے اختلاف ظاہر کر دیا۔ نہ کہ اس کی توثیق فرمائی'' الخ (علمی جائزہ ص ۳۵۶)

الجواب:

مفتی صاحب کا یہ استدلال بھی نہایت رکیک ہے۔ کیونکہ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ جب اللہ تعالیٰ نے دجال کی شخصیت کو مبہم رکھنا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر اس کی تصریح فرماتے۔ اس سے یہ نتیجہ کیسے نکلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی دجال کی شخصیت نہیں جانتے تھے۔

مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا وما قتلوہ یقیناً بل رفعہ اللہ الیہ'' یہود نے آپ کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی طرف اٹھالیا۔''

مفتی صاحب یہ تو مانتے ہوں گے کہ یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان کی طرف اٹھالیا۔ لیکن الفاظ میں آسمان اور زندہ ہونے کی صراحت نہیں ہے۔ تو قرآنی الفاظ کے پیش نظر اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھایا گیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ بجائے بل رفعہ اللہ الیہ کے یہ الفاظ فرماتے بل رفع اللہ المسیح بن مریم حیاً الی السماء ''بلکہ اللہ تعالیٰ نے مسیح بن مریم کو زندہ آسمان کی طرف اٹھالیا'' تو مفتی صاحب اس کا کیا جواب دیں گے؟''

یہ ہیں وہ سات استدلالات جن کی بنا پر مفتی صاحب موصوف نے اکثر محدثین کے مذہب کی تردید کرتے ہوئے ابوالاعلیٰ صاحب کے مذہب کی تائید کو اسلامی فریضہ سمجھا ہے۔ اسی طرح دوسرے مسائل میں بھی عموماً مفتی صاحب کے دلائل کا یہی حال ہے۔ جن کی نشاندہی انشاءاللہ حسب ضرورت دوسرے مقامات پر کی جائے گی۔

ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا

☆-----☆-----☆

انبیاء کا خطا پر باقی رہنا محال ہے

بندہ نے ''تنقیدی نظر'' میں چوتھے اعتراض کے تحت لکھا تھا کہ:

''بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضور نے کچھ باتیں اپنے قیاس کی بنا پر فرمائی تھیں تو پھر بھی یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی حضورؐ کے شک کو دور نہ فرمایا گیا ہو کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا خطا پر باقی رہنا محال ہے۔ (ص ۸۵ ایضاً علمی جائزہ ص ۳۸۴) اس کے جواب میں مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''محترم قاضی مظہر حسین صاحب نے اعتراض نمبر ۴ میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس کے متعلق اولاً ہم عرض کریں گے کہ بیشک انبیاء علیہم السلام کا خطا پر باقی رہنا ممکن نہیں بلکہ محال ہے۔ لیکن اس کا تعلق انبیاء علیہم السلام کے ان فیصلوں سے ہے جو انہوں نے اپنے اجتہاد سے کسی ایسے معاملہ کے متعلق جزماً دیئے ہوں جو اجتہادی ہو۔ اور اس کے ساتھ حکم فقہی کا تعلق ہو ایسے اجتہادی معاملات میں احکام شرعیہ کے استنباط میں اگر انبیاء سے اجتہادی خطا سرزد ہوجائے تو اس پر ان کا باقی رہنا محال ہے۔ کیونکہ یہ ان کی اجتہادی لغزش ہے اور انہی لغزشات پر انبیاء علیہم السلام کو تنبیہ ملنی ضروری ہے۔ کیونکہ احکام شریعت میں امت کے لئے ان کا اتباع ضروری ہے۔ اور لغزشات میں اتباع درست نہیں ہے۔

رہا کسی واقعہ کے متعلق ان کا اندیشہ ظاہر کرنا کہ شاید ایسا ہوجائے یا کسی چیز کے متعلق یہ خیال اور شبہ ظاہر کرنا کہ ممکن ہے یہ فلاں چیز ہو تو اس میں سرے سے کوئی حکم اور فیصلہ ہے ہی نہیں کہ اس کو صحیح یا مبنی برخطا کہہ سکیں۔ نہ اس طرح کے معاملات میں تنبیہ وتصحیح کی حاجت ہے آخر تابیر نخل کے معاملے

میں کون سی وحی نازل ہوئی تھی؟ حالانکہ اس میں آنحضور نے اپنے گمان کی بنا پر ایسی بات ارشاد فرمائی تھی جو نافع ثابت نہ ہوئی۔'' (علمی جائزہ ص ۳۸۷)

الجواب (ا) مفتی صاحب نے جو یہ تقسیم کی ہے کہ اگر احکام شرعیہ کے استنباط میں انبیاء سے اجتہادی خطا سرزد ہوجائے تو اس پر تو ان کا خطا پر باقی رہنا محال ہے لیکن دوسرے امور واخبار میں اگر ان سے خطا ہوجائے تو اس میں ان کا خطا پر باقی رہنا محال نہیں، بالکل غلط ہے۔ کیونکہ نبی کی اگر کوئی بات بھی بعد میں غلط ثابت ہوجائے تو ان کی نبوت سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور بالخصوص کسی خبر دینے میں خطا پر باقی رہنا تو منصب نبوت کے بالکل ہی خلاف ہے۔ کیونکہ نبوت کا اصل تعلق ہی غیبی امور کی خبر دینے سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء وحی کے بغیر کوئی پیش گوئی نہیں کرتے۔ اور جن امور میں پیش گوئی مقصود نہیں ہے اور وہ اپنے خیال سے کوئی بات فرمادیتے ہیں تو اس میں بھی اگر خطا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً اس کی اصلاح ہوجاتی ہے۔ اس بارے میں مفتی صاحب کے غلط نظریہ کی اصلاح کے لئے یہاں ان کے امام مودودی صاحب کی ہی عبارتیں پیش کرنا زیادہ مناسب ہے تاکہ حق بات ماننے میں مفتی صاحب کو زیادہ مشقت نہ اٹھانی پڑے۔

''مودودی صاحب کی عبارت سے مفتی صاحب کی تردید''

(۱) رسول کی حیثیت رسالت اور حیثیت شخصی پر بحث کرتے ہوئے منکرین حدیث کی تردید میں مودودی صاحب لکھتے ہیں:

''اس خدمت کو نبی اپنی شخصی اور خانگی زندگی میں بھی اسی طرح سرانجام دیتا ہے جس طرح اپنی سرکاری حیثیت میں اور کسی معاملہ میں بھی اگر اس کے قدم کو ذرا سی لغزش ہوجاتی ہے تو اس کو فوراً تنبیہ کی جاتی ہے کیونکہ اس کی خطا صرف اسی کی خطا نہیں بلکہ ایک پوری امت کی خطا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لہٰذا اس کا خطا اور غلطی سے محفوظ ہونا لازم ہے تاکہ کامل اعتماد کے ساتھ اس کی پیروی کی جاسکے''۔ (تفہیمات ج ۱ ص ۲۳۶-۲۳۷)

(ب) اسی بحث میں مودودی صاحب لکھتے ہیں:

''ان اصولی ارشادات سے اور اوپر کی واقعاتی مثالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زندگی کو ٹھیک ٹھاک معیارِ مطلوب پر قائم رکھنے کی ذمہ داری خود اپنے اوپر لی ہے اور اس نے اس بات کا سخت اہتمام کیا ہے کہ نبی سے جو لغزش بھی سرزد ہو جائے اس کی فوراً اصلاح کرے، خواہ وہ لغزش کسی ذاتی معاملہ میں ہو یا پبلک معاملہ میں (تفہیمات ج ا ص ۲۴۵)

فرمایئے! جب مودودی صاحب نے تصریح کردی کہ نبی کی ہر لغزش کی اصلاح اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضروری ہوتی ہے، خواہ اس کا تعلق ذاتی معاملہ سے ہو یا پبلک معاملہ سے تو مفتی محمد یوسف صاحب کا یہ فرمانا غلط ہو جائے گا کہ صرف اسی لغزش کی اصلاح کی جاتی ہے جس کا تعلق شرعی احکام کے استنباط سے ہوتا ہے۔

(ج) گو مودودی صاحب نے یہاں واضح کردیا ہے کہ انبیاء کی ہر قسم کی لغزش کی اصلاح اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً کی جاتی ہے لیکن تعجب ہے کہ اپنی اس تصریح کے باوجود بھی وہ دجال کے بارے میں اس بات پر مصر ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں جو باتیں اپنے قیاس سے ارشاد فرمائی ہیں ان کی اصلاح اللہ تعالیٰ نے کی ہی نہیں۔

ع خود آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

(د) مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''کسی چیز کے متعلق یہ خیال اور شبہ ظاہر کرنا کہ ممکن ہے یہ فلاں چیز ہو تو اس میں سرے سے کوئی حکم اور فیصلہ ہے ہی نہیں کہ اس کو صحیح یا مبنی بر خطا کہہ سکیں نہ اس قسم کے معاملات میں تنبیہ و تصحیح کی حاجت ہے۔ آخر تابیرِ نخل کے معاملے میں کون سی وحی نازل ہوئی تھی'' الخ

الجواب:

کسی چیز کے متعلق کوئی شبہ اور خیال ظاہر کرتے ہیں تو کوئی حکم اور فیصلہ نہیں

ہے لیکن اس سے چونکہ یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ حضور ﷺ اس بارے میں شک میں رہے جیسا کہ دجال کے بارے میں مودودی صاحب نے لکھا ہے۔ اس لئے اس کی بھی اصلاح ضروری ہے تاکہ کسی مؤمن کو یہ غلط فہمی نہ رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فلاں معاملہ میں ہمیشہ شک میں رہے کیونکہ اس سے دوسرے امور میں بھی اعتماد اٹھ سکتا ہے اور مفتی صاحب کا یہ لکھنا بھی غلط ہے کہ اس میں سرے سے کوئی حکم اور فیصلہ ہے ہی نہیں کہ اس کو صحیح یا مبنی بر خطا کہہ سکیں''۔ کیونکہ تمیم داری کی روایت میں گو بقول مفتی صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قیدی شخص کے متعلق دجال اکبر ہونے کا کوئی فیصلہ نہیں دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی مودودی صاحب نے یہ حکم لگا دیا کہ:

''دجال کے بارے میں حضور کا یہ اندیشہ صحیح نہ تھا''؟

اب مفتی صاحب کو سچا مانیں یا مودودی صاحب کو۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

تأبیرِ نخل کا واقعہ:

مودودی صاحب نے بھی دجال کے مسئلہ کے تحت لکھا ہے کہ: ''اس اصولی حقیقت کو تأبیرِ نخل والی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود واضح فرما چکے ہیں''۔

(علمی جائزہ ص ۳۷۵ بحوالہ رسائل و مسائل حصہ اول طبع ثانی ص ۴۷)

اور اوپر کی عبارت میں خود مفتی صاحب بھی لکھتے ہیں:

''آخر تأبیرِ نخل کے معاملے میں کون سی وحی نازل ہوئی تھی؟''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ دجال کی بحث میں تابیرِ نخل کے واقعہ کو تائید میں پیش کرنا ان کی جہالت ہے یا تلبیس۔ کیونکہ دجال کا مسئلہ خالص شرعی ہے اور دجال کا ظہور و خروج قیامت کی علامات میں سے ہے لیکن برعکس اس کے تابیرِ نخل کا واقعہ محض دنیوی اعتبار سے ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینة وهم یابرون النخل یقول یلقحون النخل فقال ماتصنعون قالوا کنا نصنعه قال لعلکم لو لم تفعلوا کان

خیراً. قال فترکوہ فنفضت اوقال فنقصت قال فذکروا ذلک لہ فقال انما انا بشر اذا امرتکم بشئی من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشئی من رأیی فانما انا بشر (مسلم شریف)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو وہ لوگ کھجور کے درختوں میں گابھا لگاتے تھے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا کہ تم کیا کرتے ہو؟ لوگوں نے کہا کہ اسی طرح کیا کرتے تھے تو فرمایا کہ اگر تم اس طرح نہ کرو تو بہتر ہو۔ اس پر لوگوں نے گابھا لگانا چھوڑ دیا تو پھل کم آیا، انہوں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلائی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک میں ایک انسان ہوں۔ جب میں تم کو تمہارے دین کی کسی بات کا حکم دوں تو اس کو لے لو۔ اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو بے شک میں انسان ہوں''۔

ظاہر ہے کہ گابھا لگانے کا تعلق دین سے نہیں ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے مطابق عمل کرنے میں اگر پھل کم آیا تو اس کو علم غیب کی نفی میں تو پیش کیا جاسکتا ہے لیکن دینی معاملات میں حضور کی رائے اور اجتہاد کے مسئلہ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

(ب) مفتی صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ:

''آخر تأبیر نخل کے معاملہ میں کون سی وحی نازل ہوئی تھی''

اس کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں کہ جب تجربہ سے اس کی اصلاح ہوگئی تو پھر وحی کی اس میں کیا ضرورت تھی۔ بالخصوص جبکہ یہ معاملہ دنیا کا تھا۔ لیکن اس سے تو لازم نہیں آتا شرعی احکام کے علاوہ دوسرے امور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطا پر باقی رہنا محال نہیں ہے جیسا کہ مفتی صاحب کا نظریہ ہے۔

''دجال کے بارے میں چار مذاہب''

مفتی صاحب نے دجال کے بارے میں چار مذاہب نقل کئے ہیں۔ چنانچہ محدثین کے مذاہب کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:

''صحابہ کرام کے بعد جب ہم محدثین کے اقوال کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ان میں بھی دجال کی شخصیت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے' اور کسی ایک شخص کے دجال اکبر ہونے پر وہ متفق نہیں ہیں۔ بلکہ اس بارے میں ان کے ہاں تین مشہور مذاہب پائے جاتے ہیں۔ بعض ائمہ کا مذہب یہ ہے کہ دجال ابن صیاد ہے اور بعض دوسرے محدثین کا مذہب یہ ہے کہ ابن صیاد اگرچہ مختلف دجالوں میں سے ایک دجال ضرور تھا۔ مگر وہ دجال ہرگز نہ تھا جو قیامت کے قریب ایک علامت کے طور پر ظاہر ہوگا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ یہ دجال وہ شخص ہوگا جو جزیرے میں مقید ہے اور تمیم داری کی اس سے ملاقات ہوچکی ہے۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ دجال اکبر کوئی انسان نہیں بلکہ ایک شیطان ہے جو یمن کے بعض جزیروں میں قید کیا گیا ہے اور جب اس کے خروج کا وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اسے آزاد کرے گا اور پوری امت کے لئے باعث فتنہ بنے گا۔ اس اختلاف سے یہ بات خود بخود واضح ہوجاتی ہے کہ شخصیتِ دجال کا مسئلہ کوئی قطعی مسئلہ نہیں ہے اور نہ پوری امت میں متفق علیہ ہے''۔ (علمی جائزہ ص ۳۳۳)

پھر اس کے بعد مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''اوپر کے تین مذاہب کے بعد شخصیتِ دجال کے بارے میں چوتھا مذہب یہ رہ جاتا ہے کہ دجال اکبر کوئی ایسا معلوم و موجود شخص نہیں ہے جس کے بارے میں حضور نے یہ قطعی فیصلہ فرمایا ہو کہ یہی شخص دجال اکبر ہوگا جو قیامت کے

قریب ظاہر ہوگا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کو آ کر قتل کریں گے۔ بلکہ دجال ایک نامعلوم شخص ہے جو قیامت کے قریب امت کے لئے ایک عظیم فتنہ بن کر ظاہر ہوگا۔ اور ان اوصاف کا حامل ہوگا جو صحیح احادیث میں وارد ہوئی ہیں پھر آسمان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول فرماکر اسے قتل کریں گے''۔

اصول شریعت اور مسلمات دین کے پیش نظر ہم اس مسئلہ میں اپنی دیانتدارانہ رائے یہ رکھتے ہیں کہ اقرب الی الصواب یہی آخری مذہب ہے''۔

اسلامی عقیدہ: آخر میں مودودی عقیدت کے جوش میں بے قابو ہوکر لکھتے ہیں کہ: ''میرا دعویٰ ہے کہ اصول دین اور مسلمات شریعت کی روشنی میں دجال کے متعلق اگر صحیح اسلامی عقیدہ کوئی ہوسکتا ہے تو وہ صرف وہی عقیدہ ہے جو مولانا مودودی نے اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے اور جو لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں وہ خواہ مخواہ ایک سیدھی بات میں ٹیڑھ نکالنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں''۔ (علمی جائزہ ص ۳۸۴)۔

الجواب (أ):

مفتی صاحب نے پہلے تین مذاہب کے متعلق تو حوالہ جات پیش کردیئے کہ فلاں فلاں ائمہ دین اور محدثین امت ان کے قائل ہیں۔ بلکہ صحابہ کے مذاہبؓ بھی نقل کردیئے۔ لیکن اپنے اس آخری چوتھے مذہب کو صرف مودودی صاحب کی طرف منسوب کیا ہے اور ان کے علاوہ یہ نہیں بتلایا کہ اس چوتھے مذہب کے قائل کون کون محدث اور کون کون صحابی ہیں، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے یہ مودودی صاحب کا مذہب سلف وخلف سے جدا ہی ہے۔

(ب) مفتی صاحب نے پہلے تو مودودی صاحب کے اس مذہب کو اقرب الی الصواب لکھا ہے جس کا مائل دوسرے مذاہب پر اس کو راجح قرار دینا ہے۔ لیکن غلوئی المودودیت کا تقاضا صرف راجح ومرجوح پر کب برقرار رہنے دیتا تھا ایک آخری قدم رکھا

اور بلاتکلف یوں رقمطراز ہوئے کہ:

''دجال کے متعلق اگر صحیح اسلامی عقیدہ کوئی ہوسکتا ہے تو وہ صرف وہی عقیدہ ہے جو مولانا مودودی نے اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے''۔

یہ الفاظ حصر کے ہیں جن سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ مذکورہ پہلے تین مذاہب اسلامی صحیح عقیدہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل ہیں۔ اور حق صرف مودودی صاحب کا عقیدہ ہے۔ حالانکہ مذکورہ تینوں مذاہب نہ صرف محدثین بلکہ بعض مذاہب[۱] صحابہ کرام کے بھی ہیں۔ لہٰذا مفتی صاحب نے دجال کے بارے میں بعض صحابہ کرام کے مذاہب کو بھی باطل قرار دے دیا۔ تو فرمایئے دجال کے بارے میں مودودی مذہب کا اختلاف صرف فروعی حد تک رہا یا اصولی اور بنیادی بن گیا۔ کیونکہ فروعی مسائل میں صرف اپنے مذہب کو ترجیح دی جاتی ہے۔ دوسرے مذاہب کو بالکل خلاف حق اور باطل نہیں قرار دیا جاتا۔ چہ جائیکہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں۔

چیلنج:

مفتی محمد یوسف صاحب نے اسلامی عقیدہ کے متعلق یہ تصریح کردی ہے کہ: شریعت مقدسہ میں ہم کو جو اسلامی عقائد معلوم ہوچکے ہیں ان کی یہ خاصیت ہے کہ امت کے اسلاف ان میں مختلف نہیں بلکہ متفق ہوا کرتے ہیں۔ تو پھر آپ اپنی تحریر کردہ تعریف کی بنا پر یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مودودی کا عقیدہ ہی صحیح اسلامی عقیدہ ہے؟ کیا آپ ثابت کرسکتے ہیں کہ مودودی صاحب کے اس مذہب پر اسلافِ امت کا اتفاق ہے۔ اور اگر آپ یہ ثابت نہیں کرسکتے اور نہ ہی آئندہ انشاء اللہ یہ ثابت کرسکیں گے، تو کیا مودودی مذہب وعقیدہ کے معاملے میں اسلامی عقیدہ کی مذکورہ خاصیت کا حکم بدل جاتا ہے؟ مفتی صاحب! ذرا انصاف فرمائیں اس سے زیادہ بھی کوئی بے اصولی ہوسکتی ہے جس کا آپ مودودی صاحب کے معاملے میں مظاہرہ فرما رہے ہیں۔

---

(۱) مثلاً حضرت عمرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوذرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ (ملاحظہ ہو علمی جائزہ ص ۳۳۱)

مسئلہ معیار حق

مفتی محمد یوسف صاحب نے اپنی کتاب ''علمی جائزہ'' کے باب چہارم میں بعنوان ''تنقید اور معیارِ حق کا مسئلہ'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معیار حق ہونے یا نہ ہونے پر مفصل بحث کی ہے اور تعجب ہے کہ اس بحث میں انہوں نے شیخ الاسلام حضرت مولانا السید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کا ذکر تک نہیں کیا حالانکہ ردمودودیت میں اس مسئلہ پر سب سے پہلے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہی نے قلم اٹھایا ہے اور ''مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت'' ایک مستقل رسالہ اسی بحث کی تحقیق میں تالیف فرمایا ہے جس میں ضمناً عصمت انبیاء کی بحث بھی آ گئی ہے۔ اور اس رسالہ کا مقدمہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم نے نہایت محققانہ تحریر فرمایا ہے۔ جس میں معیار حق، تنقید اور ذہنی غلامی پر مدلل بحث کی ہے اور معیار حق کا مسئلہ سمجھنے کے لئے اس رسالہ کا مطالعہ نہ صرف عام تعلیم یافتہ طبقہ بلکہ علمائے کرام کے لئے بھی بہت زیادہ مفید ہے۔ تو کیا مفتی صاحب موصوف نے حضرت مدنی قدس سرہٗ کی اس کتاب اور اس کے مستدلات کا تذکرہ اس لئے نظر انداز کر دیا ہے تاکہ ناواقف قارئین کو صحابہ کرام کے معیار حق ہونے کے عقیدہ کا وزن نہ معلوم ہو سکے اور وہ یہ سمجھیں کہ اس مسئلہ میں مودودی صاحب سے اختلاف کرنے والے کوئی عام مولوی صاحبان ہیں جن کا مقصد محض مودودی صاحب کی مخالفت کرنا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب نے یہ لکھ دیا ہے کہ:

''اس کو گمراہی کہنے کی جسارت وہی شخص کر سکتا ہے جو مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے خدا واسطے کا بیر رکھتا ہے۔ یا پھر وہ اس مسئلہ کی ابجد سے بھی واقفیت نہیں رکھتا ہے۔'' (علمی جائزہ ص ۲۹۷)

مودودی عقیدہ گمراہی ہے:

شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ نے معیار حق کے بارے میں مودودی عقیدہ

کے متعلق آخر میں یہ تصریح فرما دی ہے کہ:

''خلاصہ یہ کہ مودودی صاحب کا یہ دستوری نمبر ۶ اور اس کا عقیدہ نہایت غلط اور مخالف قرآن و حدیث اور مخالف عقائد اہل السنّت والجماعت اسلاف کرام ہے۔ جس سے دین اور اسلام کو انتہائی ضرر اور نقصان عارض ہوتا ہے لوگوں کو اس سے احتراز ضروری ہے''۔ (مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت ص ۶۴)

اب مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ ''کیا حضرت مدنی'' کو بھی بقول آپ کے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے خدا واسطے کا بیر ہے یا پھر وہ اس مسئلہ کی ابجد سے بھی واقفیت نہیں رکھتے'' اور یہ بھی یاد رہے کہ آپ اپنی کتاب میں حضرت مدنیؒ کو مدح میں یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ:

''یہ حقیقت ہے کہ مولانا مرحوم نہ صرف یہ کہ اپنے وقت میں علوم شریعت کے ایک ماہر۔ محقق اور متبحر عالم تھے۔ بلکہ اسرار شریعت اور علم تصوف میں بھی شیخ کامل اور مسلم امام تھے۔ آپ کی دیانت وللّٰہیت تمام علمی اور اسلامی حلقوں میں مسلم تھی۔ خشیت اور خدا ترسی، خلوص اور تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے۔''
(علمی جائزہ ص ۷۵)

مودودی دستور کی عبارت:

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مودودی صاحب کے جس عقیدہ کو خلاف اہل السنّت والجماعت اور گمراہی قرار دیا ہے اس کی بنیاد حسب ذیل عبارت ہے جو مودودی جماعت اسلامی پاکستان کے بنیادی دستور میں بطور عقیدہ دفعہ ۳ کے تحت نمبر ۶ میں درج ہے کہ:

''رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بتائے ہوئے اسی معیار کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے۔'' (ص ۱۴)

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ عقیدہ مودودی جماعت اسلامی کے ہر رکن کے لئے ضروری ہے چنانچہ شرائط رکنیت دفعہ ۵ کے تحت نمبر ۱۱ میں لکھا ہے کہ: ''جماعت کے عقیدے کو اس کی تشریح کے ساتھ سمجھ لینے کے بعد شہادت دے کہ یہی اس کا عقیدہ ہے''۔ (ص ۱۶)

مفتی صاحب کی عبارات:

زیر بحث مسئلہ پر تبصرہ کرنے سے پہلے مفتی محمد یوسف صاحب کی حسب ذیل عبارات قابل ملاحظہ ہیں:

۱۔ اسلامی عقائد نہ اختلافی ہو سکتے ہیں نہ ظنی بلکہ وہ سب کے سب اتفاقی اور قطعی ہوا کرتے ہیں۔ (علمی جائزہ ص ۳۳۴)

۲۔ ایک اسلامی عقیدہ کے لئے ماخذ وہ شئی ہو سکتی ہے جو قطعی الثبوت بھی ہو اور قطعی الدلالۃ بھی۔ اس کے بغیر ظنی الثبوت اور ظنی الدلالۃ روایات سے اسلامی عقائد ثابت نہیں ہو سکتے ہیں۔ (علمی جائزہ ص ۳۵۲)

۳۔ جو لوگ اصول شریعت سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ ہدایت اور گمراہی کے لئے شریعت اور علمائے شریعت نے جو معیار مقرر کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول میں جو احکام منصوص ہوں یا جن پر پوری امت کا اجماع ہو چکا ہو۔ کوئی شخص یا جماعت اگر دیدہ و دانستہ اپنے لئے ان کے خلاف کوئی مسلک اور مذہب ایجاد کرے یا اپنے لئے ان کے خلاف راہ عمل تجویز کرے تو اسی کا نام گمراہی ہے۔ یہ وہ اصل اور قانون ہے جو سلف صالحین کے عہد سے لے کر آج تک برابر تمام اہل السنّت کے مابین مسلم چلا آیا ہے۔ اور اسی کے تحت انہوں نے خوارج، معتزلہ، شیعہ اور دوسرے فرق باطلہ کو گمراہ قرار دیا ہے۔'' (علمی جائزہ ص ۳۵-۳۶)

مسئلہ معیار حق اختلافی ہے:

۴۔ مفتی صاحب نے مسئلہ معیار حق کی بحث میں یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اس

میں سلف سے خلف تک اختلاف چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''شق چہارم کا حکم۔ مسئلہ کی یہ چوتھی شق در حقیقت وہ مسئلہ ہے جو علمائے امت کے یہاں ''تقلید الصحابی'' کے عنوان سے معروف اور مشہور ہے اور جو سلف سے لے کر خلف تک مختلف زمانوں میں موضوع بحث رہا ہے اور اختلافی صورت میں آج تک منتقل ہوتا چلا آیا ہے''۔ (ص ۲۵۲) یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ تقلید الصحابی سے مراد یہی بحث ہے کہ آیا ان یعنی صحابہ کے یہ ذاتی اقوال اور اجتہادی فیصلے قابل تنقید ہیں یا ان پر کوئی تنقید نہیں کی جا سکتی ہے۔'' (ص ۲۴۸)

(۱) مفتی صاحب سے پہلا سوال:

مندرجہ بالا عبارات کے تحت مفتی صاحب سے پہلا سوال یہ ہے کہ:

''جب آپ نے یہ تصریح کر دی ہے کہ ____ اسلامی عقیدہ صرف وہی ہو سکتا ہے جو اختلافی نہ ہو۔ اور معیار حق اور تقلید الصحابی کو آپ نے اختلافی مسئلہ مان بھی لیا ہے۔ تو پھر مودودی جماعت اسلامی کے دستور میں صحابہ کے معیار حق نہ ہونے اور تنقید سے بالاتر نہ ہونے کو جو اسلامی عقیدہ میں داخل کیا ہے وہ آپ کی تعریف کے مطابق اسلامی عقیدہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ سلف سے خلف تک اس میں اختلاف پایا جاتا ہے، آپ یا تو اپنی بیان کردہ اسلامی عقیدہ کی تعریف کی روشنی میں اس کو اسلامی عقیدہ ثابت کریں یا یہ تسلیم کریں کہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے سب ارکان جو اس دستور پر عقیدہ رکھتے ہیں وہ اسلامی عقیدہ کی تعریف سے ناواقف ہیں۔ اور اگر آپ اپنے امام مودودی صاحب کی متابعت میں دستور کی عبارت کو اسلامی عقیدہ ہی ماننے پر مصر ہیں تو پھر اپنی تحریر کردہ اسلامی عقیدہ کی تعریف کے غلط ہونے کا اعلان کر دیں۔ اس بارے میں کسی تیسری صورت کی آپ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

(۲) دوسرا سوال:

اس سلسلے میں مفتی صاحب سے دوسرا سوال یہ ہے کہ:

"مودودی دستور میں مذکورہ عقیدہ اگر اسلامی عقیدہ ہے تو اسلامی عقیدہ کا حکم آپ نے یہ لکھا ہے کہ وہ قطعیات سے ثابت ہوتا ہے اور اس سے اختلاف کرنے والا گمراہ قرار دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ عبارات کے نمبر۳ کے تحت آپ نے معتزلہ، خوارج اور شیعہ کو اہل السنّت سے خارج، گمراہ اور فرق باطلہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا مودودی دستور کے مندرجہ اسلامی عقیدہ سے جو علماء اختلاف رکھتے ہیں مثلاً حضرت مدنیؒ اور اکابر دیوبند وغیرہ اور سلف صالحین میں امام مالک اور امام احمد بن حنبل وغیرہ ائمہ دین جن کے بارے میں آپ نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ:

(ا) "پہلا مذہب امام مالک کا ہے، وہ یہ کہ صحابی کا یہ قول بہر حال حجت اور واجب التقلید ہے۔ خواہ وہ کسی ایسے مسئلہ میں ہو جو مدرک بالقیاس ہو، یا کسی ایسے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہو جو معقول المعنیٰ اور مدرک بالقیاس نہ ہو۔ دونوں صورتوں میں اس کی تقلید ضروری ہوگی۔ احناف میں سے ابوسعید بروعی کا بھی مذہب یہی ہے کہ دونوں صورتوں میں قول صحابی کی تقلید کی جائے گی"۔

(ب) امام احمد کا مذہب بھی قریب قریب وہی ہے جو امام مالک کا ہے، دونوں کے مابین کوئی جوہری فرق نہیں"۔ (ص ۲۵۶) تو اکابر دیوبند، امام مالک، امام احمد اور بعض احناف جو اقوالِ صحابہ کو مطلقاً حجت مانتے ہیں اور ان پر کسی مجتہد کی تنقید کو بھی جائز نہیں مانتے اور مودودی دستور ان کے خلاف ہے۔ کیا یہ سب ائمہ دین اور اساطین امت آپ کی مندرجہ بالا تعریف کی بنا پر مثل خوارج، معتزلہ اور شیعہ اہل سنت سے خارج، گمراہ اور فرق باطلہ میں نہ شمار ہوں گے" اگر فرق باطلہ میں شمار ہوں گے تو تقیہ کا پردہ چاک کرکے کھل کر ان پر فتویٰ دینے کی جسارت فرمائیں۔ اور اگر ان کو فرق باطلہ میں شمار نہیں کرتے تو اس فرق کی بنا کیا ہے؟ بینوا توجروا

(۳) تیسرا سوال:

تیسرا سوال یہ ہے کہ جب اسلامی عقیدہ قطعی نصوص سے ثابت ہے تو اس کا

منکر آپ کے نزدیک کافر ہوگا یا صرف گمراہ؟ اور کیا آپ کے نزدیک کافر اور گمراہ میں کوئی شرعاً فرق ہے یا دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے؟

مفتی صاحب کی سادہ لوحی یا مدہوشی:

مودودی جماعت اسلامی کے دستور کی جو عبارت اوپر درج کی گئی ہے اس میں سلبِ کلی کے طور پر یہ حکم لگایا گیا ہے کہ رسول خدا کے سوا کوئی بھی معیار حق نہیں۔ اور کوئی بھی تنقید سے بالاتر نہیں ہے۔ یعنی صحابہ کرام کے معیار حق اور تنقید سے بالاتر ہونے کی مطلقاً نفی کی گئی ہے۔ اور مفتی محمد یوسف صاحب نے اپنی کتاب میں یہ مسئلہ مودودی عقیدہ کی تائید وتصدیق کے لیے ہی لکھا ہے۔ لیکن قارئین حیران ہوں گے کہ مسئلہ کی تفصیلات میں مفتی صاحب متعدد پہلوؤں سے صحابہ کرام کو معیار حق بھی مان گئے ہیں اور تنقید سے بالاتر بھی۔ چنانچہ مفتی صاحب کی حسب ذیل عبارات ملاحظہ ہوں۔

(۱) شق اول کا حکم:

"جہاں تک قرآن وحدیث کی روایات کا تعلق ہے جو مندرجہ بالا شقوق میں سے پہلی شق ہے۔ اس میں صحابہ کرام ہرگز محل تنقید نہیں۔ بلکہ ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ہیں۔ پوری امت اس بات پر متفق ہے کہ حضور سے جس محفوظ شکل میں صحابہ کرام نے قرآن کریم نقل کیا ہے وہ سو فی صد صحیح ہے اور اس میں ان کی طرف سے ذرہ برابر کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوا ہے۔ اس میں جس نے بھی صحابہ کرام پر تنقید کردی اس کا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ اسی طرح روایت حدیث کے بارے میں بھی صحابہ کرام تنقید سے بالاتر ہیں۔ کیونکہ تمام اہل السنّت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ تمام صحابہ عدول ہیں" الخ

(علمی جائزہ ص ۲۴۸)

(۲) شق دوم کا حکم:

"اصول دین اور اعتقادی مسائل کی روایت میں بھی صحابہ کرام ہر قسم کی تنقید

سے بالاتر ہیں . . . . . اس بارے میں جس نے بھی ان پر تنقید کی ہے اس کا رابطہ اہل حق کی جماعت سے کٹ کر فرق باطلہ کے ساتھ قائم ہوا ہے۔ اور اہل حق کی جماعت میں کبھی اس کا شمار نہیں ہوا ہے۔ خوارج، معتزلہ اور دوسرے فرق باطلہ کا وجود اس قسم کی تنقید ہی کی پیداوار ہے" (علمی جائزہ ص ۲۵۰)

(۳) شق سوم کا حکم:

تیسری شق کا حکم یہ ہے کہ دین کا وہ جامع نقشہ اور تفصیلی نظام جس کو صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کر کے ساری امت کے سامنے پیش کیا ہے۔ جس میں عقائد دین کے فرائض اور عبادات کے طریقے، اصول اخلاق اور دین کے دوسرے شعبے سب ہی داخل ہیں اس میں بھی صحابہ کرام ہرگز محل تنقید نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ دین کا یہ جامع نقشہ اور مکمل نظام خود حضور کے ہاتھوں مکمل ہو چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ۲۳ سالہ زندگی میں مرتب کیا جا چکا ہے . . . . . اب اگر اس میں صحابہ کرام محل تنقید بن جائیں تو ایک طرف پورے دین سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ اور دوسری طرف ان کے پیش کردہ نظام دین پر تنقیدات سے ہر فتنہ پرداز شخص اس میں اپنی طرف سے ترمیم و اضافہ کرنے لگے گا۔ جس سے دین کا اصل حلیہ ہی بگڑ جائے گا۔ اور تا قیامت کسی ایک حالت پر دین قائم نہیں رہے گا"۔ (ص ۲۵۰۔۲۵۱)

(۴) قول صحابی کے متعدد اقسام ہیں:

ایک قسم وہ قول ہے جو اجماع صحابہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً کسی معاملہ میں ایک صحابی نے کوئی فتویٰ دے کر فیصلہ کر دیا۔ اور دوسرے صحابہ نے اس کے ساتھ اتفاق کر لیا اور صراحتاً اس کے فیصلہ کو صحیح تسلیم کر لیا. . . . . ایسے قول پر اصلاً کسی کو تنقید کرنے کا حق نہیں۔ اور نہ اس کی مخالفت کسی کے لئے جائز ہو سکتی ہے۔" (ص ۲۵۳)

اور دوسری قسم وہ قول اجتہادی فیصلہ ہے جس کے متعلق یقینی طور پر یہ بات معلوم ہو چکی ہو کہ وہ کتاب اللہ یا سنت رسول اللہؐ کے خلاف ہے، تو اس قسم کے انفرادی

اقوال اور اجتہادی فیصلوں کے متعلق پوری اُمت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ حجت نہیں اور قابلِ اتباع نہیں ہیں۔

(۵) تیسری قسم:

صحابی کا وہ قول اور اجتہادی فیصلہ ہے جو عام صحابہ میں مشہور ہو چکا ہے مگر کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس پر خاموشی اختیار کی گئی ہو۔ اس قسم کے انفرادی اقوال کے متعلق علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ حجت ہیں۔ اگرچہ ان کا اجماع ہونا مختلف فیہ ہے"۔ (ص ۲۵۴)

(۶) چوتھی قسم:

وہ قول صحابی ہے جس کی دوسرے صحابہ نے مخالفت کی ہو۔ گویا ایک واقعہ میں صحابہ سے دو مختلف اقوال منقول ہوں۔ ایسے مختلف اقوال میں بعد کے ائمہ مجتہدین اختیار اور ترجیح سے کام لیں گے۔ جانچ پڑتال کے بعد جو بھی قول کتاب وسنت کے معیار پر پورا اترے گا اس کو دوسرے قول پر ترجیح دی جائے گی گویا اس میں تنقید کے اصول پر عمل درآمد کیا جائے گا اور کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد جو قول قابل ترجیح ثابت ہوا۔ اسے ترجیح دی جائے گی۔" (ص ۲۵۴)

(۷) پانچویں قسم:

قول صحابی کی پانچویں اور آخری قسم وہ ہے جس کے لئے کوئی مخالف قول بھی معروف و معلوم نہ ہو اور وہ صحابہ کرام کے مابین مشہور بھی نہ ہو چکا ہو۔ اسی آخری قسم میں علمائے امت کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے"۔ (ص ۲۵۵)

خلاصہ اقوال:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق مفتی محمد یوسف صاحب کی مندرجہ بالا عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام اجتماعی طور پر:

۱- ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن وحدیث کی روایت کرنے میں ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ہیں''

۲- ''اصول دین اور اعتقادی مسائل کی روایت میں بھی صحابہ کرام ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ہیں''۔

۳- انہوں نے حضور ﷺ سے اخذ کر کے دین کا جو جامع نقشہ اور تفصیلی نظام عقائد، فرائض، عبادات، اصول، اخلاق وغیرہ دین کے سارے شعبوں میں پیش کیا ہے اس میں بھی وہ تنقید سے بالاتر ہیں۔

۴- اور انفرادی طور پر ہر صحابی کا وہ قول بھی تنقید سے بالاتر ہے جس کو دوسرے صحابہ نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔

۵- انفرادی طور پر صحابی کا وہ قول اور اجتہادی فیصلہ بھی تنقید سے بالاتر ہے، جس کی صحابہ کرام نے مخالفت نہیں کی۔ بلکہ خاموشی اختیار کی ہے۔

۶- صحابہ کرام کے اجتہادی اقوال میں اگر اختلاف ہو تو بعد کے مجتہدین ان میں کسی ایک قول کو ترجیح کی بنا پر اختیار کر سکتے ہیں۔ اور اس صورت میں بھی صحابہ کے اقوال سے باہر مجتہدین کوئی فیصلہ نہیں دیں گے۔ گویا اس صورت میں بھی کسی نہ کسی صحابی کا قول ہی شرعاً حجت ہوگا اور اس کا حکم تقریباً وہی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث کا ہے کہ اختلاف کی صورت میں مجتہدین کسی نہ کسی روایت کو ترجیح دے کر اس کو اختیار کرتے ہیں۔ لیکن بہرحال معیار حق رسول خدا صلی اللہ علیہ سلم کا ارشاد ہوگا۔

۷- ساتویں صورت مفتی صاحب نے اختلافی پیش کی ہے اور وہ یہ ہے کہ قول صحابی کے خلاف دوسرے صحابہ کا قول بھی معلوم نہ ہو اور صحابہ میں اس صحابی کا قول مشہور بھی نہ ہوا ہو تو اس صورت میں بھی امام مالک، امام احمد بن حنبل اور ائمہ حنفیہ کی ایک جماعت قول صحابی کو ہی حجت اور تنقید سے بالاتر قرار دیتی ہے اور امام شافعی وغیرہ اس صورت میں قول صحابی کی تقلید کو واجب نہیں قرار دیتے بلکہ غیر صحابی کے اجتہاد پر عمل کرنے کی

اجازت دیتے ہیں۔

دعوت انصاف:

اب جناب مفتی صاحب ہی انصاف سے کام لیں اور قارئین حضرات بھی فیصلہ دیں کہ جب مذکورہ پانچ صورتوں میں صحابہ کرام ہی معیار حق ہیں اور تنقید سے بالاتر اور چھٹی صورت میں بھی نتیجہ ومآل کے اعتبار سے صحابہ کا قول ہی تسلیم کرنا پڑتا ہے اور ساتویں اور آخری صورت میں بھی اکثر مجتہدین کے نزدیک صحابی ہی کا قول حجت ہے اور تنقید سے بالاتر۔ اور امام شافعی وغیرہ ائمہ صحابی کے قول کو چھوڑ کر اجتہاد پر عمل کرنا جائز مانتے ہیں اور وہ یہ حق صرف مجتہدین کو دیتے ہیں نہ کہ ہر عالم وعلامہ کو چہ جائیکہ مودودی جماعت کے غیر علماء ارکان کو للاکثر حکم الکل کے قاعدہ کے تحت تو مودودی صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے دستور میں اس قسم کی عبارت لکھتے کہ:

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام بھی معیار حق ہیں اور تنقید سے بالاتر لیکن انہوں نے برعکس اس کے اپنے اجتہاد کے جوش میں محض ایک اختلافی جزئیہ کو مبنی قرار دے کر سلب کلی کے طور پر یہ عقیدہ لکھ دیا کہ:

''رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے'' الخ

اور معقول اور صحیح بات یہی ہے۔ کیونکہ بقول مفتی صاحب بھی جب صحابہ کرام قرآن وحدیث کی روایت، عقائد واصول، فرائض وعبادات اور دین کا جامع نقشہ پیش کرنے میں یقیناً معیار حق اور تنقید سے بالاتر ہیں اور دستور میں عقیدہ واصول ہی پیش کیا جارہا ہے تو یہی عبارت صراحتاً لکھی جاتی کہ صحابہ کرام بھی معیار حق اور تنقید سے بالاتر ہیں'' اس میں صحابہ کی معیاریت کا مقام بھی دستور پڑھنے والوں پر واضح ہوجاتا اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ما انا علیہ واصحابی کا مفہوم بھی ہمیشہ پیش نظر رہتا۔ لیکن تعجب ہے کہ مفتی صاحب نے مودودی دستور کی تائید کا جو بیڑہ اٹھایا ہے تو کس بنا پر جبکہ دستور کی اس دفعہ میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ صحابہ کرام

کسی صورت میں تو معیارِ حق اور تنقید سے بالاتر ہیں بلکہ ان کے معیارِ حق اور تنقید سے بالاتر ہونے کی بالکلیہ نفی کی گئی ہے۔ آخر مودودی دستور کی اس زیر بحث دفعہ کا مطالعہ کرنے والا یہ کیونکر سمجھے گا کہ مفتی صاحب کی بیان کردہ پانچ صورتوں میں صحابہ کرام تنقید سے بالاتر ہیں۔ اور مفتی صاحب کی یہ تاویل بھی یہاں کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتی کہ دستور کی اس عبارت سے مراد وہی ساتویں اختلافی صورت ہے جس میں بعض ائمہ صحابی کے قول پر اپنے اجتہاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ یہاں سرے سے دستور میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے یہ اختلافی قول مراد لیا جائے۔

مفتی صاحب موصوف یا تو انتہائی درجہ کے سادہ لوح مفتی ہیں یا مدہوشی اور عالم کیف و مستی میں دستور کی اس عبارت کا مطالعہ کیا ہے۔ یا مودودی صاحب کی تائید کو انہوں نے ایمان کا درجہ دیا ہوا ہے ؂

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا   لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مودودی دستور کے مخالفین امت مسلمہ سے خارج ہیں:

عام طور پر مودودی صاحبان یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ مودودی صاحب کسی کی تفسیق و تکفیر نہیں کرتے۔ لیکن ناظرین یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ مودودی صاحب نے اپنے منظور کردہ دستور کے مخالفین پر کتنا بڑا فتویٰ لگایا ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

”ان اساسی معتقدات اور ان کے صریح مقتضیات کو ہم نے ”دستور جماعت اسلامی“ میں پیش کر دیا ہے۔ جو گروہ قرآن کی نصوص قطعیہ سے مرتب کئے ہوئے اس ”دستور جماعت اسلامی“ کی حدود کے اندر ہیں انہیں ہم امت مسلمہ میں شمار کرتے ہیں اور جن لوگوں نے ان حدود کو پھاند لیا ہے انہیں دائرہ امت کے باہر سمجھنے پر مجبور ہیں۔ ہاں ان حدود کے اندر رہتے ہوئے استنباطی اور اجتہادی امور میں جائز حد تک اگر کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ سے جزئی

اختلافات رکھتا ہے تو ایسے اختلافات آنحضرت کی ہدایات اور اسوہ صحابہ کی روشنی میں جائز قرار دیے جائیں گے۔ بشرطیکہ ان اختلافات کو جداگانہ جماعت بندی اور امت سازی کا ذریعہ نہ بنایا جائے“۔

(ترجمان القرآن مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون ۱۹۴۵ء ص ۲۷۷)

اب جناب مفتی صاحب سے سوال ہے کہ جب مودودی دستور کی بیان کردہ حدود کو پھاندنے والے امت مسلمہ سے خارج سمجھے جائیں گے تو جو علماء مودودی صاحب کے اس دستور کی بعض اعتقادی دفعات کو قرآن و حدیث کے خلاف سمجھتے ہیں مثلاً حضرت مدنی ” وغیرہ علماء حق تو کیا مودودی صاحب ان کو امت مسلمہ سے خارج سمجھنے پر مجبور نہیں ہوں گے؟ بلکہ خود مفتی صاحب بھی اس فتویٰ کی زد میں آجائیں گے۔ کیونکہ انہوں نے بھی دستور کے خلاف سلب کلی کی بجائے پانچ صورتوں میں صحابہ کرام کو معیارِ حق اور تنقید سے بالاتر مان لیا ہے یہ ہے مودودی صاحب کا اسلامی دستور ؂

خنجر ناز تو تنہا نہ مرا کشتہ و بس   یعلم اللہ کہ جہاں جملہ قتیل است و قتیل

اور یہاں مفتی صاحب یہ تاویل پیش نہیں کرسکتے کہ ترجمان القرآن کی مذکورہ عبارت میں خود مودودی صاحب نے یہ لکھ دیا ہے کہ:

”ہاں ان حدود کے اندر رہتے ہوئے استنباطی اور اجتہادی امور میں جائز حد تک اگر کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ سے جزوی اختلاف رکھتا ہے“۔ الخ

کیونکہ ان الفاظ کا تعلق فروعی اختلافات سے ہے۔ اور زیر بحث مودودی دستور کی عبارت ایک عقیدہ اور اصول کے طور پر لکھی گئی ہے اور اسی عقیدہ اور اصول کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ قرآن و حدیث کے خلاف قرار دے رہے ہیں اور مودودی صاحب اس کو نصوص قطعیہ سے ثابت مان رہے ہیں۔ لہٰذا یہ اصولی اختلاف ہوگا نہ کہ فروعی۔ علاوہ ازیں یہ بھی ملحوظ رہے کہ گو مفتی صاحب نے مودودی صاحب کی طرف سے یہ صفائی پیش

کی ہے کہ ان کی مراد دستور کی اس عبارت سے صرف اجتہادی امور میں صحابہ سے اختلاف کرنا ہے ـــــ لیکن ''کیا جماعت اسلامی حق پر ہے'' میں مودودی صاحب کا جو بیان حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کے جواب میں تحریر ہے اس میں مودودی صاحب نے اجمالاً یہ تو مان لیا ہے کہ:

''صحابہ کرام کے جو محامد وفضائل کتاب اللہ اور احادیث نبویہ میں مذکور ہیں وہ واجب التسلیم ہیں''

لیکن اس میں کسی جگہ کسی پہلو سے بھی صحابہ کرام کو معیار حق اور تنقید سے بالاتر تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ حضرت مدنی قدس سرہٗ نے زوردار الفاظ میں مودودی صاحب پر یہی اعتراض کیا تھا کہ وہ صحابہ کرام کو معیار حق اور تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے۔ اور اگر مودودی صاحب بھی مفتی محمد یوسف صاحب کی طرح مذکورہ پانچ صورتوں میں صحابہ کرام کو تنقید سے بالاتر مانتے تو یہی موقع تھا اس کے اظہار اور اعلان کا۔ لیکن مودودی صاحب نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا مفتی صاحب کی صفائی مدعی سست، گواہ چست کا ہی مصداق ہوگی۔ واللہ اعلم۔ اور اگر مفتی صاحب کو اپنے امام ابوالاعلیٰ صاحب سے اتنا ہی حسن ظن ہے تو وہ مودودی جماعت اسلامی کے دستور میں یہ اضافہ کرالیں کہ مذکورہ پانچ صورتوں میں صحابہ کرام معیار حق ہیں اور تنقید سے بالاتر بھی۔ کیا مفتی صاحب یہ ذمہ داری قبول کرلیں گے؟ دیدہ باید

انبیاء کرام پر تنقید:

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مودودی دستور کی زیر بحث عبارت سے یہ نتیجہ بھی نکالا تھا کہ مودودی صاحب سوائے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر انبیائے کرام کو بھی معیار حق اور تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے یہ لکھا ہے کہ:

''تاوقتیکہ کسی شخص کو سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالنے کی بیماری نہ لگی ہوئی ہو۔ مذکورہ بالا عبارت سے وہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا جو سوال میں درج کیا گیا ہے رسول خدا کو معیار ماننے اور تنقید سے بالاتر سمجھنے کی وجہ لامحالہ وصف رسالت ہی ہے نہ کہ کچھ اور، یہ وصف رسالت جس میں بھی پایا جائے گا۔ وہ اسی مرتبہ کا مستحق ہوگا۔ جو فقرہ مذکور میں ''رسول خدا کے لئے ثابت کیا گیا ہے''

(کیا جماعت اسلامی حق پر ہے) (ص ۱۸۶)

گو مودودی صاحب نے یہاں یہ تسلیم کرلیا ہے کہ بوجہ وصف رسالت کے وہ دیگر انبیاء کو بھی تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی مودودی صاحب کی تحریرات میں انبیاء کرام علیہ السلام پر تنقید پائی جاتی ہے جس پر حسب ذیل عبارات شاہد ہیں:

(۱) آیت عجلت الیک رب لترضیٰ کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے:

''ان کی مثال اس جلد باز فاتح کی سی ہے جو اپنے اقتدار کا استحکام کئے بغیر مارچ کرتا ہوا چلا جائے۔ اور پیچھے جنگل کی آگ کی طرح مفتوحہ علاقہ میں آگ پھیل جائے۔''

(ترجمان القرآن ج ۲۹ عدد ۴ ص ۵) (یہ عبارت مولانا امین احسن اصلاحی کی ہے)

(۲) چہارم یہ کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقبول بارگاہ ہونے کے باوجود تھے تو وہ بندے اور بشر ہی۔ الوہیت ان میں سے کسی کو حاصل نہ تھی۔ رائے اور فیصلے کی غلطی بھی کرتے تھے بیمار بھی ہوتے تھے۔ آزمائشوں میں بھی ڈالے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ قصور بھی ان سے ہوجاتے تھے۔ اور انہیں سزا تک دی جاتی تھی۔

(ترجمان القرآن ص ۱۵۸ مئی ۱۹۵۵)

(۳) حضرت یونسؑ سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں اور غالباً انہوں نے بے صبر ہوکر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا

تھا۔ (تفہیم القرآن ج ۲ سورۃ یونس ص ۳۱۲۔۳۱۳)

(۴) حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق لکھتے ہیں: ''یہ وہ تنبیہ ہے جو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بلندی درجات کی بشارت دینے کے ساتھ حضرت داؤدؑ کو فرمائی، اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوجاتی ہے کہ جو فعل ان سے صادر ہوا تھا اس کے اندر خواہش نفس کا کچھ دخل تھا۔ اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا۔

(تفہیم القرآن ج ۴ سورہ ص ۳۲۷)

(۵) حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق لکھا کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں تنبیہ فرماتا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا۔ اس کو محض اس لئے اپنا سمجھنا کہ تمہارے صلب سے پیدا ہوا ہے محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے۔''

(تفہیم القرآن سورہ ہود ص ۳۴۳)

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ مودودی صاحب کے لئے جاہلیت کا لفظ اسلام کے مقابلے میں مستعمل ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنی جماعت کے دستور میں فرائض رکنیت کے تحت لکھتے ہیں کہ ''دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کرلینا کہ اسلام اور جاہلیت (غیر اسلام) کا فرق معلوم ہو اور حدود اللہ سے واقفیت ہوجائے۔ (ص ۱۸)

انبیاء کرام کے متعلق ہم نے بطور نمونہ یہ پانچ عبارتیں یہاں درج کی ہیں جن میں انبیائے کرام کے لئے جلد باز فاتح، قصور کرنے والے، رائے اور فیصلے کی غلطی کرنے والے، سزا پانے والے، فریضہ رسالت میں کوتاہیاں کرے والے، بے صبر ہوکر اپنا مستقر چھوڑ جانے والے، خواہش نفس کے تحت کام کرنے والے، حاکمانہ اقتدار کو نامناسب استعمال کرنے والے، اور جاہلیت یعنی غیر اسلامی جذبہ رکھنے والے کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

ہمارا سوال: اب ہم مفتی صاحب موصوف سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ان عبارات میں مودودی صاحب نے انبیائے کرام علیہم السلام پر تنقید نہیں کی؟ اگر کی ہے تو انبیاء کرام تنقید سے بالاتر نہ ہوئے اور نہ وصف رسالت کا امتیاز باقی رہا؟ اور اگر آپ ان عبارات کو تنقید پر محمول نہ فرمائیں تو پھر ہمارا سوال یہ ہے کہ پھر آپ نے بعض صحابہ کرام کے متعلق ان سے کم قسم کے الفاظ کو تنقید پر کیوں محمول کیا ہے؟ چنانچہ اس مسئلہ میں کہ جمعہ اور عید کا دن جمع ہوجائیں تو کیا کرنا چاہیے۔ آپ نے حضرت عبداللہؓ بن عباس اور حضرت عبداللہؓ بن زبیر کے مذہب پر قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید کا خلاصہ بذل المجھود جلد اول کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ:

''ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ کے مذہب پر مولانا مرحوم نے جو تنقید فرمائی اس کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ ابن عباس اور ابن زبیر چونکہ چھوٹے بچے تھے اس لئے انہوں نے حضورؐ کے ارشاد من شاء فلیصل کا مطلب ہی سرے سے نہیں سمجھا۔ بلکہ ایک اعلان اور منادی کی آواز کانوں میں پڑگئی کہ ''جو شخص جمعہ چھوڑ کر عید پر اکتفا کرنا چاہے تو اسے اجازت ہے'' آگے یہ بات نہ معلوم کرسکے کہ یہ خطاب کس کے ساتھ ہورہا ہے اور کن لوگوں کو یہ رخصت دی جاتی ہے'' الخ (علمی جائزہ، ص ۲۴۰)

فرمایئے! اگر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اتنی سی بات تنقید ہے کہ ہر دو حضرات صحابہ بوجہ بچپن کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان کا مطلب نہ سمجھ سکے تو انبیاء کرام کے لئے مذکورہ عبارات میں جو الفاظ ابوالاعلیٰ صاحب نے استعمال کئے ہیں وہ تو یقیناً تنقید پر محمول ہوں گے۔ کہاں یہ بات کہ بچپن کی حالت میں دو صحابی ایک ارشاد کو نہ سمجھ سکے اور کہاں مقام نبوت پر فائز ہونے کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کا خواہش نفس کے تحت ایک فعل کرنا۔ اور حضرت یونسؑ کا فریضہ رسالت میں کوتاہیاں کرنا، اور حضرت نوح علیہ السلام کا ساڑھے نو سو برس کا سارا زمانہ نبوت گذارنے کے بعد جاہلیت (غیر

اسلام) کے جذبہ کے تحت اپنے بیٹے کے لئے دعا کرنا وغیرہ۔ کیا مفتی صاحب موصوف ان عبارات کو انبیائے معصومین پر تنقید نہیں سمجھیں گے؟ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

صحابہ کرام کا معیار حق اور تنقید سے بالاتر ہونا:

شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے صحابہ کے معیار حق اور تنقید سے بالاتر ہونے کا جو مطلب بیان فرمایا ہے وہ حضرت کے الفاظ میں ہی پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں تا کہ قارئین کو زیر بحث مسئلہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

۱۔ لفظ معیار حق ایک لغوی لفظ ہے کسی فن کا اصطلاحی لفظ نہیں ہے، لغت عربی میں معیار ہر اس شے پر بولا جاتا ہے جس سے کسی چیز کی مقدار پہچانی جائے خواہ ناپ وکیل ہو یا وزن وغیرہ اس لئے ہر وہ شخص جس کے فعل، قول، عقیدہ، حال پر پورا اعتماد اس طرح ہو جائے کہ اس میں قصداً غلطی اور نافرمانی کی گنجائش نہ ہو وہ معیار حق ہوگا اور اس کے ذریعہ سے حق پہچانا جائے گا۔ خواہ اس پر وحی الٰہی آتی ہو یا نہیں؟

(الف) اگر رسول یا نبی نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنے کلام قطعی اور قدیم میں اس شخص کے متعلق خبر دیتا ہے کہ ہم اس سے راضی ہیں تو یقینی بات ہے کہ اس سے قصداً کوئی گناہ سرزد نہیں ہوگا۔ ورنہ اس علم قدیم میں جو کہ "لایعزب عنہ مثقال ذرۃ" کا مصداق ہے، خلل لازم آئے گا۔ یا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ قصداً گناہ کرنے والے سے بھی راضی ہوسکتا ہے، حالانکہ حق وہی امر ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوں۔ قرآن مجید میں ہے لایرضی لعبادہ الکفر اس لئے کسی ایسے شخص کے معیار حق ہونے پر تامل ہرگز نہ ہوگا جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے کلام اللہ میں اپنے راضی ہونے کی خبر دی ہو۔ جیسے سابقین، اولین، مہاجرین اور انصار اور تابعین بالاحسان کے لئے سورۃ توبہ میں اور اصحاب حدیبیہ کے لئے سورۃ فتح میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

(ب) علیٰ ہذا القیاس اگر قرآن مجید میں کسی کے متعلق ہمیشہ جنتی رہنے کی یعنی تابید کی خبر دی گئی ہے تو اس کے متعلق بھی کوئی بالقصد غلط کاری اور معصیت کے ابتلاء کا احتمال

نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یقیناً اس کے اعمال اور اقوال حق ہی ہوں گے۔ اس میں کوئی شائبہ باطل کا نہیں پایا جاسکتا ورنہ یہ اخبار قطعیہ قرآنیہ پر حرف آئے گا۔ یا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ اشخاص جن میں معصیت کا تحقق ہے وہ مؤبد فی الجنت ہوں۔

(ج) علیٰ ہذا القیاس اگر قرآن مجید میں کسی کے متعلق تحفظ عن المعاصی والمکروہات کا اعلان کیا گیا ہے وہ یقیناً معیار حق ہوگا۔ اس کی تمام حرکات وسکنات نظر خداوندی کی حفاظت میں ہوں گی۔ اس سے کوئی گناہ قصداً صادر نہ ہوگا جیسا کہ سورۃ حجرات میں صحابہ کرام کے متعلق اعلان کیا گیا ہے، مذکورہ ذیل الفاظ پر غور فرمایئے:

ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان اولئک ھم الراشدون O "کیا اس کفالت قویہ کے بعد بھی کسی نافرمانی کا احتمال ہوسکتا ہے"۔

سورۃ حجرات کی مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ یہ ہے: "لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو معصیت سے بچالیا (اس طرح سے کہ) تم کو ایمان (کامل) کی محبت دی اور اس کی تحصیل کو تمہارے دلوں میں مرغوب کردیا۔ اور کفر اور فسق (یعنی گناہ کبیرہ اور مطلق عصیان گناہ صغیرہ) سے تم کو نفرت دے دی (جس سے تم کو ہر وقت رضائے رسول کی جستجو رہتی ہے) ایسے لوگ (جو تکمیل ایمان کے محب ہیں) خداوند تعالیٰ کے فضل اور انعام سے راہ راست پر ہیں اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (بیان القرآن حضرت تھانویؒ ...)

۲۔ سورۃ فتح کی آیت: محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم الآیہ سورۃ حشر کی آیت، سورۃ اعراف کی آیت اور متعدد کئی آیتیں قطعی طور پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے متعلق انتہائی تزکیہ اور تعدیل پر زور دار روشنی ڈال رہی ہیں تو کیا یہ صحابہ کرام معیار حق نہ ہوں گے اور ان کے اعمال واقوال سے حق پہچانا نہ جائے گا۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھدیتم (میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے) علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین (الحدیث) (تم پر میرے طریقے اور میرے خلفاء راشدین کے طریقے کی پیروی لازم ہے)

اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر (الحدیث) "میرے بعد ابوبکرؓ وعمرؓ کی پیروی کرو" احادیث صحیحہ اس بارے میں بہت زیادہ ہیں، طول کے خوف سے مذکورہ بالا مختصر عرض پر اکتفا کرتا ہوں، اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی اس تصریح کے بعد اگر ہم اس عقیدہ مودودیہ نمبر ۶ پر نظر ڈال کر فیصلہ کرتے ہیں تو کیا مخالفت قرآن حکیم لازم نہیں آتی اور کیا ایسی خبر خداوندی کے بعد بھی حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم اور دوسرے محترم صحابہ کو جانچنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اور کیا مودودی صاحب کا سلبِ کلی کہ کوئی انسان رسول خدا کے سوا نہ معیارحق بن سکتا ہے نہ تنقید سے بالاتر ہوسکتا ہے نہ اس کی ذہنی غلامی جائز ہوسکتی ہے۔ بالکل غلط اور باطل نہیں ہوتا؟ الخ

(مکتوب بنام مولانا عبدالماجد دریا آبادی از مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم ص ۴۴۔۴۶)

۲۔ نیز حضرت مدنیؒ سورۃ حجرات کی آیت مذکورہ ولکن اللہ حبب الیکم الایمان کے تحت فرماتے ہیں:

"غور فرمایئے کہ وہ صحابہ کرام جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو محبوب اور مزین بنادیا ہے اور کفر اور فسوق اور عصیان سے نفرت ڈال دی ہے اور جن کے راشد ہونے کی بصیغہ حصر قرآن شہادت دیتا ہے، کیا وہ معیارِ حق نہ ہوں گے؟ اور کیا وہ تنقید سے بالاتر نہ ہوں گے۔ کیا ان کی تقلید میں کسی قسم کا خطرہ ہوگا؟ اس آیت نے تو تمام صحابہ کرام کی مکمل توثیق کردی۔ اگر صحابہ سے

کوئی گناہ بالقصد ثابت ہوجائے تو وہ آیت مذکورہ اور ان کی محفوظیت مذکورہ کے خلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ عدالت اس ملکہ اور قوت راسخہ کا نام ہے جو کہ اجتناب عن الکبائر اور عدم اصرار علی الصغائر اور خسیس باتوں کے ترک پر آمادہ کرتی ہے، شاذ و نادر طور پر کسی وقت میں کسی جرم کا سرزد ہوجانا اور پھر نادم ہونا اور رہنا عدالت میں کھنڈت نہیں ڈالتا اور نہ ان کی حفاظت کے منافی ہے۔ مگر مودودی صاحب کسی صحابی اور کسی انسان کو معیارحق نہیں مانتے اور نہ کسی کو تنقید اور جرح سے بالاتر مانتے ہیں اور نہ قابل تقلید کہتے ہیں۔

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

کیا یہ اختلاف فروعی ہے یا اصولی؟

(مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت ص ۴۷)

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ معیار حق ہونے کے لئے معصوم ہونا ضروری نہیں بلکہ جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے راضی ہونے کا اعلان کردیا ہے وہی معیارحق ہے۔ کیونکہ اس سے حق ملے گا نہ کہ باطل۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے اصحاب ستاروں کے مانند ہیں جس کی پیروی کروگے ہدایت پاؤ گے) اس سے معلوم ہوا کہ ہر صحابی ہدایت کا ستارہ ہے، کسی میں بھی ضلالت اور گمراہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہم جناب مفتی صاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ جن دس اصحاب کو بنشانِ نام حق تعالیٰ کی طرف سے جنت کی قطعی بشارت دی گئی ہے اور اسی بنا پر ان کو عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے یعنی حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سعید اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم اجمعین۔ کیا آپ اور مودودی صاحب ان کو بھی معیارحق اور تنقید سے بالاتر نہیں سمجھیں گے اور جب علام الغیوب خدا نے ان کو جانچ پرکھ کر جنتی ہونے کا

اعلان کردیا تو اس کے بعد بھی ابوالاعلیٰ صاحب کی طرف سے جانچ پڑتال کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

ع   بریں علم ودانش بباید گریست

ایک شبہ کا ازالہ:

مفتی محمد یوسف صاحب نے جو اپنی کتاب میں فروعی اور اجتہادی مسائل میں صحابہ کے باہمی اختلافات اور تنقیدات کا ذکر کیا ہے اور بعض اقوالِ صحابہ سے بعد کے بعض مجتہدین کا اختلاف بھی نقل کیا ہے۔ تو یہ امر صحابہ کرام کے معیار اور تنقید سے بالاتر ہونے کے خلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ صحابہ کا باہمی اختلاف وہاں ہے جہاں کتاب و سنت کی نص موجود نہ ہو یا جہاں نصوص میں بظاہر تعارض ہو اور صحابہ نے اپنے اجتہاد سے ان میں کوئی صورت تطبیق یا ترجیح کی پیدا کی ہو۔ اسی طرح امام شافعیؒ وغیرہ بعض مجتہدین نے صحابی کے کسی قول سے اختلاف کیا ہے تو وہاں بھی یہی صورتیں ہیں۔ اور یہ تو آپ مانتے ہوں گے کہ کوئی صحابی کتاب وسنت کے کسی واضح اور قطعی حکم کی قصداً مخالفت نہیں کرسکتا ورنہ الصحابة کلھم عدول (یعنی صحابہ کرام سب عادل ہیں کا اجماعی ضابطہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ صحابہ کا مقام تو بہت بلند ہے، بعد کے ائمہ مجتہدین سے بھی ہمیں یہی حسنِ عقیدت ہے کہ وہ جان بوجھ کر کتاب وسنت کے کسی قطعی حکم کے خلاف فیصلہ نہیں دے سکتے۔ تو لامحالہ صحابہ کا باہمی اختلاف یا بعد کے مجتہدین کا ان سے رائے کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف نہ ہوگا۔ بلکہ یہ اختلاف خطا وصواب کا اختلاف ہوگا جس میں حسب ارشادِ نبوی مجتہد مخطی (جس کی رائے میں خطا ہو جائے) کو ایک اور مجتہد مصیب (جس کی رائے اور قیاس صحیح ہو) کو دو اجر ملیں گے۔ تو خطا کرنے والے مجتہد کو ایک اجر کا ملنا خود ایک مستقل دلیل ہے اس بات کی کہ اجتہادی اور فروعی اختلاف حق و باطل کا اختلاف نہیں ہوتا ورنہ اہل باطل کو اجر کیسے مل سکتا ہے اس لئے باوجود باہمی اجتہادی اختلافات کے صحابہ کرام برحق بھی ہوں گے اور معیار حق بھی۔

حکیم الاسلام کا ارشاد:

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

’’صحابہ کا معیارِ حق ہونا قیاسی یا استنباطی نہیں بلکہ منصوص ہے جس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک مستقل حدیث ارشاد فرمائی ہے۔

عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تفترق امتی علی ثلث وسبعین ملة کلھم فی النار الا ملة واحدة قالوا من ھی یا رسول اللہ قال ما انا علیہ واصحابی

(مختصراً عن المشکوۃ)

’’عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت تہتر فرقوں پر تقسیم ہو جائے گی۔ سوائے ایک کے سب جہنم میں ڈالے جائیں گے، پوچھا گیا کہ وہ (مستثنیٰ) کون ہیں یا رسول اللہ تو فرمایا جو لوگ میرے اور میرے اصحاب کے طریق پر ہیں‘‘۔

(ا) اس حدیث میں فرق اسلامیہ کی نجات و ہلاک اور بالفاظ دیگر ان کے حق و باطل ہونے کا معیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ وہ میرا اور میرے اصحاب کا طریقہ ہے لیکن اس طریقہ کو شخصیتوں سے الگ کر کے تنہا کو معیار نہیں بتلایا بلکہ اپنی ذات بابرکات اور اپنے صحابہ کی ذوات قدسیہ کی طرف منسوب کر کے معیار بتلایا کہ وہ ان شخصیتوں کے ضمن میں پایا جائے۔ ورنہ بیانِ معیار میں اس نسبت اور نامزدگی کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ من ھم کے جواب میں بجائے ما انا علیہ کے سیدھی تعبیر یہ تھی کہ ماجئت بہ فرمادیا جاتا۔ یعنی معیار حق وہی ہے جسے لے کر میں آیا ہوں۔ یعنی شریعت۔

(ب) پھر اس طریقہ کو شخصیت کی طرف منسوب کرنے کے سلسلہ میں بظاہر ما کے بعد انا کافی تھا اور یہ فرما دینا بس کرتا تھا کہ نجات و ہلاکت کے پہچاننے کا طریقہ میری ذات ہے تا کہ معیار حق صرف رسول کی ذات ہوتی۔ لیکن آپ ﷺ نے اپنے ساتھ اپنے صحابہ کو بھی شامل فرمایا۔ جس سے واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ فرقوں اور مختلف مکاتبِ خیال کے حق و باطل کے پرکھنے کا معیار جیسے رسول کی ذات ہے ویسے ہی صحابہ رسول کی ذوات بھی ہیں اور اس لئے رسول خدا کی موجودگی یا عدم موجودگی میں کسی فرقہ اور مکتبِ خیال کے افراد پرکھنے کے لئے یہ دیکھ لینا کافی ہے کہ وہ صحابہ کی راہ کے مطابق چل رہے ہیں یا مخالف سمت میں ہیں۔ ان کی اطاعت کر رہے ہیں یا اس سے گریز پا ہیں۔ ان کے ساتھ حسن ظن کا برتاؤ کر رہے ہیں یا سوء ظن اور بے اعتمادی کا کہ یہی شان کسی کے معیار ہونے کی ہوتی ہے۔ جس سے صاف طور پر رسول خدا کے ساتھ صحابہ رسول کا معیارِ حق ہونا واضح ہو جاتا ہے اور یہ حدیث اس بارہ میں نصِ صریح ثابت ہوتی ہے۔ جس کا مقصد ہی یہ مدعا ثابت کرنا ہے''۔

(ج) ادھر الفاظ حدیث سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ رسول خدا کے سوا ایک دو صحابی ہی معیار حق نہیں بنا دیئے گئے بلکہ اصحابی جمع کا صیغہ لا کر اشارہ کیا گیا ہے کہ رسولؐ کے سوا تمام صحابہ معیار حق بن کر واجب الاطاعت ہیں۔ جس کے لئے احادیث میں ایک، ایک، دو، دو، چار، چار اس سے زیادہ اور پھر پوری جماعت کی اقتدا کے اوامر وارد ہوئے ہیں۔ کیونکہ معیار، اگر معیار ہو کر بھی واجب الاطاعت نہ بنے تو وہ معیار معیار نہیں رہتا۔ اور جبکہ معیار حق ساری جماعت صحابہ کو فرمایا گیا تو سارے ہی صحابہ بلا استثناء واجب الاطاعت بھی قرار دیئے گئے۔ ممکن ہے کہ شکی کو شک و شبہ گذرے کہ جب صحابہ کے

فروعی مذاہب مختلف رہے۔ اور مسائل میں اختلاف و تناقض تک نظر آتا ہے۔ تو لامحالہ ایک کی اطاعت کر کے بقیہ کی اطاعت سے دست برداری ہی دینی پڑے گی۔ ورنہ ضدین کا اجتماع ہو جائے گا جو ناممکن العمل ہے تو پھر سب کی اطاعت و پیروی کہاں رہی۔ اور ممکن ہی کب ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ اگر ایک دوسرے کی پیروی دوسروں کی طعن و تنقید سے بچ کر اور سب کی عظمت رکھ کر ہو تو وہ سب کی پیروی کہلائی جائے گی۔ جیسے سلسلہ نبوت میں عملاً پیروی ایک رسول کی ہوتی ہے مگر معیارِ حق سب کو سمجھا جاتا ہے۔ عظمت و تنزیہ اور تقدیس سب کی یکساں کی جاتی ہے، تنقید و تخطیہ سب کا معصیت سمجھا جاتا ہے۔ تو یہی سارے انبیاء کی پیروی شمار کی جاتی ہے۔ ورنہ کسی ایک پر بھی زبانِ طعن یا لسانِ نقد تبصرہ کھول کر ہزار کی پیروی بھی پیروی نہیں ہے۔ بلکہ سب پر مخالفت اور بغاوت ہے۔ کیونکہ خود حضرات صحابہ فروعات میں مختلف رہنے کے باوجود آپس میں ایک دوسرے کی عظمت و توقیر کو واجب و لازم سمجھتے اور اس کے خلاف کو برداشت نہیں کر سکتے تھے . . . . ذیل کے ارشادات نبوی میں اس حقیقت پر روشنی بھی ڈال دی گئی ہے کہ اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے) ایھم کے لفظ سے اقتداء تو مطلق رکھی گئی ہے کہ کسی کی بھی کی جائے ہدایت مل جائے گی لیکن نجوم کے لفظ سے نورانی سمجھنا اور ہادی ماننا سب کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے، یہ نہیں کہ جس کی پیروی کرو نجم ہدایت اور نور بخش صرف اسی کو سمجھو، پس پیروی کا عمل تو ایک دو تک محدود ہو سکتا ہے۔ لیکن نور افشانی کا عقیدہ ایک دو تک محدود نہیں رہ سکتا، وہ سب کے لئے ماننا لازمی ہوگا''۔ (مقدمہ مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت از ص ۱۰ تا ص ۲۰)

حضرت قاری صاحب مدظلہ نے اپنے مخصوص حکیمانہ رنگ میں صحابہ کے

اجتہادی اختلافات کی توجیہ فرما کر یہ سمجھا دیا ہے کہ یہ اجتہادی اختلاف ان کے معیارِ حق ہونے اور تنقید سے بالاتر ہونے کے منافی نہیں ہے، اگر مفتی محمد یوسف صاحب تھوڑی دیر کے لئے مودودیت سے بالاتر ہو کر اس پر غور وفکر فرمائیں تو امید ہے کہ ان کا شک بھی زائل ہو جائے۔

ایک اور طعن کا جواب:

معیارِ حق کی بحث میں عموماً مودودی صاحبان یہ طعن دیا کرتے ہیں کہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ بھی صحابی تھے لیکن باوجود اس کے ان سے زنا کا ارتکاب ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان پر حد شرعی جاری کی گئی تھی۔ تو اس قسم کے گناہ کے ارتکاب کے باوجود ہم ان کو معیارِ حق کیسے قرار دے سکتے ہیں؟ اور خود مودودی صاحب نے بھی مفتی محمد یوسف صاحب کے خط کے جواب میں یہ لکھا ہے کہ:

''حضرت ماعز کی مغفرت میں کوئی شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے ایسی توبہ کی کہ جو دنیا میں کم ہی کسی نے کی ہوگی'' مگر کیا اس سے امر واقعہ کو کہ ان سے زنا کا صدر ہوا تھا بیان کرنا ممنوع ہے؟

(ماہنامہ جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک نومبر ۱۹۶۵ء)

اس کا جواب یہ ہے کہ گو حضرت ماعز رضی اللہ عنہ سے یہ گناہ ہوا۔ لیکن ان کو توبہ بھی ایسی نصیب ہوئی جس کے متعلق خود مودودی صاحب بھی یہ مان رہے ہیں کہ:
''ایسی توبہ دنیا میں کم ہی کسی نے کی ہوگی تو اب ان کی یہ توبہ ہی دوسروں کے لئے توبہ واستغفار کے سلسلے میں معیارِ حق بن جائے گی۔ اب ان پر تنقید جائز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے التائب من الذنب کمن لاذنب له (گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس نے گناہ کیا ہی نہیں) اسی طرح اگر شاذ ونادر کسی صحابی سے کوئی غلطی ہوئی تو اس کو خالص توبہ اور اصلاح کی بھی توفیق ملی۔ کوئی صحابی ایسا نہیں ہے جس کی وفات کامل ایمان اور رضائے خداوندی پر نہ ہوئی ہو اور یہی بات ان

کے معیارِ حق اور تنقید سے بالاتر ہونے کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ اللہ اللہ فی اصحابی لاتتخذوھم غرضاً من بعدی ''میرے اصحاب کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ اللہ سے ڈرتے رہنا، میرے بعد ان کو نشانہ نہ بنالینا۔''

مفتیانہ تیور:

علماءِ حق تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ کسی صحابی کا ذکر اس طرح کیا جائے جس میں اس کی تنقیص وتحقیر کا پہلو نکلتا ہو۔ لیکن یہ مودودیت کچھ ایسا فتنہ ہے کہ خواہ مولوی ہو یا مفتی جو بھی اس میں مبتلا ہو جائے مودودی صاحب کی صفائی میں وہ ایسا اندازِ بیان اختیار کرتا ہے جس میں نہ صرف صحابہ بلکہ انبیائے کرام کی بھی تنقیص وتوہین لازم آتی ہے۔ چنانچہ عصمت انبیاء کی بحث میں چونکہ مودودی صاحب نے یہ لکھ دیا ہے کہ حضرت یونسؑ سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں لہٰذا مودودی صاحب کا ہر وفادار حضرت یونس علیہ السلام کی کوتاہیاں شمار کرنے میں چابکدستی دکھلائے گا۔ چنانچہ مفتی محمد یوسف صاحب بھی اس سلسلہ میں یوں گوہر افشاں ہیں:

''اب معترضین حضرات ہی بتائیں کہ حضرت یونس بے صبری کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہٹے تھے یا نہیں؟ اور بے صبری کی وجہ سے اذن خداوندی کے بغیر ان کا چلا جانا کوتاہی تھی یا نہیں؟ اور جب ان پر یہ واجب اور لازم تھا کہ وہ اپنی قوم میں رہ کر تبلیغ کرتے اور بے صبر ہو کر نہ چلے جاتے تو ان کی یہ کوتاہی فرائض رسالت کی ادائیگی سے متعلق ہوئی یا نہیں'' الخ۔ (علمی جائزہ ص ۱۳۰)

یہاں عصمتِ انبیاء کی بحث مقصود نہیں۔ اس بارے میں مفتی صاحب کے استدلالات کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے۔ یہ عبارت اس امر کے ثبوت کے لئے یہاں پیش کی ہے کہ مودودی صاحبان جب چاہیں انبیائے کرام پر بھی اپنا تنقیدی نشتر چلانے میں دریغ نہیں کرتے اور مفتی صاحب نے تو جو اندازِ تحریر اختیار کیا ہے اس میں حضرت یونس

علیہ السلام کی یقیناً تنقیص پائی جاتی ہے۔ تو اب ان کا یہ کہنا کیونکر درست ہوسکتا ہے کہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت انبیاء کو تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ مفتی صاحب سے ہم دریافت کرتے ہیں کہ کیا ان کی مذکورہ عبارت میں حضرت یونسؑ پر تنقید نہیں پائی جاتی۔ وہی تنقید جو آپ صحابہ کرام پر جائز مانتے ہیں۔ لیکن انبیاء پر جائز قرار نہیں دیتے۔ چنانچہ استدلال میں مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ:

"جانچنے اور پرکھنے کے معنی میں جو تنقید ہو وہ ہر اس قول وعمل پر کی جاسکتی ہے جس میں صواب اور خطا دونوں کا احتمال ہو اور اس قول وعمل پر تنقید نہیں کی جاسکتی جو خطا کے احتمال سے محفوظ ہو اور عصمت اسکے لئے یقینی ہو۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی شخص بھی معصوم نہیں ہے، اس لئے اس کا قول خطا کے احتمال سے محفوظ نہیں ہوسکتا لہٰذا وہ تنقید سے بھی بالاتر نہیں ہوسکتا"۔

(علمی جائزہ ص ۲۹۳)

ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے قول وعمل میں خطا کا احتمال ہی نہیں ہے تو پھر آپ نے حضرت یونس علیہ السلام کی خطائیں اور کوتاہیاں کس لئے ثابت کی ہیں۔ کیا آپ حضرت یونسؑ کو نبی نہیں مانتے؟

تنقید کا معنی اور مفہوم:

مفتی محمد یوسف صاحب تحریر فرماتے ہیں عربی محاورے میں تنقید کا لفظ نقد سے لیا گیا ہے اور نقد انتقاد اور تنقد سب کے معنی کتب لغت میں قریب قریب ایک ہیں۔ یعنی کسی چیز میں غور وفکر اور تأمل کرنے کے بعد یہ تمیز کرنا کہ جید ہے یا ردی۔ کھری ہے یا کھوٹی۔ اس کھرے یا کھوٹے کے درمیان تمیز کرنے کا نام تنقید، تنقد اور انتقاد ہے۔ اگرچہ اس کے علاوہ بھی کتب لغت میں اس لفظ کے معانی بیان کئے گئے ہیں الخ۔

(ب) اسی محاورے سے تنقید کا لفظ اردو زبان میں جانچنے اور پرکھنے کے معنی میں مستعمل ہونے لگا ہے۔ یہاں تک کہ لغات عربیہ کے معانی بیان

کرنے کے لئے جتنی کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں تقریباً سب میں نقد، انتقاد اور تنقید کے معنی یہ بیان کئے گئے ہیں کہ جانچنا اور پرکھنا لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عربی محاورے میں یہ الفاظ عیوب اور نقائص، فضائل اور محاسن کے اظہار میں بھی مستعمل ہوتے ہیں..... علامہ ابن اثیر نے نہایہ میں ذکر کیا ہے وفی حدیث ابی الدرداء ان نقدت الناس نقدوک ای ان عبتھم واعتبتھم عابوک بمثلہ اھ اسی محاورے سے یہ لفظ تنقید میں عیب جوئی کے معنی کی بھی گنجائش پائی جاتی ہے۔ واہ اردو زبان میں تنقید کا لفظ اس میں مستعمل ہو یا نہ ہو مگر اصل لفظ میں عیب جوئی کے معنی کی گنجائش ضرور پائی جاتی ہے جیسا کہ اوپر کے عربی محاورات سے ظاہر ہوچکا ہے۔ اب ذیل میں تنقید کی شرعی حیثیت پر بحث کی جاتی ہے تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ شریعت کی نگاہ میں تنقید کی کیا حیثیت ہے"۔ (علمی جائزہ ص ۲۰۰ و ۲۰۱)

(ج) تنقید کی شرعی حیثیت:

تنقید کے مندرجہ بالا دو معنوں میں سے جو آخری معنی ہیں یعنی عیب جوئی یا عیب چینی اس کی شرعی حیثیت قرآن وحدیث کی رو سے یہ ہے کہ وہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کے مؤمن پر بھی جائز نہیں الا یہ کہ تنقید نہ کرنے سے دین کی عظیم تر مصلحت فوت ہونے کا اندیشہ ہو۔ اسی قبیل سے وہ تنقید ہے جو حفاظت دین کی غرض سے ائمہ حدیث نے رواۃ حدیث پر کی ہے جس کو ان کی اصطلاح میں "الجرح والتعدیل" کہتے ہیں۔ کئی اور بھی صورتیں ہیں جن میں کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے فقہاء نے اس قسم کی تنقید کو جائز رکھا ہے۔ ان چند مخصوص صورتوں کے علاوہ کسی مؤمن پر بھی یہ تنقید جائز نہیں ہے اگرچہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کا مؤمن کیوں نہ ہو۔ تو صحابہ کرام پر یا دوسرے ائمہ اور بزرگان دین پر تنقید کس طرح جائز ہوگی؟ (ص ۲۰۱)

(د) یہ اس تنقید کی شرعی حیثیت ہے جو عیب چینی اور عیب جوئی کے معنی میں استعمال

ہوتی ہے۔ رہی وہ تنقید جو جانچنے اور پرکھنے کے معنی میں مستعمل ہوتی ہے تو اس کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے لئے درج ذیل سطور کو ملاحظہ فرمایا جائے۔

''تنقید کے دوسرے معنی جانچنے اور پرکھنے کے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی قول اور فیصلہ کو یا رائے یا عمل کو کتاب وسنت کی شرعی کسوٹی اور ردو قبول کے شرعی معیار پر جانچا اور پرکھا جائے اور جانچنے اور پرکھنے کے بعد دیکھا جائے کہ قابلِ قبول ہے یا لائقِ تردید۔ اس تردید کی شرعی حیثیت یہ ہے کہ یہ ہر اس رائے اور قول وعمل پر کی جاسکتی ہے جس میں صواب اور خطا، صحیح و غلط دونوں کا احتمال ہو۔ اور حق وصواب کا پہلو اس میں متعین نہ ہو۔ اور ہر وہ رائے اور قول وعمل قابل تنقید نہیں ہے۔ جس میں حق وصواب کا پہلو متعین ہو اور اس کی صحت یقینی ہو اور خطا وغلط ہونے کا اس میں احتمال ہی نہ ہو۔ ایسے قول و عمل معیارحق بھی ہیں اور تنقید سے بھی بالاتر ہیں''۔ (ص ۲۰۳)

(س) حضرات انبیاء علیہم السلام یقیناً اس تنقید سے بالاتر ہیں اور ان کے علاوہ امت کے تمام افراد کے انفرادی اقوال ہرگز تنقید سے بالاتر نہیں ہیں۔ بلکہ ان پر تنقید کی جاسکتی ہے۔ اس لحاظ سے معیارحق صرف اللہ کی کتاب اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اور کتاب وسنت کے علاوہ کسی کا ذاتی قول یا اجتہادی فیصلہ ہرگز معیارحق نہیں ہوسکتا بلکہ اس قابل ہے کہ کتاب و سنت کے معیارحق پر جانچا اور پرکھا جائے اور جانچنے کے بعد یہ دیکھا جائے کہ کتاب وسنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ مطابق ہو تو معمول بنایا جائے گا اور مخالف ہو تو چھوڑ دیا جائے گا۔ (ص ۲۰۴)

تبصرہ (۱): مفتی محمد یوسف صاحب نے لغت اور محاورات عرب سے جو تنقید کے معنی لکھے ہیں۔ یعنی کھرے اور کھوٹے کو پرکھنا اور عیب چینی اور عیب جوئی اور اردو لغت سے یہ معنی نقل کیا ہے کہ کسی چیز کو جانچنا اور پرکھنا تو ان میں چنداں کوئی خاص فرق

نہیں ہے، کیونکہ کھوٹ اور عیب اور ردی ہونا ایک ہی چیز ہے اسی چیز کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے جس میں کھوٹ اور عیب کا احتمال ہو۔ باقی رہا تنقید کا شرعی مفہوم تو اس کے لئے مفتی صاحب نے کتاب وسنت سے کوئی حوالہ نہیں پیش کیا جس سے یہ ثابت ہو کہ لفظ تنقید سے شرعاً یہ مراد ہے کہ کسی کے قول وعمل کو کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

(۲) مفتی صاحب نے جو انبیاء کرام کو اس شرعی تنقید سے بالاتر قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ انبیاء کے اقوال وافعال میں صرف حق کا پہلو ہی متعین ہوتا ہے اور ان میں خطا اور غلطی کا احتمال نہیں ہوتا'' تو تنقید کی اس تعریف کی رو سے تو انبیاء کرام بھی تنقید سے بالاتر ثابت نہیں ہوسکتے کیونکہ جب انبیاء علیہم السلام اپنے قیاس واجتہاد سے کوئی بات یا عمل کرتے ہیں اور اس میں خطا ہوجاتی ہے تو وحی الٰہی اس کی اصلاح کرتی ہے اور اس کو زلت انبیاء کہا جاتا ہے اور خود مودودی صاحب نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چند زلات (لغزشیں) تسلیم کی ہیں جن کو مفتی صاحب نے بھی اپنی کتاب ''علمی جائزہ'' میں درج کیا ہے تو سوال یہ ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے اقوال وافعال میں غلطی کا احتمال ہی نہیں ہوتا تو وحی الٰہی کس چیز کی اصلاح کرتی ہے مثلاً۔

(ا) قرآن مجید میں ہے عفا اللہ عنک لم اذنت لھم (اللہ تعالیٰ آپ سے درگذر فرمائیں۔ آپ نے ان (منافقین) کو کیوں رخصت دے دی)۔

(ب) یآ ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک ○ (اے میرے نبی آپ اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جس کو اللہ نے حلال کیا ہے) اس آیت کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد نہ کھانے کی جو قسم کھائی تھی اس کا کفارہ ادا فرمایا تو یہاں نہ صرف یہ کہ خطا کا احتمال بلکہ صراحتاً وقوع ثابت ہوا۔ لہٰذا آپ کی اپنی بیان کردہ تعریف کی بنا پر تو نعوذ باللہ امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم بھی معیارحق اور تنقید سے بالاتر نہیں رہیں گے یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ میں آپ کی بیان کردہ تنقید کی شرعی تعریف پر اعتراض کر رہا ہوں۔ کیونکہ جس بنا پر آپ صحابہ کرام کے معیارحق اور تنقید سے بالاتر ہونے کی نفی کر رہے

ہیں اسی بنا پر انبیاء کرام کے معیار حق اور تنقید سے بالاتر ہونے کی نفی لازم آتی ہے۔

(ج) اس کے جواب میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انبیاء سے اگر اجتہادی خطا ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی اس کی اصلاح ہوجاتی ہے۔ کیونکہ آپ نے تنقید سے بالاتر ہونے کا مبنی یہ قرار دیا ہے کہ خطا کے صدور کا جہاں احتمال ہی نہ ہو۔ یہ نہیں لکھا کہ وہ شخصیتیں تنقید سے بالاتر ہوتی ہیں جن سے خطا تو ہوجاتی ہے لیکن خطا پر ان کا باقی رہنا محال ہوتا ہے۔ کیونکہ وحی الٰہی سے ان کی فوراً اصلاح کردی جاتی ہے۔

(د) آپ کی تعریف تنقید کی بنا پر نہ صرف یہ کہ انبیاء کرام محل تنقید ثابت ہوتے ہیں بلکہ مودودی صاحب اور آپ نے فرائضِ رسالت کی ادائیگی کے سلسلہ میں حضرت یونس علیہ السلام پر پرزور تنقید کر بھی دی ہے۔ لہٰذا آپ کا یہ عمل آپ کے حسب ذیل بیان کردہ عقیدہ کے منافی ہے کہ:

"عصمت صرف انبیاء کی مخصوص صفت ہے جس میں ان کے ساتھ کوئی فرد بشر شریک نہیں ہے۔ ان کی آراء واقوال، فیصلے اور اعمال سب کے سب وحی الٰہی کے تحت ہونے کی وجہ سے حق اور صواب ہیں۔ ان میں نہ غلطی کا شائبہ ہوسکتا ہے اور نہ خطا کا امکان لہٰذا وہ ہر قسم کی تنقید سے بھی بالاتر ہیں۔ اورامت کے لئے اپنی پوری زندگی میں بہترین قسم کا اسوہ بھی ہیں۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (علمی جائزہ ص ۲۰۵)۔

دوسرا رخ: مذکورہ عبارت میں تو مفتی صاحب موصوف نے انبیاء کرام کی آراء، اقوال، فیصلوں اور اعمال سب کو غلطی کے شائبہ اور خطا کے امکان سے پاک تسلیم کیا ہے۔ لیکن عصمت انبیاء کے بارے میں عصمت عن الکبائر کی بحث کے بعد "عصمت عن الصغائر" کے عنوان کے تحت یہ لکھ چکے ہیں کہ:

"یہ تفصیل عصمت عن الکبائر کے متعلق تھی، رہے صغائر تو ان کا معاملہ کبائر سے ذرا مختلف ہے۔ یہاں بالاتفاق یہ جائز تسلیم کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم

السلام سے سہواً و خطأً صغائر سرزد ہوسکتے ہیں۔ البتہ محققین کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ اس پر انہیں متنبہ کیا جائے اور من جانب اللہ انہیں اس بات سے آگاہ کیا جائے کہ یہ جو کچھ آپ سے سرزد ہوا ہے از قسم خطا اور از نوع لغزش ہے۔ قابل اتباع ہرگز نہیں ہے۔ رہا عمداً صغائر کا صدور تو اس کے بارے میں اگرچہ اختلاف ضرور ہے۔ مگر جمہور کہتے ہیں کہ ان سے عمداً بھی صغائر سرزد ہوسکتے ہیں بشرطیکہ وہ خسیس افعال نہ ہوں۔" (علمی جائزہ ص ۵۰)

صریح تعارض: مفتی محمد یوسف صاحب بھی عجیب بزرگ ہیں۔ عصمت انبیاء کی بحث میں انبیائے کرام کے بارے میں خطاء لغزش سے بڑھ کر صغیرہ گناہوں کا جواز بھی نہ صرف سہواً بلکہ عمداً مان رہے ہیں۔ لیکن صحابہ کرام کے معیار حق ہونے کی بحث میں انبیاء کے متعلق سب کی نفی کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں کہ:

"ان کی آراء واقوال، فیصلے اور اعمال سب کے سب وحی الٰہی کے تحت ہونے کی وجہ سے حق اور صواب ہیں۔ ان میں نہ غلطی کا شائبہ ہوسکتا ہے اور نہ خطا کا امکان لہٰذا وہ ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ہیں"۔ (ص ۲۰۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کا اصل دین ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تائید وتصدیق کرنا ہے۔ چونکہ عصمت انبیاء کی بحث میں مودودی صاحب کی عبارتوں کی تائید میں انبیاء علیہم السلام کے لئے صغائر کے صدور کا نظریہ مفید پڑتا تھا اس لئے وہاں وہ قول اختیار کیا اور یہاں معیار حق کی بحث میں چونکہ صحابہ کرام کا خطا کار ثابت کرنا مطلوب تھا اس لئے انبیاء کرام کو امکانِ خطا سے بھی بالکل مبرا قرار دے دیا گویا کہ دونوں جگہ انبیاء کرام کے متعلق مختلف عقیدہ پیش کیا۔ یہ ہے مفتی صاحب کے مخلصانہ علمی جائزہ کی حقیقت

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی   تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

مودودی تنقید یقیناً توہین ہے:

ہم نے گذشتہ اوراق میں مسئلہ معیارِ حق اور تنقید کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ محض علمی پہلوؤں کے پیش نظر تھا۔ ورنہ ''خلافت وملوکیت'' کے بعد نہ تنقید کے لغوی اور شرعی معنی کی تحقیق کی ضرورت رہتی ہے اور نہ تقلید صحابی وغیرہ کی بحث کی۔ کیونکہ ابوالاعلیٰ صاحب نے اپنی کتاب ''خلافت وملوکیت'' میں جو اندازِ تحریر وتحقیق اختیار کیا ہے، اس میں صراحتاً بعض صحابہ کرام کی تحقیر وتوہین پائی جاتی ہے جس کے سامنے مفتی صاحب کی دوراز کار تاویلات ھباءً منثوراً ہو جاتی ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ مفتی صاحب نے صحابہ کے معیارِ حق ہونے کی بحث میں ''خلافت وملوکیت'' کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں کیا۔ کیا اسے علمی خیانت پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ مفتی صاحب مانیں یا نہ مانیں، یہ حقیقت ہر اہل انصاف تسلیم کرے گا کہ چونکہ ''خلافت وملوکیت'' میں مودودی صاحب نے بعض جلیل القدر صحابہ کی صریح توہین کی ہے اس لئے مفتی صاحب اس کتاب کے تذکرہ کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں تاکہ ان کے امام ومقتداء کی کہیں پردہ دری نہ ہو جائے اور مسئلہ معیارِ حق میں مودودی صاحب کی جو ناجائز تائید کی ہے وہ سب بے کار نہ ہو جائے اور اس طرح ''علمی جائزہ'' کہیں ''علمی زائغہ'' ہی نہ ثابت ہو۔ لیکن مفتی صاحب اس پردہ پوشی میں کامیاب نہیں ہو سکے ؎

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد   میلش اندر طعنہ پاکاں برد

توہین صحابہ مودودی قلم سے:

شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ نے ''مودودی دستور'' کی زیر بحث دفعہ پر اعتراض کرتے ہوئے جب یہ فرمایا تھا کہ صحابہ کرامؓ پر تنقید جائز قرار دے کر مودودی صاحب نے فتنوں کا دروازہ کھول دیا ہے تو اس کے جواب میں مودودی صاحب اور ان کے متبعین یہ کہتے تھے کہ ہماری مراد تنقید سے توہین نہیں ہے اور خود مفتی محمد یوسف صاحب نے بھی مودودی صاحب کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ:

''تنقید کے معنی عیب چینی ایک جاہل آدمی تو سمجھ سکتا ہے مگر کسی صاحب علم آدمی سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس لفظ کا یہ مفہوم سمجھے گا۔ تنقید کے معنی جانچنے اور پرکھنے کے ہیں اور خود دستور کی مذکورہ بالا عبارت میں اس معنی کی تصریح بھی کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد عیب چینی مراد لینے کی گنجائش صرف ایک فتنہ پرداز آدمی ہی اس لفظ سے نکال سکتا ہے'' الخ (''علمی جائزہ'' ص ۲۹۹ بحوالہ ''کیا جماعت اسلامی حق پر ہے'')

اور خود مفتی صاحب نے بھی مودودی صاحب کی پوزیشن صاف کرتے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ:

''اگر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے اہل علم حضرات تنقید سے یہاں تنقیص اور توہین مراد لیتے یا یہ تنقید عیب جوئی اور عیب چینی کے معنی میں لیتے تو ہم صاف طور پر ان کے اس عقیدہ کو گمراہی اور نظریہ کو باطل بلکہ زندقہ قرار دیتے کیونکہ صحابہ کرام میں اس معنی میں تنقید کو اہل السنّت والجماعت نے گمراہی اور زندقہ قرار دیا ہے''۔ (علمی جائزہ ص ۲۹۶)

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید:

گو مودودی جماعت تاویلات وتوجیہات کا انبار لگا کر اپنے دستور کو بالکل صحیح اور برحق ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی اور علمائے حق کے خلاف اس محاذ پر سرگرمیاں دکھاتی رہی لیکن آخر ہوا وہی جو حضرت مدنیؒ نے اپنی خداداد بصیرت کی بنا پر سالہا سال پہلے حقانی فیصلہ صادر فرمادیا تھا۔ چنانچہ مودودی صاحب نے ۱۹۶۵ء کے ''ترجمان القرآن'' میں ''خلافت سے ملوکیت تک'' کے عنوان سے قسط وار مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا جس کو بعد میں ''خلافت وملوکیت'' کے نام سے ایک مستقل کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا۔ اس کتاب کو مودودی جماعت نے مودودی صاحب کا ایک بے نظیر تاریخی اور تحقیقی شاہکار قرار دیا ہے لیکن علمائے حق اور اصحاب تحقیق کی نظر میں یہ کتاب اصحاب و

خلفائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیتوں کو مجروح کرنے والی اور فتنہ سبائیت کو ہوا دینے والی ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کی بنا پر بعض وہ علماء بھی مودودی صاحب کے خلاف ہوگئے جو پہلے ان سے کچھ حسن ظن رکھتے تھے یا ان کی تردید ضروری نہیں سمجھتے تھے مثلاً مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی شیخ الحدیث ٹنڈو الہ یار سندھ، مولانا موصوف نے ''خلافت وملوکیت'' کے بعض مندرجات کے جواب میں ایک رسالہ تصنیف فرمایا جو ''براءت عثمان'' کے نام سے شائع ہوا، اس میں تنقید کے مسئلہ میں تحریر فرمایا کہ:

''یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی بھی تنقید سے بالا نہیں ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر کس و ناکس کو ہر شخص پر تنقید کا حق حاصل ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ ادنیٰ پر تنقید کرسکتا ہے یا اپنے مساوی پر۔ ادنیٰ کو اعلیٰ پر، جاہل کو عالم پر، غیر مجتہد کو مجتہد پر، غیر صحابی کو صحابی پر تنقید کا حق نہیں''۔

(براءتِ عثمان ص ۱۳)

اس کے بعد مولانا سید نور الحسن شاہ صاحب بخاری (سربراہ تنظیم اہل سنت) نے ''خلافت وملوکیت'' کی تردید میں ایک ضخیم کتاب ''عادلانہ دفاع'' دو جلدوں میں شائع کی ہے۔ جس میں مودودی استدلالات کا اچھی طرح پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ نیز ایک مضمون ''تجدید سبائیت'' کے نام سے ترجمان اسلام لاہور میں بالاقساط شائع ہوا ہے۔ جو مولانا محمد اسحاق[1] صاحب شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنو نے تحریر فرمایا ہے۔ جس میں مودودی صاحب کی شیعیت کو بے نقاب کیا گیا ہے اس کا پہلا حصہ کتابی شکل میں شائع ہوچکا ہے۔ چونکہ مذکورہ تینوں کتابیں ''خلافت وملوکیت'' کی نقاب کشائی اور مودودی نظریات کی تردید میں کافی ہیں۔ اس لئے اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ کے بجائے یہاں بطور نمونہ وہ عبارات پیش کی جاتی ہیں جن میں بعض صحابہ کرام کی صریح توہین پائی جاتی ہے۔

---

(۱) مگر اب حضرت مولانا موصوف دار العلوم اسلامیہ نیوٹاؤن میں استاد ہیں۔

توہین آمیز عبارات

حضرت معاویہؓ کے خلاف:

تمام اہل حق یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ حضور ﷺ کے سالے اور کاتب وحی بھی ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہؓ سے مصالحت کرکے آپ کی خلافت تسلیم کرلی اور حضرت امام حسینؓ نے ۲۰-۱۹ سال حضرت معاویہؓ کی خلافت کے تحت گزارے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کے لئے یہ دعاء فرمائی تھی کہ اللھم اجعلہ ھادیاً و مھدیاً (مشکوٰۃ شریف) ''اے اللہ معاویہ کو ہدایت دینے والا اور ہدایت پانے والا بنادے''

جمیع اہل السنّت کے نزدیک ''الصحابۃ کلھم عدول'' (صحابہ سب عادل ہیں) کے ضابطہ کے تحت حضرت معاویہؓ رضی اللہ عنہ بھی ایک عادل شخصیت ہیں اور ارشاد رسالت مآب اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے) کی روشنی میں حضرت معاویہؓ بھی ہدایت کا ایک روشن ستارہ ہیں۔ سوائے روافض اور دشمنان صحابہ کے۔ کوئی بھی حضرت معاویہؓ پر سب وشتم جرح وطعن جائز قرار نہیں دیتا۔ لیکن مودودی صاحب نے تنقید کے نام سے جس طرح اس مقبول صحابی کے خلاف اپنے قلبی بغض کا اظہار کیا ہے وہ حسب ذیل عبارات میں ظاہر ہے:

۱۔ ''مال غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی'' الخ (خلافت وملوکیت ص ۱۷۴)

۲۔ ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علیؓ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبر رسول پر عین روضہ

نبوی کے سامنے حضور ﷺ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا۔ اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا'' الخ (ایضاً ص ۱۷۴)۔

۳۔ زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی، زیاد طائف کی ایک لونڈی سمیہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت میں حضرت معاویہؓ کے والد جناب ابوسفیانؓ نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور اسی سے وہ حاملہ ہوئی۔ حضرت ابوسفیانؓ نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زیاد انہی کے نطفہ سے ہے۔ جوان ہو کر یہ شخص اعلیٰ درجہ کا مدبر، منتظم، فوجی لیڈر اور غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ثابت ہوا۔ حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں وہ آپ کا زبردست حامی تھا۔ اور اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں۔ ان کے بعد حضرت معاویہؓ نے اس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زنا کاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد انہی کا ولد الحرام ہے۔ پھر اسی بنا پر اسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے وہ ظاہر ہی ہے۔ مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا'' الخ (ایضاً ص ۱۷۵)

۴۔ جنگ صفین کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

''اس جنگ کے دوران میں ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا جس نے نص صریح سے یہ بات کھول دی کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر

کون؟ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمار بن یاسرؓ جو حضرت علیؓ کی فوج میں شامل تھے حضرت معاویہؓ کی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حضرت عمارؓ کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صحابہ میں مشہور و معروف تھا اور بہت سے صحابیوں نے اس کو حضورؐ کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ تقتلک الفئة الباغیة (تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا) مسند احمد۔ بخاری۔ مسلم۔ ترمذی۔ نسائی الخ''

(خلافت وملوکیت ص ۱۳۶)

مندرجہ بالا عبارتوں میں مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے متعلق صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ وہ سیاسی اغراض کے لیے کتاب و سنت کے صریح احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ انہوں نے زیاد کو اپنا بھائی بنانے کے لئے نعوذ باللہ اپنے والد حضرت ابوسفیانؓ صحابی کی زنا کاری پر بھی شہادتیں لیں اور وہ خود اپنے گورنروں سمیت خطبہ جمعہ میں منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت علیؓ کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ اور حضرت معاویہؓ اور ان کا گروہ باطل پر تھا وغیرہ۔ یہاں جناب مفتی محمد یوسف صاحب سے میرا یہ سوال ہے کہ کیا آپ کے نزدیک یہی وہ پاک تنقید ہے جو صحابہ پر آپ جائز قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں کوئی توہین نہیں پائی جاتی؟ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ جو شخص کچھ بھی عقل و انصاف رکھتا ہو وہ ان عبارتوں کو صریح توہین ہی قرار دے گا۔ اور ایسا لکھنے والے کو وہ حضرت معاویہؓ کا بدترین دشمن سمجھے گا۔ جو کردار مودودی صاحب نے یہاں حضرت معاویہؓ کی طرف منسوب کیا ہے یہ تو ایک فاسق و فاجر شخص کا کردار ہے۔ اس کو تسلیم کر لینے کے بعد حضرت معاویہؓ کو ایک صحابی رسول اور عادل شخص ماننا بالکل بے معنی رہ جاتا ہے، حضرت معاویہؓ اور ان کے گروہ کو جو مودودی صاحب نے صراحتاً اہل باطل قرار دیا ہے۔ یہ بھی اہل حق کے مسلک کے خلاف ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام کا باہمی اختلاف اجتہادی ہے جو حق و باطل کے بجائے صواب و خطا کا اختلاف ہے۔ جس میں خطا کرنے والے مجتہد کو بھی حسب حدیث شریف ایک اجر ملتا ہے۔

''حضرت معاویہؓ اور اکابرین امت''

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تصریح:

صحابہ کرام کے اختلاف کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:

(ا) ''اختلافے کہ درمیان اصحاب پیغمبر علیہ وعلیہم الصلوۃ والتسلیمات واقع شدنہ از ہوائے نفسانی بود چہ نفوس شریفہ ایشاں تزکیہ یافتہ بودند واز امارگی باطمینان رسیدہ ہوائے ایشاں تابع شریعت شدہ بود بلکہ آں اختلاف مبنی بر اجتہاد بود واعلاء حق۔ پس مخطی ایشاں نیز درجہ واحدہ دارد عنداللہ ومصیب را خود دو درجہ است پس زبان را از جفائی ایشاں باز باید داشت وہمہ را بہ نیکی یاد باید کرد'' الخ۔ (مکتوبات جلد اول مکتوب ۸۰)

''یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں جو اختلاف واقع ہوا وہ خواہش نفسانی کی وجہ سے نہ تھا۔ کیونکہ ان کے شریف نفس پاک ہو چکے تھے۔ اور امارہ کے بجائے مطمئنہ ہو چکے تھے۔ ان کی خواہش شریعت کے تابع ہو چکی تھی۔ بلکہ ان کا باہمی اختلاف اجتہاد اور کلمہ حق کے بلند کرنے پر مبنی تھا۔ پس ان میں سے خطا کرنے والے کو اللہ کے ہاں ایک درجہ اور صواب پر پہنچنے والے کو دو درجے ملیں گے۔ پس زبان کو ان پر طعن کرنے سے روکنا چاہیے اور سب کو نیکی کے ساتھ یاد کرنا چاہیے''۔ الخ

(ب) ''ہیچ ولی بمرتبہ صحابہ نرسد۔ اویس قرنی باآں رفعت شاں کہ بشرف صحبت خیر البشر علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والتسلیم نرسیدہ بمرتبہ ادنیٰ صحابی نرسد۔ شخصے از عبداللہ بن المبارک رضی اللہ تعالیٰ عنہ پرسید۔ ایھما افضل معاویۃؓ ام عمر بن عبدالعزیز در جواب فرمود الغبار الذی دخل انف

فرس معاویۃ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر من عمر بن عبدالعزیز''۔ (مکتوبات ج ا مکتوب نمبر ۲۰۷)

''کوئی ولی صحابہ کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت اویس قرنی باوجود بلند مرتبہ کے چونکہ حضور خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے محروم رہے اس لیے کسی ادنیٰ صحابی کے رتبہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ حضرت معاویہؓ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیز؟ تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار پڑا ہے وہ بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بدرجہا افضل ہے'' الخ

سیدنا شیخ عبدالقادرؒ جیلانی کا ارشاد:

غوث الاعظم حضرت سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی مصالحت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا کہ میرا یہ فرزند سردار ہے۔ ان کے وسیلہ سے خداوند تعالیٰ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح اور اتفاق کی بنیاد ڈالے گا۔ اس لئے حضرت معاویہؓ کو جو خلافت پہنچی تھی وہ حضرت حسنؓ کے سپرد کردینے سے پہنچی تھی۔ اور جس سال میں یہ خلافت مقرر ہوئی تھی اس کا نام سال جماعت رکھا گیا تھا۔ کیونکہ اس میں سب لوگوں کے درمیان اتفاق ہوگیا تھا۔ اور مخالفت درمیان سے اٹھ گئی تھی۔ اور سب نے اتفاق سے حضرت معاویہؓ کی فرمانبرداری قبول کی اور اس موقعہ پر یہ دونوں فریق ہی خلافت کے دعویدار تھے۔ کوئی تیسرا فریق موجود نہ تھا کہ وہ مخالفت کرتا اور جو دونوں گروہ حاضر تھے ان میں آپس میں صلح ہوگئی تھی۔ اور حضرت

معاویہؓ کا خلیفہ ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول سے بھی ثابت ہے۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اسلام کی چکی پینتیس یا چھتیس یا سینتیس برس تک چلتی رہے گی۔ اور یہاں چکی سے مطلب اسلام کی قوت اور تقویت کا ہونا مقصود ہے اور تیس سال سے جو پانچ برس زائد بیان ہوئے ہیں اس سے حضرت معاویہؓ کا زمانہ مراد ہے۔ کیونکہ جب چاروں اصحابوں کی خلافت کا زمانہ گذر گیا جو تیس سال تک رہا تو اس کے بعد حضرت معاویہؓ کی خلافت قائم ہوئی تھی اور حضرت معاویہؓ نے (۱۹) انیس سال تک خلافت کی ہے"۔ (غنیۃ الطالبین مترجم ص ۱۱۹)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

تنبیہ سوم" باید دانست کہ معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ یکے از اصحاب آنحضرت بود صلی اللہ علیہ وسلم وصاحب فضیلت جلیلہ درزمرہ صحابہ رضوان اللہ علیہم زنہار درحق اوسوء ظن نکنی ودرورطۂ سب او نہ افتی تا مرتکب حرام نشوی۔"

(ازالۃ الخفاء مقصد اول فصل پنجم بیان فتن)

تیسری تنبیہ" جاننا چاہیے کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ صحابی تھے اور صحابہ کی جماعت میں بڑی فضیلت رکھتے تھے۔ خبردار تم کبھی ان کے حق میں بدگمانی نہ کرنا اور ان کی بدگوئی میں مبتلا نہ ہونا۔ ورنہ تم حرام کے مرتکب ہوگے"۔

مولانا عبدالشکورؒ لکھنوی:

امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ فرماتے ہیں:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں سوء ظن رکھنے والے تین گروہ

ہیں۔ اول روافض، خیر ان کا سوء ظن چنداں حال تعجب نہیں کیونکہ وہ ایسے مقدس حضرات سے سوء ظن رکھتے ہیں جن کا مثل تمام امت مرحومہ میں ایک بھی نہیں۔ دوسرا گروہ ان جاہل صوفیوں کا ہے جو حضرت علیؓ مرتضی کی محبت کا تکملہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بدگوئی کو سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے کو سنی کہتے ہیں مگر درحقیقت نہ صرف اس امر میں بلکہ بہت سے امور اصول وفروع میں اہل سنت کے مخالف ہیں اور فرقہائے شیعہ میں داخل ہیں۔ تیسرا گروہ اس زمانے کے بعض اہل ظاہر کا ہے۔ بعض روایات میں حضرت معاویہؓ کے مطاعن ان کی نظر سے گذرے اور بوجہ ظاہریت کے ان کی تاویل تک ان کے ذہن کی رسائی نہ ہوئی۔ ان سب میں زیادہ مضرت رساں دوسرا گروہ ہے۔ پھر تیسرا" واللہ اعلم۔

(حاشیہ ازالۃ الخفاء مترجم اردو ص ۵۷۱)

ہم نے بطور نمونہ بعض اکابر امت کے ارشادات یہاں نقل کردیئے ہیں ورنہ تمام اہل السنّت والجماعت کا حضرت معاویہؓ اور اختلافات صحابہ کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔

حضرت معاویہؓ کے باغی ہونے کا مطلب:

حضرت معاویہؓ کی شخصیت کی بحث: میں مودودی صاحبان جب کتاب وسنت کے دلائل سے عاجز آجاتے ہیں تو ان کتابوں کے حوالجات پیش کرتے ہیں جن میں حضرت معاویہؓ اور آپ کے گروہ کے متعلق باغی کا لفظ لکھا ہے۔ حتیٰ کہ خود مودودی صاحب نے بھی "خلافت وملوکیت" میں اس قسم کے حوالجات پیش کئے ہیں۔

الجواب (ا):

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بحث خلافت میں خلیفہ سے بغاوت کرنے کی تیسری صورت میں لکھتے ہیں کہ:

"تیسری صورت خلیفہ سے بغاوت کرنے کی یہ ہے کہ دین قائم کرنے کی غرض سے لوگ بغاوت کریں اور خلیفہ کی حقیقت اور اس کے احکام (کے

وجوب اطاعت ہونے) میں شبہ بیان کریں۔ پس اگر (باغیوں کی) یہ تاویل قطعی البطلان ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں جیسے حضرتِ صدیق اکبرؓ رضی اللہ عنہ کے عہد میں مرتدوں کی اور زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں کی تاویل (نا قابل اعتبار تھی) اور تاویل کے قطعی البطلان ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ تاویل نص قرآن یا سنت مشہورہ یا اجماع یا قیاس جلی کے مخالف ہو، اور اگر وہ تاویل قطعی البطلان نہ ہو بلکہ مجتہد فیہ ہو تو وہ گروہ باغی تو ضرور ہوگا۔ مگر قرن اوّل میں ایسے گروہ کا حکم وہی ہے جو مجتہد مخطی کا ہوتا ہے۔ اگر وہ گروہ خطا کرے تو اس کے لئے ایک اجر ہے لیکن جبکہ (خلیفہ وقت سے) بغاوت کرنے کی ممانعت کی حدیثیں جو صحیح مسلم وغیرہ میں مستفیض ہیں شائع ہوگئیں اور امت کا اجماع اس پر منعقد ہوگیا تو اب (اگر کوئی بغاوت کرے تو اس باغی کے عاصی ہونے کا حکم ہم دیتے ہیں)۔"

(ازالۃ الخفاء مقصد اول ص ۳۲) "ترجمہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ"

حاشیہ میں مولانا عبدالشکور صاحبؒ لکھنوی تحریر فرماتے ہیں کہ مجتہد فیہ ہر اس
ز کو کہتے ہیں جس کی بابت کوئی حکم صریح کتاب وسنت میں نہ ہو۔

لاصہ مطلب:

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر
دیقؓ کی خلافت میں مرتدین اور منکرین زکوۃ نے جو بغاوت و مخالفت کی تھی اس کا
بار نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ان کی تاویل قطعی طور پر باطل تھی۔ لیکن بعد میں حضرت علی رضی
عنہ کی خلافت میں حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ نے جو مخالفت کی اس کو صورۃً
وت کہا جائے گا لیکن حقیقتاً وہ بغاوت نہیں کیونکہ ان کے پاس تاویل تھی اور یہ اختلاف
تہادی تھا جس کی بنا پر باغی گروہ کو بھی اسی طرح ایک اجر ملے گا جس طرح خطا کرنے

والے مجتہد کو بھی ایک اجر ملتا ہے۔ یہ ہے حقیقت لفظ باغی کی جو بعض اکابر کی عبارات میں مستعمل ہے۔

(ب) خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طرز عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے باغی ہونے کا وہی حکم تھا جو مجتہد مخطی (خطا کرنے والے) کا ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں فریقین کی طرف سے ایک ایک حکم ثالث مقرر کرنے کی تجویز قبول کر لی تھی جس کی بنا پر حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمرو بن العاصؓ ثالث مقرر کئے گئے تھے۔ اگر حضرت معاویہؓ اس معنی میں باغی ہوتے جس معنی میں مودودی گروہ منوانا چاہتا ہے یعنی بالکل باطل پر ہوتے تو حضرت علیؓ کے لئے حکمین کی تجویز قبول کرنا ناجائز تھا۔ کیونکہ قرآن مجید میں باغی گروہ کے متعلق صریح حکم ہے: وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما فان بغت احداهما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتیٰ تفیء الی امر الله ○ ("اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے کے خلاف بغاوت کرے تو باغی گروہ کے ساتھ قتال کرو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے امر کی طرف لوٹے) تو اس میں باغی گروہ کے ساتھ آخر تک لڑنے کا حکم ہے جب تک کہ وہ بغاوت سے باز نہ آئے۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہؓ کو مساوی درجہ دے کر اپنا معاملہ ثالثوں کے سپرد کر دیا اور لطف یہ ہے کہ ہر دو ثالثوں نے اپنے فیصلہ میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو معزول کر دیا تھا۔ حالانکہ اگر حضرت علیؓ کو قطعاً حق پر سمجھا جاتا اور حضرت معاویہؓ کو باطل پر تو پھر خلیفہ حق کو معزول کرنا کیونکر جائز ہو سکتا تھا۔ اور یہ سوائے مودودی صاحب کے اور دشمنانِ صحابہ کے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ صحابہ کے دونوں گروہوں نے اپنے میں سے جن دو جلیل القدر صحابہ یعنی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کو حکم تسلیم کیا تھا وہ احکام شریعت کو نہیں سمجھتے تھے یا دیدہ ودانستہ انہوں نے شریعت کی مخالفت کی۔ پس ثالثوں کے تقرر سے ثابت

ہوگیا کہ حضرت معاویہؓ کا حضرت علیؓ سے اختلاف ونزاع حجت شرعی کی بنا پر اجتہادی تھا۔ اور گو اس اجتہاد میں حضرت معاویہؓ سے خطا ہوئی لیکن اس پر بھی حسبِ ارشاد نبوی آپ کو ایک اجر مل جائے گا۔ خواہ مودودی صاحبان اس کو مانیں یا نہ مانیں۔ واللہ الہادی۔

نص صریح کا مغالطہ:

مندرجہ بالا تحقیق سے واضح ہوگیا کہ حضرت عمارؓ بن یاسر کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد تقتلک الفئة الباغية (تجھے باغی گروہ قتل کرے گا) کو حضرت معاویہؓ اور ان کے گروہ کے بارے میں نص صریح قرار دینا بالکل غلط اور نرا مغالطہ ہے کیونکہ اگر حضرت علیؓ بھی اس ارشاد کو نص صریح سمجھتے تو پھر حضرت معاویہؓ اور اپنے مابین حکمین (ثالثوں) کا تقرر تسلیم نہ کرتے اور اس وقت تک جنگ کرتے رہتے جب تک حضرت معاویہؓ سپر نہ ڈال دیتے اور نہ ہی کوئی صحابی نص صریح کے باوجود حضرت معاویہؓ کا حامی اور طرفدار رہتا۔ اذ ليس فليس.

مفتی صاحب کا فتویٰ:

مفتی محمد یوسف صاحب خود لکھ چکے ہیں کہ:

''اگر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے اہل علم حضرات تنقید سے یہاں تنقیص اور توہین مراد لیتے یا تنقید عیب جوئی اور عیب چینی کے معنی میں لیتے تو ہم صاف طور پر ان کے اس عقیدے کو گمراہی اور نظریہ کو باطل بلکہ زندقہ قرار دیتے۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ میں اس معنی میں تنقید کو اہل السنّت والجماعت نے گمراہی اور زندقہ قرار دیا ہے''۔ (علمی جائزہ ص ۲۹۶)

ہم عرض کرتے ہیں کہ جو عبارتیں مودودی صاحب کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق اوپر درج کی گئی ہیں ان میں یقیناً عیب جوئی، عیب چینی اور صریح تنقیص توہین پائی جاتی ہے۔ تو کیا مفتی صاحب اپنے اس فتویٰ پر قائم رہتے ہوئے مذکو

عبارتوں کو گمراہی اور زندقہ اور لکھنے والے کو گمراہ اور زندیق قرار دینے کے لئے آمادہ ہیں؟ یا یہ فتویٰ ''ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور'' کا مصداق ہے۔

علمائے ثلٰثہ اور مودودی:

مولوی محمد چراغ صاحب (گوجرانوالہ) مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل (لائل پور) اور مفتی محمد یوسف صاحب مؤلف علمی جائزہ یہ تینوں علماء اکابر دیوبند کے تلامذہ میں سے ہیں۔ مولوی محمد چراغ صاحب نے علامہ انور شاہ صاحب سے، مفتی سیاح الدین صاحب نے شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے اور مفتی محمد یوسف صاحب نے مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ سے دورۂ حدیث پڑھا ہے اور یہ مذکورہ تینوں علماء اپنے آپ کو مسلکاً دیوبندی کہتے ہیں، گو یہ علماء اکابر علمائے دیوبند میں کبھی بھی شمار نہیں کئے گئے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کا طویل حصہ تعلیم و تدریس میں گزارا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ اکابر دیوبند تو مودودی صاحب اور ان کی جماعت کو ایک عظیم فتنہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے برعکس یہ تینوں علماء مودودی صاحب کو اس دور کا عظیم محقق، مفکر اسلام اور داعی حق سمجھتے ہیں۔ اور مودودیت کی تائید میں خوب سرگرم عمل ہیں۔ حتیٰ کہ مودودیت کے سایہ میں اتحاد العلماء کے نام سے تحریک مودودیت کی تقویت کے لئے ایک پارٹی کھڑی کی ہے جس کا شاندار کردار یہ ہے کہ مودودی جماعت کے نمائندہ ہفت روزہ ایشیا لاہور کے اتحاد العلماء نمبر مجریہ ۷ جولائی ۱۹۶۸ء میں اتحاد العلماء کے تحت ضلع وار جن علماء کی فہرست درج کی گئی ہے، اس میں بیسویں ان علماء کرام کے نام بھی لکھے ہیں جو اس اتحاد العلماء میں شامل نہیں۔ بلکہ اس تنظیم کے مخالف ہیں۔ چنانچہ ترجمان اسلام لاہور میں ایسے علماء کرام کے تردیدی بیانات شائع ہو چکے ہیں مثلاً ضلع راولپنڈی کے بارہ علماء اور ضلع مردان کے تقریباً ۳۵ علماء اور ضلع گوجرانوالہ کے بھی بعض علماء نے مودودی جماعت اور اس کی پروردہ اتحاد العلماء سے لاتعلقی اور بے زاری کا

اعلان کردیا ہے۔ یہ ہے اس اتحاد العلماء کے دجل وفریب کا حال جس کے صدر مولوی چراغ صاحب آف گوجرانوالہ ہیں۔ ع "بہ بیں کہ از کہ بریدی و باکہ پیوستی"

بہر حال یہاں دوسرے مباحث کو نظر انداز کرتے ہوئے ان تینوں اتحادیوں سے ہمارا یہ سوال ہے کہ مودودی صاحب کی کتاب "خلافت وملوکیت" کی جو عبارتیں گذشتہ صفحات میں درج کی گئی ہیں کیا ان میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کی صراحتاً توہین وتفسیق نہیں پائی جاتی؟ کیا آپ کے امیر وامام کی یہ عبارتیں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب ذیل ارشادات کے خلاف نہیں ہیں، جو صحابہ کرام کے حق میں وارد ہیں۔

۱۔ اکرموا اصحابی (میرے اصحاب کا اکرام کرنا)

۲۔ اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اهتدیتم (میرے اصحاب مثل ستاروں کے ہیں۔ ان میں سے جس کی پیروی کروگے ہدایت پاؤگے)

۳۔ الله الله فی اصحابی لا تتخذوهم غرضاً من بعدی (میرے اصحاب کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ اللہ سے ڈرتے رہنا۔ میرے بعد ان کو نشانہ (ملامت) نہ بنالینا)

اور کیا مودودی صاحب کی یہ تنقیدیں قرآن عظیم کے ارشاد خداوندی کا مقابلہ نہیں کرتیں جس میں بلا استثناء تمام اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی رضا مندی کا اعلان فرمایا گیا ہے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ (اللہ ان سے راضی ہوگیا، اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے) تو فرمائیے کیا حضرت معاویہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابہ میں شامل نہیں جن کا اکرام ہر مسلمان پر لازم ہے؟ کیا وہ ہدایت کا ستارہ نہیں ہیں جن کی پیروی میں راہ ہدایت نصیب ہوتی ہے؟ کیا وہ ان اصحاب کی فہرست میں نہیں آتے جن کو نشانہ ملامت بنانے سے حضور صلی اللہ علیہ سلم نے منع فرمایا ہے؟ اور کیا جملہ صحابہ میں سے اللہ تعالیٰ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی راضی نہیں ہوگیا؟

مندرجہ عبارات میں مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں جو لب ولہجہ اور انداز تحریر اختیار کیا ہے کیا وہ روافض کا شعار نہیں۔ کیا یہ تحریریں فتنہ رفض کو ہوا دینے والی نہیں ہیں؟ تعجب ہے کہ اگر مجاہد ملت حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی آپ کے مودودی صاحب کو منشی کہیں تو آپ اس میں اپنے امام کی توہین وتحقیر سمجھیں اور مودودی صاحب صحابہ کرام کے بارے میں اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی آپ کے مقتداء و رہنما رہیں۔

ع بریں علم و دانش بباید گریست

کیا ایسی تحریرات کے بعد بھی آپ کے لیے مودودی صاحب سے شرعاً کسی عقیدت وعظمت کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟ کیا صحابہ کرام کی اس طرح صریح توہین کرنے والا بھی آپ کے نزدیک محقق دوراں اور داعی حق قرار دیا جاسکتا ہے؟ آپ تینوں حضرات اگر تقیہ باز نہیں ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان عبارتوں میں آپ کو حضرت امیر معاویہؓ کی توہین محسوس نہیں ہوتی جو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کے بعد بالاتفاق خلیفہ برحق ہیں، اور جن کی خلافت میں امام حسینؓ نے ۱۹-۲۰ سال سالانہ وظیفہ لے کر بلا کسی مزاحمت ومخالفت کے گذارے ہیں۔ آپ کب تک اہل سنت مسلمانوں کو تلبیس میں مبتلا رکھیں گے؟ اگر آپ حق پرست ہیں تو روافض کے طور وطریق کو بالائے طاق رکھ کر صاف طور پر اپنا موقف بیان کریں۔ اگر آپ حسب عقیدہ اہل السنّت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو عادل اور متبع سنت خلیفہ برحق مانتے ہیں تو پھر بلا خوف لومۃ لائم مودودی اور اس کی تحریروں سے نفرت وبیزاری کا اعلان کریں اور اگر آپ کے دل میں وہی کچھ ہے جو مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے متعلق لکھ دیا ہے تو پھر حضرت معاویہؓ کے بارے میں شیعی نظریہ کا اعلان کردیں۔ اس گومگو کی پالیسی میں علمائے اہل السنّت آپ کا یہ جرم معاف نہیں کرسکتے اور بارگاہ خداوندی میں بھی انشاء اللہ آپ کا گریبان ہوگا اور حضرت معاویہؓ کا ہاتھ۔ فرمائیے دونوں صورتوں میں سے آپ کو کون سی

صورت منظور ہے؟

سید قطب مصری:

سید قطب مصری (جس کو غالباً ساری مودودی جماعت ایک عظیم مفکر اسلام اور داعی حق سمجھتی ہے جس کو گذشتہ سالوں میں مصری حکومت نے سزائے موت دی تھی) کی ایک عربی تصنیف "العدالة الاجتماعية فی الاسلام" کا اردو ترجمہ "اسلام کا نظام عدل" کے نام سے مودودی جماعت نے پاکستان میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں سید قطب نے خلیفہ راشد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے متعلق حسب ذیل تبصرہ کیا ہے۔

(۱) "لیکن دراصل یہ پہلا حادثہ نہ تھا اس سے بدتر واقعہ حضرت علیؓ کو مؤخر کر کے ضعیف العمری کے زمانہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خلیفہ بنایا جانا ہے جس کے نتیجہ میں سلطنت کی کنجیاں مروان بن حکم کے قبضہ میں چلی گئیں۔"

(اسلام کا نظام عدل ص ۳۳۸)

(۲) "مجھے پورا یقین ہے کہ اگر حضرت عمرؓ کا دور چند سال اور باقی رہ جاتا یا شیخین کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت علیؓ ہوتے بلکہ اگر مسند خلافت پر آتے وقت حضرت عثمانؓ کی عمر جتنی تھی اس سے بیس سال کم ہوتی تو بڑی حد تک تاریخ کا رخ بدل جاتا"۔ (ایضاً ص ۴۰۲)

قطب مصری کی مندرجہ عبارتوں سے یہی نتیجہ لازم آتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نعوذ باللہ خلافت کے اہل نہ تھے اور ان کی جگہ تیسرے نمبر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت ملنی چاہیے تھی۔ اس بناء پر ہم مذکورہ اتحادی علمائے ثلثہ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ کا بھی یہی نظریہ ہے جو قطب مصری نے حضرت عثمانؓ کے بارے میں لکھا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر آپ زمرہ اہل السنت سے یقیناً خارج ہیں اور نہ صرف حضرت عثمانؓ بلکہ حضرت علیؓ کے بھی مخالف ہیں کیونکہ حضرت فاروق اعظمؓ رضی اللہ عنہ نے اپنی وصیت

میں جن چھ جلیل القدر صحابہ کے نام خلافت کے لئے پیش فرمائے تھے۔ یعنی حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم اجمعین وہ حضرات ان عشرہ مبشرہ میں سے ہیں جن کے جنتی ہونے کی خبر من جانب اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنائی تھی۔ گویا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لئے انہی صحابہ کے نام پیش کئے جن کو خود اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرام میں سے منتخب فرمایا تھا۔ اور پھر ان چھ منتخب اصحاب میں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلافت کے لئے منتخب ہوگئے اور حضرت علیؓ سمیت اس وقت کے تمام صحابہ کرام کا حضرت عثمانؓ کی خلافت پر اجماع ہوگیا۔ تو کیا حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ کو حضرت عثمانؓ کے بڑھاپے پر نظر نہ تھی جس کو قطب مصری خلافت کی نا اہلیت کی وجہ قرار دے رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قطب مصری نہ صرف حضرت عثمانؓ بلکہ حضرت علیؓ اور دوسرے تمام جلیل القدر صحابہ کرام کا اعتماد بھی مسلمانوں کے قلوب سے زائل کرنا چاہتا ہے۔ جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تیسرا خلیفہ منتخب کیا تھا۔ اور اگر یہ تینوں اتحادی علماء سید قطب کے اس پیش کردہ نظریہ کے خلاف ہیں تو پھر ان پر لازم ہے کہ واضح طور پر اس کی تردید کر کے مودودی جماعت کے ان ارکان و متفقین کو گمراہی سے بچائیں۔ جو قطب مصری کے ان ناپاک خلاف حق نظریات سے متاثر ہوئے ہیں۔

وما علینا الا البلاغ۔

خلافت وملوکیت سے مفتی محمد یوسف صاحب کا ابتدائی تاثر

مذکورہ تینوں علماء میں سے مفتی محمد یوسف صاحب نے مودودی صاحب کی کتاب "خلافت وملوکیت" کے مضامین سے ابتداءً وہی تاثر لیا جو علماء حق نے لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان عبارتوں کو توہین صحابہ پر محمول کر کے مودودی صاحب کو اصلاحِ حال کے لئے خطوط بھی لکھے۔ اس سلسلہ میں مفتی صاحب اور مودودی صاحب کے خطوط

ماہنامہ جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک میں شائع ہوئے تھے۔ مفتی صاحب نے مودودی صاحب کے ان مضامین پر جو ''خلافت سے ملوکیت تک'' کے عنوان سے قسط وار ماہنامہ ترجمان القرآن (از مودودی) میں شائع ہوئے تھے اپنے خطوط میں جو تبصرہ کیا ہے اس کے بعض ضروری اقتباسات ہم یہاں درج کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام پر حقیقتِ حال پوری طرح منکشف ہوجائے۔

مفتی صاحب اپنے خط میں مودودی صاحب کو لکھتے ہیں کہ:

(۱) یہ بات ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری امت کے درمیان دین کے صحیح تصور کے بارے میں اگر کوئی قابل اعتماد واسطہ ہے تو وہ صرف صحابہ کرامؓ کی برگزیدہ اور مقدس جماعت ہے۔ اہل السنّت والجماعت کے مابین اس بارے میں دو رائیں نہیں ہیں کہ "الصحابة کلهم عدول" ان کی صفت عدل اور دینی تقدس کی بنیاد پر علم کلام والوں نے یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے ویکف عن ذکر الصحابة الا بخیر اھ (یعنی صحابہ کا ذکر صرف خیر و بھلائی کے ساتھ ہی کرنا چاہیے) مگر یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آپ کے اس مضمون کے آخری حصے کے مطالعہ سے ایک قاری کے ذہن میں بعض صحابہ کرام کے متعلق جو تصور قائم ہوجاتا ہے وہ انتہائی غلط بلکہ بہت برا تصور ہے جو یقینی طور پر اس اعتقاد کو متزلزل کردیتا ہے جو دین کے بارے میں پوری اُمت کو حضرات صحابہ کرام کی ذوات قدسیہ پر حاصل ہے۔ خاص کر مضمون کے بعض حصوں میں ان کی سیرت وکردار کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس سے ان لوگوں کے اذہان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو صحابہ کرام کے متعلق انتہائی پاکیزہ بلکہ معصومانہ تصور رکھتے ہیں اس کے لئے ذیل کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔ پانچویں مرحلہ کے تحت آپ لکھتے ہیں کہ:

''حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے نام اپنے ایک پیغامبر کے ذریعہ بے خط لفافہ بھیجا۔ جب قاصد سے حضرت علیؓ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا معاملہ ہے تو اس نے کہا

میرے پیچھے دمشق میں ۶۰ ہزار آدمی خون عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لئے بے تاب ہیں۔ حضرت علیؓ نے پوچھا کس سے بدلہ لینا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا آپ کی رگ گردن سے۔ اس سوال وجواب کے بارے میں آپ کا تاثر یہ ہے:

(۱) ''اس کے صاف معنی یہ تھے کہ شام کے گورنر کے پیش نظر قاتلین عثمانؓ سے نہیں بلکہ خلیفہ وقت سے خون عثمان کا بدلہ لینا ہے''۔

اس سے حضرت معاویہؓ کے متعلق بجز اس کے اور کیا تصور قائم کیا جائے گا کہ اس نے حضرت علیؓ کو قتلِ عثمانؓ کا مرتکب قرار دے کر ایک بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا جو اسلامی شریعت میں بہتان کے نام سے مشہور ہے۔ . . . . . اس واقعہ سے ایک طرف معاذ اللہ حضرت معاویہؓ کے متعلق یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ وہ بڑے بہتان تراش تھے . . . . اور دوسری طرف یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ وہ نعوذ باللہ انتہائی سازشی تھے...... پھر آخری مرحلہ کے تحت ص ۳۳۹ پر اہل مکہ کے ساتھ حضرت حسینؓ، ابن زبیرؓ، ابن عمرؓ اور عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکر کے بارے میں حضرت معاویہؓ کی جو گفتگو نقل کی گئی ہے جس میں یزید کے لئے بیعت لینے کا ذکر ہے وہ تو اس قدر صریح جھوٹ اور فریب پر مشتمل ہے جس کا ارتکاب ایک ادنیٰ درجے کا شریف آدمی بھی نہیں کرسکتا چہ جائیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جلیل القدر صحابی اس میں اپنے آپ کو ملوث کردے اور وہ بھی صرف اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لئے'' (ماہنامہ جامعہ اسلامیہ ص ۳۰۔۳۱ ستمبر اکتوبر، ۱۹۶۵ء) (مفتی صاحب کا پہلا خط بنام مودودی صاحب)

(۲) اسی طرح تحکیم کے معاملہ میں بھی حضرت عمرو بن العاصؓ کا جو طرز عمل پیش کیا گیا ہے اس سے بھی عمرو بن العاصؓ کے متعلق ذہن میں یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے امیر کی طرح معاذ اللہ بڑے دھوکا باز، چالاک اور حد درجہ کے سازشی آدمی تھے۔ نیز مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف یزید کی ولی عہدی کے متعلق جو تجویز منسوب کی گئی ہے اس سے بھی حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں یہ گندہ تصور ذہن میں قائم ہوجاتا ہے کہ وہ

معاذ اللہ انتہائی جاہ پسند، لالچی اور مفاد پرست آدمی تھے۔ کیا یہی وہ پاکیزہ تصورات ہیں جو امت کو صحابہ کرام کے بارے میں حاصل ہونے چاہئیں؟ ...... یہی اس مضمون کا وہ مضر پہلو ہے جس کے زہریلے اثرات سے دور حاضر کے مسلمان ذہنوں کو محفوظ رکھنا بڑا دشوار ہے الخ (ص۳۲)

(۳) تاریخ کو ہرگز یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ اس کی شہادت سے کتاب وسنت کے مسلّمات کے خلاف استدلال فراہم کیا جائے۔ خاص کر جبکہ واقعات کی ترتیب اور مواد فراہم کرنے میں مؤرخین کے درمیان حد درجہ اختلاف پایا جاتا ہو۔ اور اتفاق ان کے درمیان عنقاء کی طرح مفقود ہو . . . . شاید یہی وجہ ہے کہ اہل السنّت والجماعت نے تاریخ کی شہادت پر اعتماد نہ کرتے ہوئے صحابہ کرام کے باہمی مشاجرات کے متعلق مکمل خاموشی کو اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ اور ایک عقیدے کی حیثیت سے انہوں نے یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ یکف عن ذکر الصحابة الا بخیر اھ. اس بارے میں اکابرین امت کی چند تصریحات پیش کی جاتی ہیں۔

ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں الخ ص۳۳۔

(۴) آپ چونکہ ایک مؤرخ کی بجائے داعی حق کا بلند ترین مقام رکھتے ہیں اور ایک عظیم اسلامی تحریک کے ایک نامور قائد ہیں اور دین کے لئے اپنی خدمات اور مجاہدانہ سرگرمیوں کی بدولت پورے عالم اسلام میں ممتاز مذہبی پوزیشن رکھتے ہیں . . . ایسے حالات میں بہت ممکن ہے کہ پورے عالم اسلام کو صحابہ کرام کے متعلق جو دین کے بارے میں حسن عقیدت اور حسن اعتماد حاصل ہے وہ آپ کے اس مضمون کے مطالعہ سے یکسر بدل جائے اور پورے نظام دین کے بارے میں وہ شک اور تذبذب میں مبتلا ہو جائے۔ بالخصوص آج کے پرفتن دور میں۔ پھر کیوں نہ ایسے خطرات کے پیش نظر مشاجرات صحابہ کی اشاعت کو ملتوی رکھا جائے۔" (ص۳۴)

تنقید بمعنی عیب جوئی:

مفتی صاحب موصوف اسی خط میں مودودی صاحب کو لکھتے ہیں:

(۵) دستور جماعت کی دفعہ ۶ کی رو سے انبیاء علیہم السلام کے سوا صحابہ کرام پر جس تنقید کو جائز قرار دیا گیا ہے اس کے متعلق آپ اور جماعت کے دوسرے تمام ذمہ دار حضرات آج تک یہ توضیح کرتے چلے آئے ہیں کہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ ان کے اجتہادی اقوال اور فتوؤں کو کتاب وسنت کے معیار حق پر جانچا اور پرکھا جائے گا... رہی تنقید بمعنی تنقیص وعیب جوئی کے تو اس کے متعلق آپ سب کی تصریحات یہ ہیں کہ وہ کسی صحابی پر جائز نہیں بلکہ سب پر بلا استثناء حرام ہے لیکن متعلقہ مضمون میں ان کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس سے صاف طور پر واضح ہے کہ آپ ان پر تنقید بمعنی تنقیص و عیب جوئی بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ اس سے بچنے کے لئے آپ کا یہ ارشاد کہ حضرت معاویہؓ کے محامد و مناقب اپنی جگہ پر ہیں، ان کا شرف صحابیت بھی واجب الاحترام ہے لیکن ان کے غلط کام کو تو غلط کہنا ہی ہوگا، اسے صحیح کہنے کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم اپنے صحیح وغلط کے معیار کو خطرے میں ڈال رہے ہیں" قابل اطمینان اس لئے نہیں کہ مضمون میں ان کے غلط کام کو غلط ہی صرف نہیں کہا گیا ہے بلکہ ان کے عیوب ونقائص بھی ظاہر کئے گئے ہیں اور یہ ان پر ایک ایسی تنقید ہے جس کے معنی تنقیص اور عیب جوئی کے سوا دوسرے نہیں ہو سکتے، اس کو بھی اگر عیب جوئی نہ کہا جائے تو نہ معلوم پھر کس قسم کی تنقید کو تنقیص اور عیب جوئی کہا جائے گا۔ (ص۳۵ مورخہ ۴ ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ)

(۶) دوسرے جوابی خط میں مفتی محمد یوسف صاحب مودودی صاحب کو لکھتے ہیں:

"مجھے آپ کی اس رائے سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ "الصحابة کلھم عدول" کا مطلب صرف یہ ہے کہ صحابیوں میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے دیدہ دانستہ کوئی غلط روایت امت

تک پہنچائی ہو'' کیونکہ اس رائے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ صحابہ کرام کے لئے جو عدالت بالاتفاق تسلیم کی گئی ہے وہ صرف روایت حدیث تک آپ کے نزدیک محدود ہے۔ رہے زندگی کے دوسرے معاملات تو ان میں وہ عدل کی صفت سے متصف نہیں تھے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ دوسرے معاملات زندگی میں عدل کی صفت سے محروم اور فسق کی صفت سے متصف ہو سکتے ہیں تو روایات کے بارے میں ان پر اعتماد آخر کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ ان پر روایات کے بارے میں جو اعتماد کامل حاصل ہے وہ تو اس عدالت ہی کی بنیاد پر حاصل ہے جو ان کے لئے سارے معاملات زندگی میں مسلّم ہے اور اگر وہ دوسرے معاملات زندگی میں محظوراتِ دین کے ارتکاب سے اجتناب نہیں کرتے تو ہرگز روایت حدیث میں ان پر اعتماد حاصل نہیں ہو سکتا الخ۔ (ماہنامہ جامعہ اسلامیہ نومبر ۱۹۶۵ء)

خلاصہ کلام:

مودودی صاحب کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' کے مضامین پر مفتی محمد یوسف صاحب نے جو جرح وتنقید فرمائی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ کتاب وسنت کے مسلّمات کے خلاف صحابہ کرامؓ کے بارے میں مودودی صاحب نے جو تاریخی حوالہ جات پیش کئے ہیں وہ ناقابل اعتبار اور مردود ہیں۔

۲۔ یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں مودودی صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو تاریخی حوالجات پیش کئے ہیں وہ صریح جھوٹ اور فریب پر مشتمل ہیں۔

۳۔ واقعہ تحکیم کے معاملہ میں مودودی صاحب نے جو تاریخی حوالہ پیش کیا ہے اس سے نعوذ باللہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ وہ بڑے دھوکہ باز، چالاک اور حد درجہ کے سازشی تھے۔

حالانکہ کسی صحابی کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں ہے۔

۴۔ یزید کی ولی عہدی کے متعلق مودودی صاحب نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ گندہ تصور قائم ہوتا ہے کہ معاذ اللہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ انتہائی جاہ پسند، لالچی اور مفاد پرست تھے۔

۵۔ ''خلافت وملوکیت'' میں مودودی صاحب نے صحابہ پر جو تنقید کی ہے اس میں عیب جوئی اور تنقیص پائی جاتی ہے۔

۶۔ الصحابۃ کلھم عدول کا جو مطلب مودودی صاحب نے لکھا ہے وہ غلط ہے۔

۷۔ صحابہ کرام کے بارے میں مودودی صاحب کے مضمون کے زہریلے اثرات سے دور حاضر کے مسلمان ذہنوں کو محفوظ رکھنا بڑا دشوار ہے۔

اب مفتی صاحب خود ہی از روئے انصاف بتلائیں کہ ''خلافت وملوکیت'' کے مضامین کو جس طرح آپ نے صحابہ کرام کی تنقیص وعیب جوئی پر مبنی، کتاب وسنت کے مسلمات کے خلاف اور موجودہ دور کے مسلمانوں کے لئے مضر اور زہریلے اثرات رکھنے والا قرار دیا ہے۔ یہی تو علمائے حق نے اس کتاب کے بارے میں فیصلہ فرمایا ہے۔ پھر تعجب ہے کہ باوجود اس کے آپ علمائے حق سے بدظن ہیں۔ اور مودودی صاحب کو اپنے انہیں خطوط میں ایک بلند پایہ داعی حق بھی قرار دے رہے ہیں۔ کیا صحابہ کرامؓ کی تنقیص و توہین کرنے والا اور ان کے خلاف زہریلے اثرات پھیلانے والا بھی داعی حق ہو سکتا ہے؟

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بو العجبی ست

مفتی صاحب کی قلابازی:

یہ بات بھی بہت زیادہ حیرت انگیز ہے کہ جو مفتی محمد یوسف صاحب ۱۳۸۵ھ میں مودودی صاحب کے مضامین کو مضر، زہریلے اثرات پھیلانے والے اور صحابہ کرام کی تنقیص وعیب جوئی پر مشتمل قرار دے رہے ہیں وہی مفتی صاحب دو سال کے بعد

۱۳۸۷ھ میں اپنی کتاب ''علمی جائزہ'' میں صحابہ کرامؓ کے معیار حق ہونے کی بحث میں علمائے حق کے جواب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مودودی صاحب نے تو صرف علمی تنقید کی ہے اور صحابہ کرام کی تنقیص وعیب جوئی بالکل نہیں کی۔ چنانچہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت کی پوزیشن صاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جب وہ خود تصریح کر چکے ہیں کہ تنقید سے ہماری مراد یہاں تنقیص یا توہین نہیں ہے نہ اس سے ہم عیب جوئی اور عیب چینی مراد لیتے ہیں۔ بلکہ اس سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ رسول خدا کے ماسوا تمام لوگوں کے اقوال و افعال کو خواہ صحابہ کرام ہوں یا دوسرے بزرگان دین کتاب وسنت کی شرعی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جائے گا''۔ الخ (علمی جائزہ ص ۲۹۶)

ہمارا سوال:

محترم مفتی محمد یوسف صاحب سے ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ:

(ا) ''علمی جائزہ'' والے مصنف اور ماہنامہ جامعہ اسلامیہ میں مودودی صاحب کے نام جن کے ''خلافت وملوکیت'' کے سلسلہ میں خطوط شائع ہوئے ہیں یہ دونوں کوئی جدا جدا مفتی محمد یوسف ہیں یا ایک ہی شخصیت ہیں۔

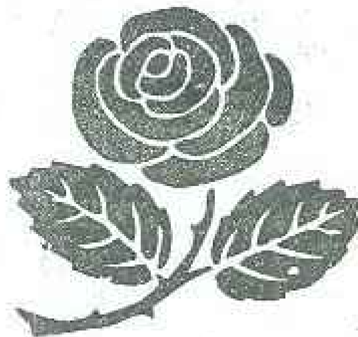
(ب) اگر ایک ہی مفتی محمد یوسف ہیں تو کیا مذکورہ خطوط کے دو سال بعد آپ نے صحابہ کرام کے بارے میں اپنا نظریہ بدل لیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ نے رجوع کا باقاعدہ اعلان کیوں نہیں فرمایا۔

(ج) اگر صحابہ کرامؓ کے بارے میں آپ سابق عقیدہ پر قائم ہی ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ''علمی جائزہ'' میں آپ نے مودودی صاحب کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' پر تنقید نہیں کی۔ اور معیار حق کی بحث میں اس کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ اور اپنے خطوط میں بیان کردہ موقف کے خلاف مودودی صاحب کی حمایت میں آپ نے دلائل پیش کئے ہیں، کیا یہ کتمان حق کسی عالم حق کا شیوہ

ہو سکتا ہے؟ کیا آپ کے نزدیک بہ نسبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اپنے امام مودودی صاحب کی شخصیت کو بے داغ ثابت کرنا ضروری ہے؟ اور دیانت و انصاف اور دینِ خداوندی کا یہی تقاضا ہے؟

مفتی صاحب! اب بھی وقت ہے کہ آپ مودودی صاحب کی ناجائز حمایت سے دست بردار ہو کر علماءِ حق کی طرح اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کی حفاظت کے لئے کتاب ''خلافت وملوکیت'' کی واضح تردید ملک وملت کے سامنے پیش کر کے اپنے رب کو راضی کر لیں۔ ورنہ . . . . مرنے کے بعد مودودی صاحب کی شفاعت آپ کے کسی کام نہیں آئے گی۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین



ضمیمہ

ابطالِ حجت

بجواب

اتمامِ حجت

مفتی محمد یوسف صاحب کی کتاب ''مولانا مودودی پر اعتراضات کا ''علمی جائزہ'' حصہ اول کے جواب میں میرا ایک مضمون بعنوان ''مفتی محمد یوسف صاحب کے جائزہ کی حقیقت'' ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کی ۲۵ قسطوں میں شائع ہوا تھا جو اب کتابی شکل میں ''علمی محاسبہ'' کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے جواب میں مفتی صاحب موصوف نے ایک مضمون ہفت روزہ ''آئین'' لاہور میں بعنوان ''یہ اتمام حجت کا آغاز ہے'' شائع کیا تھا جس کی پہلی قسط ۲۴ دسمبر ۱۹۶۸ء کو شائع ہوئی۔ لیکن ۱۱ قسطوں کے بعد اشاعت کا یہ سلسلہ انہوں نے منقطع کر دیا اور اب تک باقی قسطیں انہوں نے شائع نہیں کیں۔ ضرورتاً اس نا تمام مضمون کا جواب ''ابطال حجت'' کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ قارئین سے گذارش ہے کہ وہ دونوں مضامین کو تعصب اور پارٹی بازی سے بالاتر ہو کر محض تحقیقِ حق کے لئے مطالعہ کریں۔ انشاء اللہ ان پر حق واضح ہو جائے گا۔

وما توفیقی الا باللہ.

یہ اتمام حجت کا آغاز ہے:

مفتی محمد یوسف صاحب نے اپنے جوابی مضمون کا یہ نام تجویز کر کے اپنی علمی بلکہ مذہبی موت کا اعلان کر دیا ہے کیونکہ ان کا اپنے متعلق تو یہ زعم ہے کہ وہ دین کے اصولی مباحث میں دینی اور علمی فریضہ ادا کرتے ہوئے اپنے مخالف علماء پر اتمامِ حجت کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے ایک معصوم پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ العیاذ باللہ فریضہ رسالت میں کوتاہیاں کرنے کی وجہ سے کافر قوم پر ''اتمامِ حجت'' نہیں کر چکے تھے اور حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق اپنے اور مودودی صاحب کے اس نظریئے کی تائید میں انہوں نے ''علمی جائزہ'' کا پورا باب دوم لکھا ہے جس میں ص ۹۳ سے لے کر ص ۱۶۷ تک کتاب کے صفحات سیاہ کئے ہیں۔

یہ ہے مودودیت کا خطرناک نتیجہ کہ مفتی صاحب اتمام حجت کی اہلیت رکھتے ہیں اور حضرت یونس علیہ السلام نہیں رکھتے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور مودودی:

مودودی صاحب نے تفہیمات حصہ دوم طبع دوم ص ۴۳ پر حضرت داؤد علیہ السلام کی عصمت کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا تھا اس کو دوسرے علمائے کرام نے عموماً اور شیخ الاسلام حضرت مولانا السید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ نے خصوصاً اپنے ایک مستقل رسالہ ''مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت'' میں عصمت انبیاء کے خلاف عقیدہ قرار دیا تھا اور اس پر مفتی محمد یوسف صاحب نے ''علمی جائزہ'' میں مفصل بحث کی ہے جس کا ضروری جواب بندہ نے ''جائزہ کی حقیقت'' یعنی علمی محاسبہ میں دے دیا تھا۔ اس کے جواب میں مفتی صاحب نے اپنے خود ساختہ ''اتمام حجت'' میں پھر مفصل بحث کی ہے۔ جس کا جواب عرض کیا جارہا ہے۔ مفتی صاحب کے مضمون کی پہلی قسط میں تو صرف شکایات والزامات ہی ہیں اور دوسری قسط(۱) میں نہیں مل سکی۔ جس میں انہوں نے علمائے تفسیر کے مختلف اقوال درج کئے ہیں۔ تیسری قسط میں انہوں نے میرے تبصرے کا جواب شروع کیا ہے۔ اور مودودی صاحب کی تفہیمات کی زیر بحث عبارت کا مطلب عقیدہ اہل سنت والجماعت کے موافق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ مودودی صاحب نے حضرت داؤد علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کے متعلق لغزش کا لفظ استعمال کیا ہے اور انبیاء سے لغزش کا صدور تمام اہل سنت مانتے ہیں۔ پھر مودودی صاحب پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے

(۱) مفتی محمد یوسف صاحب نے بذریعہ خط یہ قسط طلب کی تھی لیکن انہوں نے عذر کردیا کہ میرے پاس کوئی زائد پرچہ نہیں حالانکہ ہم نے اپنے مضمون کا ہر پرچہ بالالتزام ان کی خدمت میں بھجوادیا تھا لیکن مفتی صاحب نے خود مجھے اپنے اس جواب کی اشاعت کی کوئی اطلاع ہی نہیں دی ع نگاہ اپنی اپنی ضمیر اپنا اپنا

متعلق بھی وہ ''علمی جائزہ'' ص ۸۷ میں لکھ چکے ہیں کہ:

''اس شق کے متعلق ہم مولانا مرحوم کے ساتھ اتفاق اس لئے نہیں کرسکتے کہ ان کی یہ رائے تمام اہل السنّت والجماعت کے اجماعی فیصلے کے خلاف ہے۔ ہم نے پچھلے صفحات میں مسئلہ عصمت الانبیاء کی جو مختصر تشریح کی ہے اس سے یہ بات واضح طریقہ سے معلوم ہوچکی ہے کہ تمام اہل السنّت والجماعت کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے افعال میں زلات اور لغزشیں پائی جاتی ہیں اور ان سے وہ معصوم نہیں ہیں اور زلت ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی لغزش کے سوا کوئی دوسرے نہیں ہیں۔

الجواب (۱):

مفتی محمد یوسف صاحب نے بلا سوچے سمجھے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر یہ سنگین فتویٰ لگادیا کہ:

''ان کی یہ رائے تمام اہل السنّت والجماعت کے اجماعی فیصلے کے خلاف ہے'' کیونکہ حضرت مدنیؒ نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ انبیاء کرام سے لغزش کا صدور نہیں ہوسکتا اور نہ ہی حضرت مدنیؒ نے اس بنا پر مودودی صاحب کی تردید کی ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی طرف لغزش کی نسبت کیوں کی ہے؟ کیا حضرت مدنیؒ اہل السنّت والجماعت کے اس اجماعی فیصلے کو نہیں سمجھتے تھے جن کے متعلق مفتی صاحب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ:

''یہ حقیقت ہے کہ مولانا مرحوم نہ صرف یہ کہ اپنے وقت میں علوم شریعت کے ایک ماہر محقق اور متبحر عالم تھے بلکہ اسرارِ شریعت اور علم تصوف میں بھی شیخ کامل اور مسلّم امام تھے۔ آپ کی دیانت وللّٰہیت تمام علمی اور اسلامی حلقوں میں مسلّم تھی، خشیت اور خداترسی میں، خلوص اور تقویٰ میں اپنی مثال آپ

تھے۔ اسلام کی پختہ سیرت اور مضبوط کردار کے لحاظ سے مولانا مرحوم کی شخصیت اس قابل تھی کہ اس کو دنیائے اسلام کی ممتاز ترین دینی شخصیتوں میں شمار کیا جائے۔" (علمی جائزہ ص ۷۵)

اور نہ ہی کسی دوسرے عالم دین نے اس بنا پر مودودی صاحب کی تردید کی ہے۔ بلکہ حضرت مدنیؒ کے اعتراض کا مبنیٰ مودودی صاحب کا یہ نظریہ ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی وقت اپنی حفاظت اٹھالی ہے" چنانچہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مودودی صاحب کی مندرجہ زیر بحث عبارت پیش کرنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ:

"اب فرمائیے! کہ مذکورہ بالا عقیدہ ہر نبی کے متعلق جن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل ہیں کہاں تک اصول اور عقائد اسلامیہ کے مطابق ہے جس میں ہر نبی سے عصمت اور حفاظت کا اٹھالینا اور بالارادہ ان سے لغزشیں کرادینا مانا گیا ہے، ایسی صورت میں تو کوئی نبی معیار حق نہیں رہ سکتا اور نہ کسی نبی پر ہمیشہ اعتماد ہوسکتا ہے، جو حکم بھی ہوگا اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ کہیں وہ عصمت اور حفاظت کے اٹھ جانے کے زمانہ کا نہ ہو"۔

(مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت ص ۲۷۔۲۸)

فرمائیے! اس عبارت کے بعد بھی کیا کوئی صاحبِ عقل وفہم یہ کہنے کی جسارت کرسکتا ہے کہ حضرت مدنیؒ کا اعتراض یہ ہے کہ مودودی صاحب انبیاء کرام سے لغزشوں کا صدور مانتے ہیں۔ اگر مفتی صاحب موصوف حضرت مدنیؒ کی یہ اردو عبارت بھی نہیں سمجھ سکتے تو پھر وہ عصمت انبیاء کے اصولی مسئلہ پر بحث کرنے کی اہلیت کہاں تک رکھتے ہیں۔ اور اگر وہ باوجود سمجھنے کے حضرت مدنیؒ کو مطعون کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود آخرت کی جوابدہی کا کیوں خیال نہیں رکھتے جس کا وعظ دوسروں کو سناتے رہتے ہیں۔

۲۔(ا) "اگر مودودی صاحب کی یہ تحریر اہل سنت کے اجماعی عقیدہ کے خلاف نہیں تو پھر مفتی صاحب یہ ثابت کریں کہ اہل سنت کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ ہر نبی سے اللہ تعالیٰ نے بالارادہ کسی وقت عصمت وحفاظت اٹھالی ہے۔"

(ب) اگر اہل سنت کا اجماع نہیں ثابت کرسکتے تو کسی محقق اہل سنت کا یہ قول پیش کریں کہ انبیاء سے کسی وقت عصمت اٹھالی جاتی ہے اور اگر آپ یہ بھی ثابت نہیں کرسکتے تو پھر یہ حقیقت تسلیم کرلیں کہ عصمت اٹھائے جانے کا یہ مودودی عقیدہ اصولِ اسلامیہ کے خلاف ہے۔

(ج) اگر آپ یہ تاویل کریں جیسا کہ آپ نے قسط نمبر ۳ ص ۱۳ پر لکھا ہے کہ ـــــ

"یہاں مولانا مودودی نے خود اوپر کے سوال کے جواب میں یہ وضاحت کی ہے کہ زیر بحث صرف وہ واقعات یا لغزشیں ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔ اور قرآن کریم میں جن لغزشوں کا ذکر آیا ہے وہ باتفاق علمائے امت گناہ نہیں بلکہ خلاف الاولیٰ افعال ہیں اس لئے یہ بحث انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ مولانا مودودی تو یہ تصریح کریں کہ لغزشوں سے مراد خلاف الاولیٰ امور ہیں اور آپ انہی کی عبارتوں سے قرینے تلاش کرتے پھریں کہ نہیں لغزش سے مراد گناہ ہے"۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ:

(ا) اصل زیر بحث تفہیمات کی عبارت ہے۔ اگر مودودی صاحب کے نزدیک لغزش سے عام لغزش مراد تھی جو معصیت اور گناہ نہیں تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ عصمت اٹھالینے کا مودودی نظریہ لغو ہے کیونکہ تمام اہل سنت کے نزدیک لغزش کے صدور کے باوجود انبیاء علیہم السلام کی عصمت قائم رہتی ہے۔ جب عصمت باقی رہتی ہے تو پھر عصمت اٹھائے جانے کا کیا مطلب؟

(ب) اگر آپ یہ جواب دیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک یہاں عصمت کا لغوی معنی مراد ہے نہ کہ اصطلاحی۔ تو پھر ہمارا یہ اعتراض ہے کہ تفہیمات کی عبارت لکھتے وقت اگر مودودی صاحب کی مراد لغوی عصمت ہوتی تو پھر اس سے پہلے یہ کیوں لکھتے کہ: "اس

تاویل کو قبول کر لینے میں لوگوں نے صرف اس بنا پر تامل کیا ہے کہ انبیاء کی طرف اس قسم کی لغزشوں کا انتساب عصمت انبیاء کے خلاف معلوم ہوتا ہے''۔ کیونکہ جن لوگوں نے اس قسم کی لغزشوں کے انتساب کو عصمت انبیاء کے خلاف سمجھا ہے ان کی مراد عصمت اصطلاحی ہی ہوگی نہ کہ لغوی''۔

(ج) اگر مودودی صاحب کے نزدیک اس وقت اصطلاحی عصمت مراد نہ ہوتی تو ان کو اس استدلال کی کیا ضرورت تھی کہ:

''لیکن ان حضرات نے شاید اس امر پر غور نہیں کیا کہ عصمت دراصل انبیاء کے لوازمِ ذات سے نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے''۔

مودودی صاحب کے یہ الفاظ کو ''عصمت دراصل انبیاء کے لوازمِ ذات سے نہیں ہے۔'' دلالت کر رہے ہیں کہ ان کے نزدیک یہاں اصطلاحی عصمت مراد ہے ورنہ اگر محض عام زلت (لغزش) مراد ہوتی تو پھر اس کے انبیاء کے لئے لوازم ذات میں سے ہونے یا نہ ہونے کی بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ اس بات کا کوئی بھی قائل نہیں ہے کہ بحیثیت انسان عصمت انبیاء کی ذات کے لئے لازم ہے بلکہ یہ بھی کسی کا قول نہیں ہے کہ بحیثیت نبی ان سے کوئی لغزش نہیں ہوسکتی۔ پھر مودودی صاحب کس کی تردید میں یہ استدلالات پیش کر رہے ہیں، مودودی صاحب کے نظریئے پر جو شبہات وارد ہوسکتے تھے ان کی پیش بندی کے لئے ہی وہ یہ استدلال قائم کر رہے ہیں اور ایسے شبہات عصمت کے اصطلاحی مفہوم پر ہی وارد ہوسکتے ہیں اور عصمت کا اصطلاحی مفہوم یہی ہے کہ انبیائے کرام گناہوں سے معصوم ہیں۔[1]

(۱) مودودی صاحب کی اس عبارت کی بناء پر یہ ضروری ہے کہ کسی نبی سے بھی فریضہ نبوت ورسالت کی ادائیگی میں کوئی لغزش اور کوتاہی صادر نہ ہو۔ لہٰذا حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں مودودی صاحب کا یہ لکھنا کہ ان سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں ان کے اس نظریہ کے خلاف ہے جو تفہیمات کی مندرجہ عبارت میں مذکور ہے۔

(د) علاوہ ازیں انہوں نے جو یہ لکھا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے''۔ یہ بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ لغزش سے مراد معصیت اور گناہ ہے۔ کیونکہ معصیت کے صدور کی وجہ سے ہی تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء کرام منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا نہیں کر سکے۔ ورنہ عام لغزش کا اگر صدور ہو بھی جائے جن کا تعلق فریضہ رسالت سے نہ ہو تو اس سے منصب نبوت کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر مفتی محمد یوسف صاحب کے نزدیک ہماری یہ بات صحیح نہیں ہے تو پھر مودودی صاحب کی اس تعلیل کو (کہ اللہ تعالیٰ ان کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں الخ) وہ کیونکر صحیح ثابت کر سکتے ہیں؟

(س) مفتی صاحب نے عصمت عن الزلات کا باب محض مودودی صاحب کی صفائی کے لئے قائم کیا ہے۔ ورنہ اس عنوان کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ زلت اور لغزش کے باوجود انبیائے کرام علیہم السلام معصوم ہی رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں کہ اگر مودودی صاحب اور مفتی صاحب کے نزدیک ہر نبی سے کسی وقت میں اللہ تعالیٰ نے بالارادہ اپنی حفاظت اور عصمت اٹھالی ہے تو پھر ان کو علی الاطلاق معصوم کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ مودودی نظریہ کے تحت تو یہ کہا جائے گا کہ انبیاء معصوم بھی ہیں اور غیر معصوم بھی۔ اور اہل سنت پر اس لئے یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ ان کے نزدیک لغزش کے صدور کے باوجود بھی وہ معصوم ہیں اور ان کی عصمت دائمی ہے اگر بالفرض کوئی یہ کہے کہ انبیاء سے نعوذ باللہ کفر، کذب اور کبیرہ کا صدور ایک دو بار ہوجاتا ہے تو کیا اس نظریہ کی بنا پر بھی اس کو عصمت انبیاء کا قائل مانا جائے گا؟ کیونکہ وہ عصمت کے جزوی ارتفاع کا قائل ہے نہ کہ کلی ارتفاع کا۔

۳۔ مودودی صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ: ''عصمت دراصل انبیاء کے لوازمِ ذات سے نہیں ہے'' تو اگر لغزش سے مراد مودودی صاحب کے نزدیک عام ہوتی تو اس

استدلال کی کیا ضرورت تھی کہ ’’عصمت انبیاء کے لوازم ذات سے نہیں ہے‘‘۔ عصمت کے انفکاک کے خود ساختہ نظریہ کے لئے۔ اس استدلال کی اس لئے ضرورت پڑی کہ ان کے نزدیک صدورِ لغزش سے مراد اس وقت معصیت اور گناہ کا صدور تھا۔ ورنہ یہ استدلال ہی لغو ہو جاتا ہے کیونکہ صدورِ لغزش کے وقت عصمت ان سے جدا ہی نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر شیخ العرب والعجم حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

’’انبیاء علیہم السلام کی عصمت نبوت کے لوازم ذاتیہ میں سے ہی ہے۔

ہاں بحیثیت نبوت لوازم ذاتیہ میں سے ہے، بحیثیت بشریت نہیں ہے۔ اور اسی طرح عصمت ان کی دائمی ہے کسی وقت ان سے جدا نہیں ہوتی۔ جن امور کو مودودی صاحب لغزشیں شمار کرتے ہوئے عصمت کا اٹھ جانا سمجھتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے۔ یہ امور معصیت میں ہی نہیں صرف صورت معصیت ہیں‘‘۔

(مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت ص ۲۸)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت مدنیؒ کی گرفت مودودی صاحب کے عصمت اٹھائے جانے کے نظریہ پر ہے نہ کہ عام لغزش کے صدور کے نظریہ پر۔

تین قرآئن کی بحث:

میں نے ’’علمی محاسبہ‘‘ میں مودودی صاحب کی عبارات درج کرنے کے بعد یہ لکھا تھا کہ:

’’مفتی محمد یوسف صاحب ہی بتلائیں کہ معاملہ بھی ایک منکوحہ عورت کا ہو جس کا خاوند زندہ ہے۔ اور وہ یہودی سوسائٹی کے اثر کا بھی نتیجہ ہو اور پھر اس میں ان کی نفسانی خواہش کا بھی دخل ہو تو کیا ایسا فعل ترک اولیٰ یا عام لغزش میں شمار ہو گا یا گناہ اور معصیت اور عصمتِ انبیاء کے خلاف‘‘؟

اس کے جواب میں ’’اتمام حجت‘‘ قسط ۳ ص ۱۳ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۶۹ء میں لکھتے ہیں:

’’اولاً . . . . یہ بحث انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ مولانا مودودی تو یہ تصریح کریں کہ لغزشوں سے مراد خلاف الاولیٰ امور ہیں اور آپ ان ہی کی عبارتوں سے قرینے تلاش کرتے پھریں کہ نہیں لغزش سے مراد گناہ ہے۔ ثانیاً یہ خیال اس لئے بھی غلط ہے کہ قرینہ کے بیان میں جو تین باتیں بیان کی گئی ہیں وہ گناہ اور معصیت کی باتیں ہرگز نہیں ہوسکتیں تاوقتیکہ ان کے متعلق یہ ثبوت فراہم نہ کیا جائے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی شریعت میں یہ باتیں ناجائز اور گناہ کی باتیں تھیں۔ محققین علمائے تفسیر نے تو اس کے برخلاف صاف طور پر یہ تشریح فرمائی ہے کہ یہ ساری باتیں نہ صرف واقع اور متحقق ہیں بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی شریعت میں جائز بھی تھیں‘‘۔ اس کے بعد مفتی صاحب نے تفسیر ابو سعود کی یہ عبارت نقل کی ہے جس کا اختصار یہ ہے کہ:

وکان ذلک جائزا فی شریعة داؤد معتاداً فیما بین امته فکان یسئل بعضهم بعضا ان ینزل عن زوجة فیزوجها اذا اعجبته . . . . علی انه لم یکن ینبغی له ان یتعاطی بمثل ما یتعاطاه احاد امته بل کان المناسب له ان یغلب هواه ویصبر علی ما امتحن به اھ (ابوسعود بحوالہ جمل جلد ۳ ص ۵۶۷)

ترجمہ: یہ کام حضرت داؤد علیہ السلام کی شریعت میں جائز اور امت میں معمول تھا۔ چنانچہ اس وقت لوگ ایک دوسرے سے یہ درخواست کرتے تھے کہ بیویوں کو ان کے لئے چھوڑ دیں تاکہ وہ ان سے نکاح کرلیں جبکہ وہ ان کو پسند آتی تھی، انصار بھی اسلام کے ابتدائی دور میں اپنے مہاجر بھائیوں سے اس طرح کا فیاضانہ سلوک کرتے تھے اور کوئی انکار اس پر نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عظیم مرتبت اور رفعت شان کے ساتھ اس طرح کی درخواست مناسب نہ تھی۔ اس لئے ایک فرضی تمثیل سے انہیں یہ تنبیہ کی گئی کہ ان کے لئے وہ کام مناسب نہ تھا جو عام افراد امت میں معمول تھا بلکہ مناسب ان کے لئے یہ تھا کہ اپنی خواہش نفس کو قابو میں رکھ کر اس آزمائش

میں ثابت قدم رہتے جس میں انہیں ڈالا گیا تھا''۔

الجواب (ا) مندرجہ عبارت سے تین باتیں ثابت ہیں:

(۱) حضرت داؤد کی شریعت میں یہ جائز تھا کہ کسی دوسرے شخص کی بیوی سے اس طریق پر نکاح کیا جائے۔

(۲) ان لوگوں میں یہ عام معمول تھا۔

(۳) بوجہ رفعت شان کے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے یہ مناسب تھا کہ اپنی خواہش (نکاح) کو مغلوب رکھتے۔

اب ہمارا سوال یہ ہے کہ جب یہ بات حضرت داؤ علیہ السلام کی شریعت میں جائز تھی تو پھر مودودی صاحب نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ شریعت میں جائز ہونے کی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ نکاح کیا تھا۔ اور اس کے برعکس یہ کیوں لکھا کہ آپ نے اسرائیلی سوسائٹی سے متاثر ہوکر یہ کام کیا تھا۔ اور گو اس سوسائٹی میں یہ عام رواج تھا۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ حضرت داؤد نے یہودی سوسائٹی سے متاثر ہوکر ہی یہ کام کیا ہو۔ بلکہ ان کے لئے تو شرعی جواز ہی اس کی وجہ بن سکتی ہے۔ پیغمبر شریعت کو دیکھتے ہیں نہ کہ رواج کو۔

(ب) تفسیر مذکور کے عربی الفاظ یہ تھے: بل کان المناسب له ان یغلب هواه (بلکہ آپ کے لئے مناسب یہ تھا کہ اپنی خواہش کو مغلوب رکھتے) لیکن مفتی صاحب نے یہاں مودودی صاحب کی تائید وتصویب کے لئے ''ھویٰ'' کا ترجمہ خواہش نفس کیا ہے ہم کہتے ہیں کہ ''ھویٰ'' سے مراد یہاں خواہش نکاح ہے اور یہ ضروری نہیں کہ نکاح کا منشا خواہش نفس ہی ہو۔ کیونکہ یہ فعل حضرت داؤد علیہ السلام کا ہے جو ایک نبی معصوم ہیں اور انبیائے کرام کے قول وفعل میں خواہش نفس کا دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں ان کا مقصد اقامتِ شریعت اور رضائے الٰہی کا حصول ہوتا ہے جیسا کہ تفسیر مظہری کا حوالہ میں نے ''علمی محاسبہ'' میں پیش کیا ہے کہ:

(ما ینطق عن الهوىٰ ان هو الا وحی یوحیٰ . . . وکذا کل ما یتکلم لیس منشاہ الهوی النفسانیة) (یعنی اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام بھی فرماتے ہیں اس کا منشا نفسانی خواہش نہیں ہوتا) اگر قول کا منشا نفسانی خواہش نہیں ہوتا تو فعل انبیاء میں کیونکر نفسانی خواہش کا دخل ہوگا؟ اور اگر مفتی صاحب جواب میں یہ کہیں کہ نکاح کی خواہش میں بھی تو خواہش نفس کا دخل ہوسکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات سے جو نکاح کئے تھے کیا ان کے متعلق بھی آپ یہ کہنے کی جرأت کریں گے کہ یہ خواہش نفس پر مبنی تھے العیاذ باللہ۔ تو جو منشا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں کا تھا یا دیگر بعض انبیائے کرام نے جو متعدد نکاح کئے وہی منشا حضرت داؤد علیہ السلام کا مان لیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔ آخر آپ ایک نبی معصوم کے فعل کو خواہش نفس پر مبنی قرار دینے پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔ کیا اسی کو پاکیزہ عقیدہ عصمت کہتے ہیں، باقی رہا یہ کہ پھر اس پر تنبیہ کیوں کی گئی تو اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ایک منکوحہ عورت کو اس طرح طلاق دلوا کر نکاح کر لینا حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے بہتر نہ تھا۔ یعنی آپ نے ترک اولیٰ کیا۔ اور آپ نے تفسیر ابو سعود کی عبارت میں لفظ ''ھویٰ'' کا ترجمہ جو خواہش نفس سے کیا ہے وہ غلط ہے۔ کیونکہ ھویٰ کا اطلاق ایسی خواہش پر بھی کیا جاتا ہے جو نفسانیت سے پاک ہو۔ جیسا کہ حدیث شریف میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ قول مذکور ہے کہ:

ان اللہ یسارع فی هواک (بے شک اللہ تعالیٰ آپ کی خواہش کو جلدی پورا کرتا ہے) کیا یہاں بھی مفتی صاحب ''ھویٰ'' کا ترجمہ خواہش نفس سے کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔ مفتی صاحب کا اگر انبیائے کرام کی عصمت پر ایمان ہے تو وہ مودودی صاحب کی پوزیشن صاف کرنے کی بجائے انبیاء کرام کے مقام کو بے غبار ثابت کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں کہ سابقہ جواب ایسی روایات کو تسلیم کرنے کی بنا پر دیا

گیا ہے جن میں حضرت داؤد علیہ السلام کا اوریا کی منکوحہ عورت کو طلاق دلوا کر نکاح کرنے کا ذکر ہے لیکن ایسی روایات قابل یقین نہیں ہیں اسی لئے مفسرین نے ایک یہ قول بھی لکھا ہے کہ اوریا کا اس عورت سے ابھی نکاح نہیں ہوا تھا صرف منگنی ہوئی تھی۔

چنانچہ امام رازیؒ تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں: (الاول) ان ھذہ لامرأۃ خطبھا اوریاء فاجابوہ ثم خطبھا داؤد فاثرہ اھلھا فکان ذنبہ ان خطب علی خطبۃ اخیہ المومن مع کثرۃ نساءہ (یعنی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ واقعہ اس عورت کے متعلق ہے جس کا اوریا نے رشتہ مانگا تھا اور گھر والوں نے قبول کرلیا تھا۔ پھر حضرت داؤد نے اس عورت کا رشتہ مانگا تو اس کے گھر والوں نے آپ کو ترجیح دی۔ پس حضرت داؤد کی لغزش یہ تھی کہ آپ نے اپنے مومن بھائی کی منگنی پر منگنی کی تھی باوجود زیادہ بیویاں رکھنے کے" اور امام رازیؒ وغیرہ محققین کے نزدیک حضرت داؤد کی اس آزمائش کا تعلق کسی عورت کے واقعہ سے بالکل نہیں ہے۔ انہوں نے اور دوسری توجیہات پیش کی ہیں۔ امام رازیؒ نے الزام خواہش نفس کا بھی جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو اپنا کامل بندہ فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی پیروی کا حکم دیا۔ تو اگر حضرت داؤد میں خواہش نفس کی پیروی تسلیم کی جائے تو پھر آپ عبد کامل کیسے قرار دئے جاسکتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی پیروی کا حکم کیونکر دیا جاسکتا ہے؟ (تفسیر کبیر)

اور امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ:

ان الانبیاء معصومون من المباح لھوی انفسھم بخلاف الاولیاء فاذا فعل الانبیاء المباح لا یفعلونہ لھوی نفوسھم کغیرھم وانما یفعلون علی جھۃ التشریع انہ مباح (الیواقیت والجواھر جلد ۲ ص ۱۵۶)

"یعنی انبیاء مباح فعل میں بھی اپنے نفسوں کی خواہش سے معصوم ہیں بخلاف اولیاء کے، پس جب انبیاء کوئی مباح فعل کرتے ہیں تو وہ اپنے نفس کی خواہش سے نہیں

کرتے بلکہ یہ بتلانے کے لئے کرتے ہیں کہ شریعت میں یہ فعل مباح ہے"۔

فرمائیے! امام شعرانی جیسے محقق کیا فرما رہے ہیں اور مفتی صاحب انبیاء کرام کی تنقیص میں کیا راگ الاپ رہے ہیں---- بے ادب محروم گشت از فضل رب

(ج) اگر مودودی نظریہ کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام کے اس فعلِ نکاح میں خواہش نفس کا دخل مان لیا جائے تو پھر اس پر زلت (لغزش) کی تعریف صادق نہیں آسکتی۔ کیونکہ لغزش وہ فعل ہے جو بلا قصد وارادہ کے سرزد ہو اور یہاں قصد وارادہ بھی ہے اور مودودی صاحب تو نعوذ باللہ اس میں خواہش نفس کا دخل بھی مان رہے ہیں۔ تو اس کے باوجود اس کو زلت (لغزش) کے تحت کس طرح داخل کریں گے؟ حالانکہ مفتی صاحب خود بھی یہ لکھ چکے ہیں کہ: قال السرخسی اما الزلۃ فلا یوجد فیھا القصد الی اصل الفعل "امام سرخسی نے کہا ہے کہ زلت میں اصل فعل کا قصد نہیں ہوتا" (علمی جائزہ ص ۶۰)

نیز مفتی صاحب نے ص ۵۷ پر صدر الشریعت کی یہ عبارت پیش کی ہے: "وھو فعل من الصغائر یفعلہ من غیر قصد" (توضیح) "لغزش صغیرہ گناہوں میں سے ہے جو قصد اور ارادہ کے بغیر فاعل سے سرزد ہوجاتی ہے" تو اب مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ جب لغزش (زلت) اس فعل کو کہتے ہیں جو قصد وارادہ کے بغیر سرزد ہو اور مودودی صاحب نے حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ جو فعل ان سے صادر ہوا تھا اس کے اندر خواہش نفس کا کچھ دخل تھا۔ (تفہیم القرآن جلد ۴ سورۃ ص، صفحہ ۳۲۷)

تو پھر حضرت داؤد علیہ السلام کے فعل کو آپ کیونکر عام لغزش قرار دے کر مودودی صاحب کی برأت ثابت کرسکتے ہیں ع

وہ الزام ہم کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

صدر الشریعت اور مودودی:

مفتی محمد یوسف صاحب نے صدر الشریعت کی عبارت پیش کرنے کے بعد یہ

لکھا ہے کہ:

''بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ صدر الشریعت کی یہ عبارتیں مولانا مودودی کی تفہیمات والی عبارتوں سے زیادہ قابل گرفت معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ صدر الشریعت نے زلات کو معصیت مان کر انبیاء کی طرف منسوب کیا ہے اور مولانا مودودی نے ان کی طرف لغزش کی جو نسبت کی ہے تو معصیت مان کر نہیں کی ہے۔ پس اگر ہم چاہیں تو صدر الشریعت کو گروہ اہل السنّت سے نکال کر پھینک دیں تو ان کی یہ عبارتیں ہماری اس مطلب برآری کے لئے کافی ہیں اور مزید کسی تلاش اور کاوش کی ضرورت نہیں ہے الخ۔ (علمی جائزہ ص ۸۵)

الجواب:

(ا) مفتی صاحب اپنے ممدوح ومقتدا مودودی صاحب کی حمایت کے جوش میں فہم وانصاف کی حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ درحقیقت صدر الشریعت کا عقیدہ اہل السنّت کے خلاف نہیں ہے۔ کیا مفتی صاحب یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ صدر الشریعت نے انبیاء کرام علیہم السلام کے افعال میں خواہش نفس کے دخل کی تصریح کی ہے تو جس فعل میں خواہش نفس کا دخل ہوگا کیا وہ معصیت اور گناہ نہیں ہوگا۔ اگر نفس کا دخل ہے تو اللہ کی رضا مطلوب نہیں اور اگر اللہ کی رضا مطلوب ہے تو خواہش نفس کا اس میں دخل نہ رہا۔ تو مفتی صاحب یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ مودودی صاحب نے انبیاء کی طرف لغزش کی نسبت معصیت مان کر نہیں کی ہے؟

(ب) زلت کی تعریف میں آپ نے صدر الشریعت کی یہ عبارت پیش کی ہے۔ وھی فعل من الصغائر یفعلہ من غیر قصد ولا بد ان یتنبہ علیھا (توضیح) جس کا ترجمہ آپ نے یہ لکھا ہے کہ ''لغزش صغیرہ گناہوں میں سے ہے جو قصد وارادہ کے بغیر فاعل سے سرزد ہو جاتی ہے، مگر ضروری ہے کہ اس پر متنبہ

کیا جائے''۔ (علمی جائزہ ص ۵۷)

اس میں تصریح ہے کہ زلت وہ فعل ہے جو قصد وارادہ کے بغیر سرزد ہو اور امام سرخسی کی حسب ذیل عبارت لکھ چکے ہیں:

قال السرخسی اما الزلۃ فلا یوجد فیھا القصد الی اصل الفعل واما المعصیۃ فھی فعل حرام یقصد الی عینہ مع العلم بحرمتہ (تلویح) ''امام سرخسی نے کہا ہے کہ زَلت میں اصل فعل کا قصد نہیں ہوتا اور معصیت ایک حرام فعل ہے جو حرام جان کر قصداً کیا گیا ہو'' (علمی جائزہ ص ۶۰)

تو اب فرمایئے صدر الشریعت نے جو زَلت کی تعریف کی ہے آپ نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ ''لغزش صغیرہ گناہوں میں سے ہے'' کہاں تک صحیح ہے۔ گناہ تو وہ ہوگا جو قصداً کیا جائے اور زَلت کا صدور قصد وارادہ سے نہیں ہوتا تو لغزش (زلت) کو گناہ قرار دینا کیونکر صحیح ہوگا۔ کیا یہی آپ کی علمی دیانت ہے؟

(ج) آپ نے علمی جائزہ میں تلویح کی عبارت کیا اس لئے مکمل نہیں لکھی کہ کہیں قارئین پر زَلت کا مفہوم زیادہ واضح نہ ہو جائے اور آپ کے پیش کردہ مفہوم کی غلطی سمجھ لیں۔ تلویح کی پوری عبارت یہ ہے۔ علامہ تفتازانی فرماتے ہیں: قال شمس الائمۃ السرخسی اما الزلۃ فلا یوجد فیھا القصد الی عینھا ولکن یوجد القصد الی اصل الفعل لانھا اخذت من قولھم زل الرجل فی الطین اذلم یوجد القصد الی الوقوع ولا الی الثبات بعد الوقوع ولکن وجد القصد الی المشی فی الطریق وانما یواخذ علیھا لانھا لاتخلو عن نوع تقصیر یمکن للمکلف الاحتراز عنہ عند التثبیت واما المعصیۃ حقیقۃ فھی فعل حرام یقصد الی نفسہ مع العلم بحرمتہ.

''شمس الائمہ سرخسی نے فرمایا کہ زَلت میں اصل فعل کا قصد تو پایا جاتا ہے مگر اس کی ذات کا قصد نہیں پایا جاتا کیونکہ زَلت ماخوذ ہے زل الرجل فی الطین سے جس کا معنی یہ ہے کہ آدمی گارے میں پھسل گیا (یہ اس وقت کہا جاتا ہے) جب کہ قصد تو

راستہ پر چلنے کا ہو۔ لیکن بغیر قصد کے گارے میں گر جائے اور گرتے ہی سنبھل جائے (لیکن گارے میں گرنا اور پھر سنبھل جانا پہلے اس کے ارادے میں نہ تھا) اور زلت پر مواخذہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ اس قسم کی تقصیر سے خالی نہیں ہوتا کہ اگر مکلّف انسان زیادہ مضبوطی سے کام لیتا تو اس سے بچنا ممکن تھا۔ اور جو حقیقۃً معصیت ہے تو اس میں باوجود اس کی حرمت کا علم ہونے کے حرام فعل کی ذات کا قصد ہوتا ہے'' اس تشریح سے معلوم ہوگیا کہ انبیاء سے کسی معصیت کا صدور نہیں ہوتا۔ اور جس لغزش کا صدور ہوتا ہے اس کو معصیت اور گناہ نہیں کہہ سکتے۔ لہٰذا مفتی صاحب موصوف کا یہ لکھنا بالکل غلط ہے کہ:

''بہرحال زلات کے بارے میں صدر الشریعت کی رائے یہ ہے کہ وہ صغائر گناہوں کی فہرست میں داخل ہے۔'' (علمی جائزہ ص ۵۹)

اگر آپ یہ کہیں کہ پھر فعل من الصغائر کا مطلب کیا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد صورۃً صغیرہ ہے نہ کہ حقیقۃً۔ نیز یہ معنی ہے کہ صغائر محل ہیں زلت کے نہ یہ کہ زلت خود صغیرہ ہے، لہٰذا مفتی صاحب کا ترجمہ خلاف مراد ہے۔

(د) ''اور جب آپ نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ: صغائر کا صدور اگر سہواً و خطأً ہو تو بالاتفاق جائز ہے'' اور بقول آپ کے صدر الشریعت بھی صغائر کا صدور سہواً ہی مان رہے ہیں تو پھر آپ ان کا عقیدہ اہل سنت کے خلاف کیونکر قرار دے سکتے ہیں؟

مفتی صاحب کی علمی غلطیاں:

۱۔ مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ صدر الشریعت نے تلویح میں یہ لکھا ہے: وما ذکر بعض العلماء من ان زلۃ الانبیاء ھی زلل من الافضل الی الفاضل و من الاصوب الی الصواب لا عن الحق الی الباطل و عن الطاعۃ الی المعصیۃ وانما یعاتبون لجلالۃ قدرھم ولان ترک الافضل عنھم بمنزلۃ ترک الواجب عن الغیر۔

''اور بعض مشائخ نے یہ ذکر کیا ہے کہ انبیاء کی زلت میں پھسلنا ہوتا ہے افضل

سے فاضل کی طرف اور زیادہ صواب سے صواب کی طرف نہ کہ حق سے باطل کی طرف اور طاعت سے معصیت (گناہ) کی طرف۔ لیکن ان کی جلالت شان کی وجہ سے ان پر مواخذہ کیا جاتا ہے اور اس لئے بھی کہ ان کا افضل کو ترک کرنا مثل واجب کے ترک کے ہے غیر انبیاء سے''۔

مفتی محمد یوسف صاحب نے اس عبارت کا ترجمہ یہ کیا ہے:

''بعض مشائخ نے یہ ذکر کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی لغزش یہ ہے کہ زیادہ بہتر اور زیادہ صواب کام کو چھوڑ کر اچھا اور جائز کام کیا جائے نہ کہ حق اور طاعت کی جگہ باطل اور معصیت کا ارتکاب کیا جائے'' ـــــ یہ رائے شمس الائمہ سرخسی کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ (صرح بہ العلامۃ التفتازانی فی التلویح)

(علمی جائزہ ص ۵۹)

یہاں علمی جائزہ کی منقولہ اس عبارت میں بعض العلماء کے الفاظ ہیں حالانکہ اصل کتاب میں بعض المشائخ کے الفاظ ہیں۔ لیکن مفتی صاحب نے چونکہ ترجمہ میں بعض مشائخ لکھا ہے اس لئے عربی عبارت میں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے جو قابل مواخذہ نہیں۔ لیکن مفتی صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ صدر الشریعت نے علماء کا یہ مذہب اس طرح نقل کیا ہے تو یہ غلط ہے کیونکہ یہ عبارت صدر الشریعت کی نہیں بلکہ علامہ تفتازانی کی ہے۔

۲۔ مفتی صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے صغیرہ کا صدور سہواً و خطاءً جائز ہے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ انہوں نے یہاں بعض مشائخ کا یہ قول خود نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کی لغزش صرف یہ ہے کہ وہ ایک زیادہ صحیح اور زیادہ بہتر فعل کو چھوڑ کر ایک صحیح اور جائز فعل کو کرتے ہیں۔ تو ان کے نزدیک بطور زلت کے بھی صغیرہ کا صدور جائز نہیں ہوسکتا لہٰذا یہ عقیدہ مختلف فیہ ہوگیا نہ کہ متفق علیہ۔

۳۔ مفتی صاحب نے بعض مشائخ کی مذکورہ رائے کے متعلق یہ لکھا ہے کہ:

یہ رائے شمس الائمہ سرخسی کی طرف منسوب کی گئی ہے صرح به العلامة التفتازاني في التلويح . (علمی جائزہ ص۶۰)

تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ اس مقام پر علامہ تفتازانی نے یہ تصریح نہیں کی ہے کہ یہ رائے شمس الائمہ سرخسی کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

۴۔ مفتی صاحب نے امام سرخسی کے قول اما الزلة فلا يوجد فيها القصد الى عينها الخ کو بعض مشائخ کے قول کی تائید سمجھ لیا ہے حالانکہ امام سرخسی کا قول علامہ تفتازانی نے صدر الشریعت کے اس قول کی توجیہ کے لئے پیش کیا ہے تاکہ یہ غلط فہمی نہ رہے کہ صدر الشریعت انبیاء کرام سے معصیت کے صدور کو جائز کہتے ہیں کیونکہ معصیت وہ فعل ہے جو قصد وارادہ سے کیا جائے اور جب صدر الشریعت نے من غير قصد کی قید لگادی تو وہ معصیت سے خارج ہوکر زلت (لغزش) میں داخل ہوگیا۔ کیا مفتی صاحب کو اپنے اسی علم وفہم پر ناز ہے؟ علاوہ ازیں یہ بھی ملحوظ رہے کہ تلویح کی مذکورہ عبارت میں جو بعض مشائخ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ لان ترک الافضل عنهم بمنزلة ترک الواجب عن الغير. "یعنی انبیائے کرام سے اگر افضل فعل ترک ہوجائے تو وہ بمنزلہ اس کے ہوتا ہے جو غیر انبیاء سے واجب ترک ہوجائے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ الفاظ لکھے ہیں "وكان الواجب عليه ان يستمر على الدعاء" (تفسیر کبیر) تو وہاں بھی امام رازی کے نزدیک ترک واجب سے مراد ترک اولی اور افضل ہی ہے جیسا کہ "علمی محاسبہ" میں اس پر مفصل بحث گذر چکی ہے۔ لیکن باوجود اس کے مفتی صاحب موصوف اس بات پر مصر ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام نے فریضہ رسالت میں کوتاہیاں کی تھیں۔ نعوذ باللہ۔

عصمت کے ارتفاع کی بحث:

مودودی صاحب نے تفہیمات میں تصریح کی ہے کہ عصمت دراصل انبیاء کے

لوازم ذات سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہوجائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہوسکتی ہے" (ص۴۳) اس عبارت کی توجیہ میں مفتی صاحب نے علمی جائزہ، ص ۶۶ پر لکھا ہے کہ:

"اس مسلّم حقیقت کو پیش نظر رکھ کر جب ہم تفہیمات کی اس عبارت پر نظر ڈالتے ہیں کہ "یہ[1] عصمت انبیاء علیہم السلام کے لوازم ذات سے نہیں بلکہ نبوت ورسالت کے لوازمات میں سے ہے" الخ

تو اس کا جواب میں نے "علمی محاسبہ" میں یہ دیا تھا کہ ____ "اگر مفتی صاحب یہ فرمائیں کہ مودودی صاحب کی عبارت کی مراد یہی ہے کہ عصمت نبوت ورسالت کے لوازمات میں سے ہے" تو پھر مودودی صاحب کی یہ بات بالکل غلط ہے کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے ارادے سے یہ عصمت انبیاء سے اٹھا بھی لیتے ہیں کیونکہ انبیاء کی نبوت جب دائمی ہے اور کسی وقت بھی ان سے جدا اور منفک نہیں ہوسکتی تو (پھر عصمت جو نبوت کے لئے لازم ہے) وہ کس طرح ان سے اٹھالی جاتی ہے۔ حالانکہ لازم وملزوم تو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔ عصمت کا اٹھنا تو اسی وقت متصور ہوسکتا ہے جب انبیاء کی نبوت بھی اٹھالی جائے۔ اب مفتی صاحب یا تو یہ مان لیں کہ عصمت کی طرح انبیاء کی نبوت بھی تھوڑی دیر کے لئے ختم ہوجاتی ہے یا ابوالاعلیٰ کے اس نظریئے کو باطل قرار دینے کی جرأت کریں کہ عصمت انبیاء کرام سے کسی وقت اٹھالی جاتی ہے۔ دیکھئے مفتی محمد یوسف صاحب جیسے محقق کون سی صورت اختیار کرتے

(۱) مفتی صاحب نے مودودی صاحب کی عبارت میں ترمیم کی ہے کیونکہ تفہیمات میں نہ "یہ" کا لفظ ہے اور نہ یہ الفاظ ہیں بلکہ نبوت ورسالت کے لوازمات میں سے ہے۔

ہیں۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن‘‘ (علمی محاسبہ)

اس کے جواب میں مفتی صاحب نے یہ لکھا ہے کہ: ’’عصمت انبیاء کے نام پر قاضی صاحب اور دوسرے معترضین حضرات نے جو تیسرا اعتراض کیا ہے اور جس انداز میں لازم وملزوم کا اشکال پیش کیا ہے وہ انتہائی غیر علمی بنیاد رکھتا ہے . . . .اس اشکال پر ہمارے یہ کرم فرما حضرات اگرچہ بہت نازاں ہیں لیکن حیرت یہ ہے کہ ان کی نظر نہ اس اشکال کے وزن پر گئی اور نہ وہ یہ سمجھ سکے ہیں کہ اس دلیل میں آخر جان ہی کیا ہے۔ عملاً یہ ایک عامیانہ اعتراض کے سوا کچھ نہیں۔ اس طرح کے اشکالات وہی لوگ پیش کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں دوسروں کا نقطہ نظر معلوم کرنے کا کوئی داعیہ موجود نہ ہو۔ یا وہ جان بوجھ کر غلط فہمی پھیلانے کا شوق رکھتے ہوں۔ یا پھر ان میں کسی کی بات سمجھنے کی سرے سے کوئی اہلیت ہی موجود نہ ہو کیونکہ تمام اہل علم جانتے ہیں کہ ___ ’’عصمت دو قسم کی ہے ایک وہ جو گناہوں سے ہو۔ دوسری وہ جو لغزشوں اور خلاف اولیٰ امور سے ہو‘‘۔

دوسرے اہل علم کی طرح مولانا مودودی کے نزدیک بھی جو عصمت لازم نبوت ہے وہ عصمت ہے گناہوں سے۔ یہ نہ مولانا کے نزدیک قابل ارتفاع ہے اور نہ اس کے ارتفاع کا مولانا نے قول کیا ہے کہ اس کے نتیجہ میں گناہ سرزد ہوں اور جس عصمت کا ارتفاع مولانا کے نزدیک ممکن ہے یا اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ ہر نبی سے ایک یا دو دفعہ اٹھائی گئی ہے وہ عصمت ہے خلاف الاولیٰ امور سے، اس کے نتیجہ میں اگر سرزد ہو سکتے ہیں تو خلاف الاولیٰ امور سرزد ہو سکتے ہیں اور ان سے عصمت لازم نبوت بالمعنی المتعارف (ما یمتنع انفکاکہ عن الملزوم) نہیں ہے کہ اس کے منتفی ہو جانے سے یا نبوت منتفی ہو جائے یا گناہ کا صدور لازم آئے بلکہ اس کے ارتفاع سے زیادہ سے زیادہ

خلاف الاولیٰ امور صادر ہو سکتے ہیں۔ اور قرآن کی شہادت کے مطابق ان سے انبیاء معصوم نہیں ہیں تو بتایئے لازم وملزوم کے اس اشکال کی بنیاد ہی کیا باقی رہی‘‘۔ (اتمامِ حجت، قسط ۴، ص ۱۲، آئین ۱۶ جنوری ۱۹۶۹ء)

الجواب:

(ا) آپ نے جو عصمت کی دو قسمیں بیان کر کے مودودی صاحب کی پاکدامنی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے یہ بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ علمائے اہل سنت نے یہ تقسیم نہیں اختیار کی۔ کسی محقق اہل سنت نے عصمت عن الزلات کا قول نہیں پیش کیا۔ چنانچہ آپ خود یہ لکھ چکے ہیں کہ: ’’تقریباً تمام اہل السنّت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ زلات اور لغزشوں سے انبیاء علیہم السلام معصوم اور محفوظ نہیں ہیں۔‘‘

(علمی جائزہ ص ۵۲)

اور یہ بھی لکھا ہے کہ: ’’انبیاء علیہم السلام یقیناً معصوم ہیں ان کے لئے جو عصمت اہل السنّت کے ہاں ثابت اور مسلّم ہے وہ عصمت ہے گناہوں سے نہ کہ زلات اور لغزشوں سے‘‘ (ص ۶۱) تو جب آپ کے نزدیک بھی اہل السنّت انبیاء علیہم السلام کے لئے صرف گناہوں سے عصمت مانتے ہیں اور انبیاء سے لغزشوں کا صدور ہو سکتا ہے تو پھر آپ نے یہ عصمت عن الزلات کی قسم کہاں سے اختراع کر لی ہے اور اگر آپ کو یہ قسم ماننے پر اصرار ہے تو اہل سنت کے دائرہ میں آپ کے لئے گنجائش کہاں رہی؟

۲۔ وہ شخص تو عصمت عن الزلات کا قول کر سکتا ہے جس کے نزدیک انبیاء علیہم السلام سے لغزش کا صدور جائز نہیں لیکن یہ عجیب منطق ہے کہ آپ اور مودودی صاحب انبیاء سے لغزشوں کا صدور بھی مانتے ہیں اور پھر ان کے لئے عصمت عن الزلات کا عنوان بھی اختیار کرتے ہیں۔ آپ کی طرف سے یہ عصمت دائمی اور غیر دائمی کی تقسیم انتہائی

غیر معقول، مضحکہ خیز اور بے بنیاد ہے۔ جب انبیاء کرام علیہم السلام لغزشوں کے صدور کے وقت بھی معصوم ہوتے ہیں تو پھر عصمت اٹھائے جانے کا قول کتنا لغو ہے۔ یہ آپ کی جہالت ہے یا تلبیس تا کہ مودودی صاحب کے باطل نظریہ عصمت پر پردہ ڈالا جاسکے۔

۳۔ اگر علمی اور اعتقادی مباحث میں اس طرح کی من گھڑت تقسیم جائز ہوسکتی ہے تو پھر یہ بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ غیر انبیاء بھی گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ غیر نبی سے ہر وقت گناہ صادر ہو۔ بلکہ بعض خوش نصیب ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے ساری عمر کوئی گناہ نہیں ہوتا یا اگر کوئی گناہ صادر ہوتا ہے تو ان کو توبہ کی توفیق مل جاتی ہے۔ تو کیا ایسے غیر انبیاء اشخاص کو بھی آپ من وجہ معصوم مان لیں گے۔ یعنی وہ معصوم تو ہیں لیکن کسی وقت اللہ تعالیٰ احیاناً بالارادہ اپنی عصمت اٹھا کر ان سے ایک دو گناہ صادر کراتا ہے تا کہ لوگ انہیں پیغمبر نہ مان لیں

بریں عقل و دانش بباید گریست

۴۔(الف) مدار بحث مودودی صاحب کی تفہیمات کی مندرجہ عبارت ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کے نزدیک بوقت تحریر عصمت سے مراد لغزشوں سے عصمت تھی بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی مراد گناہوں سے عصمت تھی۔ اسی لئے تو انہوں نے اوریا کے واقعہ کو تسلیم کر لینے کے بعد ایک اعتراض کا ازالہ کرتے ہوئے یہ لکھنے کی ضرورت سمجھی کہ:

''اس تاویل کو قبول کرنے میں لوگوں نے اس بنا پر تأمل کیا ہے کہ انبیاء کی طرف اس قسم کی لغزشوں کا انتساب عصمت انبیاء کے خلاف معلوم ہوتا ہے لیکن ان حضرات نے شاید امر پر غور نہیں کیا کہ عصمت دراصل انبیاء کے لوازم ذات سے نہیں؟ الخ

اب مفتی صاحب ہی بتائیں گے (ا) اگر یہاں لفظ عصمت سے مراد عصمت

عن الزلات (لغزشوں سے معصوم ہونا) ہی ہے تو وہ ان اہل سنت حضرات کا نام لیں جو عصمت عن الزلات کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک انبیاء کرام علیہم السلام سے کسی قسم کی لغزش صادر نہیں ہوسکتی تا کہ یہ ثابت ہوجائے کہ مودودی صاحب ایسے حضرات کے اعتراض کا جواب دے رہے ہیں اور اگر مفتی صاحب اہل سنت میں سے ایسے معتمد علیہ حضرات کا عصمت عن الزلات کا عقیدہ نہ ثابت کر سکیں تو یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ تفہیمات کی عبارت میں مودودی صاحب کی مراد لفظ عصمت سے وہی عصمت تھی جس پر تمام علماء اہل سنت کا اتفاق ہے اور وہ عصمت عن المعاصی ہی ہے نہ کہ مفتی صاحب کی مفروضہ عصمت عن الزلات۔

(ب) اگر مودودی صاحب کی مراد عصمت عن الزلات ہوتی تو ان کو یہ لکھنے کی ضرورت نہ تھی کہ عصمت دراصل انبیاء کے لوازم ذات سے نہیں۔ کیونکہ اہل سنت میں سے کوئی مستند عالم یہ نہیں کہتا کہ یہ عصمت انبیاء کے لوازمِ ذات میں سے ہے تو پھر مودودی صاحب کس کی تردید کر رہے ہیں۔

(ج) اگر عصمت سے مودودی صاحب کی مراد لغزشوں سے عصمت ہوتی تو ان کو یہ لکھنے کی بھی ضرورت نہ تھی: ''بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے'' کیونکہ عام لغزش کا صدور منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے میں مانع نہیں ہے۔ ورنہ کسی نبی کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے اپنی اپنی قوم پر اتمامِ حجت کر دی ہے۔ جبکہ ان سے بقول مودودی صاحب ایک دو لغزشوں کا صدور مان لیا جائے۔

۵۔ مودودی صاحب کا یہ لکھنا بھی کہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہوجائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہوسکتی ہے اسی پر دلالت کرتا ہے کہ انکی مراد عصمت سے عصمت عن المعاصی ہے۔ کیونکہ انبیاء کرام سے ان کی شان کے مناسب جو بھول چوک

ہوتی ہے وہ تو عصمت کے منافی نہیں ہوتی، اس وقت بھی وہ معصوم ہی ہوتے ہیں اور عصمت ان سے منفک نہیں ہوتی۔ لیکن عام انسان چونکہ اللہ تعالیٰ کی عصمت اور حفاظت کے سایہ میں نہیں ہوتے اس لئے ان سے گناہ ہوجاتے ہیں۔ اس لئے عام انسانوں کی طرح تو انبیاء سے غلطی کا صدور اسی وقت متصور ہوسکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے عصمت عن المعاصی ان سے اٹھالی ہو العیاذ باللہ۔ مفتی محمد یوسف صاحب تسلیم کریں یا نہ، انبیاء کرام سے عام لغزش کا صدور بھی عام انسانوں کی لغزش جیسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ انبیاء کی نیت ہر کام میں رضائے الٰہی کے حصول کی ہوتی ہے، قصد و ارادہ سے وہ کوئی نافرمانی نہیں کرسکتے، اسی لئے ان کی خطا کو زلت اور ترکِ اولیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو جب تک مفتی صاحب تفہیمات کی عبارت کے پیش نظر ہمارے ان اعتراضات کا ازالہ نہیں کرتے ان کی یہ تاویل ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتی کہ تفہیمات کی عبارت میں عصمت سے مراد عصمت عن الزلات ہے نہ کہ عصمت عن المعاصی۔

کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بہت بڑا گناہ کیا تھا:

مودودی صاحب کی صفائی پیش کرتے ہوئے مفتی محمد یوسف صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ:

مولانا موصوف کے متعلق اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اللہ کے کسی نبی کو گناہوں سے ملوث مان سکتے ہیں۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ جو شخص صاف صاف الفاظ میں انبیاء علیہم السلام کے بارے میں یہ تصور رکھتا ہے کہ وہ پیدائش کے وقت سے لے کر آخری لمحہ حیات تک خدا تعالیٰ کی خصوصی نگرانی میں رہتے ہیں اور اس کی خصوصی حفاظت و نگرانی میں رہ کر تربیت پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے بھی وہ اخلاقی عیوب، گمراہیوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رہتے ہیں اور جادہ حق سے ان کے قدم بال برابر بھی ہٹنے نہیں پاتے۔ اس کے متعلق ہم حیران ہیں کہ ایک خدا ترس مسلمان کس

طرح یہ تصور کرسکتا ہے کہ اس کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کبیرہ گناہوں میں ملوث ہوسکتے ہیں'' (آئین ۱۶ جنوری ۱۹۶۹ء اہتمام حجت قسط ۴ ص ۱۳)

الجواب:

(ا) اگر مودودی صاحب انبیاء علیہم السلام کو پیدائش کے وقت سے لے کر آخری لمحہ حیات تک اسی طرح مانتے ہیں جس طرح آپ نے لکھا ہے تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق انہوں نے یہ کیوں لکھا ہے کہ:

''نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہوگیا تھا کہ انہوں نے ایک انسان کو قتل کردیا''۔

(رسائل و مسائل ج ۱، ص ۳۱ بار دوم مطبوعہ ۱۹۵۴ء)

فرمائیے! جب بقول مودودی حضرت موسی علیہ السلام سے یہ بہت بڑا گناہ سرزد ہوا تھا تو کیا اس وقت وہ خداوند تعالیٰ کی خصوصی حفاظت و نگرانی میں تربیت نہیں پا رہے تھے۔ اس کے جواب میں آپ یہی کہیں گے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مصلحتاً اپنی خصوصی حفاظت اور نگرانی اٹھالی تھی۔ تو اس سے یہی ثابت ہوا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی حفاظت اٹھالے تو مودودی صاحب کے نزدیک گناہ کبیرہ سرزد ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ نعوذ باللہ ان کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہوگیا تھا تو تفہیمات میں مودودی صاحب کی اس عبارت سے بھی کہ:

''ورنہ اگر اللہ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہوجائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہوسکتی ہے الخ''

یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ خداوندی حفاظت اٹھ جانے کے بعد نعوذ باللہ انبیاء کرام سے کبیرہ گناہوں کا صدور بھی ہوسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب کی تصانیف میں انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں متضاد باتیں ہیں۔ اور یہی حال مرزا

غلام احمد قادیانی کی تصانیف کا ہے کہ عقیدہ ختم نبوت کا انکار بھی کرتا ہے اور اقرار بھی۔ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصائد بھی لکھتا ہے لیکن اس کی تصانیف میں ایسی عبارتیں بھی ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی تنقیص وتوہین بھی لازم آتی ہے۔ ان تضادات کا آخر کیا حل ہوسکتا ہے۔

مفتی صاحب کا ایک پیش کردہ اشکال:

مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

”تمام اہل السنّت عصمت کو لازمِ نبوت تسلیم کرتے ہوئے، قرآن حکیم کی بتائی ہوئی مثال کو سامنے رکھ کر یہ اقرار کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام سے لغزشیں سرزد ہوتی ہیں۔ وفیھا قسم آخر یسمی بالزلۃ. ”انبیاء کے افعال میں ایسی قسم بھی ہے جس کا نام لغزش ہے“ تو یہاں بھی تفہیمات کی عبارت کی طرح یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ عصمت سے مراد اصطلاحی عصمت ہے کیونکہ بحث اصطلاحی عصمت میں ہے تو جب تمام اہل السنّت نے لغزش کا صدور تسلیم کرلیا تو عصمت کا ارتفاع بھی انہوں نے تسلیم کرلیا کیونکہ عصمت کے ہوتے ہوئے لغزش کا صدور معقول نہیں ہے۔ تو تمام اہل السنّت پر بھی یہ اشکال وارد ہوگا کہ عصمت چونکہ لازم نبوت ہے اس بنا پر جب یہ اٹھ کر لغزش ہوگئی تو ایک طرف اس سے نبوت منتفی ہوگئی کیونکہ لازم کے انتفاء سے ملزوم کا منتفی ہوجانا ضروری ہے اور دوسری طرف اس کے نتیجے میں جو لغزش سرزد ہوئی ہے وہ گناہ ہی کی لغزش ہوگی کیونکہ عصمت اصطلاحی اٹھنے کے بعد سرزد ہونے والی لغزش گناہ کے علاوہ دوسری کوئی لغزش نہیں ہوسکتی۔ اب ہمارے معترضین حضرات یا تو یہ مان لیں کہ نبوت بھی تھوڑی دیر کے لئے منتفی ہوجاتی ہے یا پھر تمام اہل سنت کے اس نظریئے کو باطل قرار دینے کی جرأت کریں کہ انبیاء علیہم

السلام سے لغزشیں سرزد ہوتی ہیں۔ دیکھئے قاضی صاحب جیسے متبحر عالم کون سی صورت اختیار کرتے ہیں“ (اتمامِ حجت قسط نمبر۴، ص۱۳)

الجواب:

(ا) مفتی محمد یوسف صاحب نے اپنی دانست میں یہ ایک لاینحل اشکال پیش کیا ہے۔ حالانکہ اصحاب علم وفہم کے نزدیک سرے سے یہ کوئی اشکال ہی نہیں۔ مفتی صاحب کا اس کو وزنی اشکال قرار دینا ان کی کم فہمی پر مبنی ہے کیونکہ مودودی صاحب کی عبارت پر تو اس لئے ایسا اشکال وارد ہوتا ہے کہ انہوں نے عصمت کے اٹھائے جانے کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن کیا مفتی صاحب کوئی مستند حوالہ پیش کرسکتے ہیں کہ کسی محقق اہل سنت نے عصمت اٹھائے جانے کو تسلیم کیا ہو؟

(ب) مفتی صاحب، مودودی صاحب کی تائید میں عصمت کی دو قسمیں مان رہے ہیں: عصمت عن المعاصی اور عصت عن الزلات۔ لیکن کیا مفتی صاحب یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ کسی محقق اہل سنت نے عصمت عن الزلات اور عصمت دائمی اور غیر دائمی کا نظریہ اختیار کیا ہو۔

(ج) مفتی صاحب نے جو یہ عبارت لکھی ہے کہ: وفیھا قسم آخر یسمی بالزلۃ ”انبیاء کے افعال میں ایسی قسم بھی ہے جس کا نام لغزش ہے“ تو یہاں علماء نے انبیاء کے افعال کی تقسیم کرکے ان میں فعل زَلت بھی تسلیم کیا ہے نہ یہ کہ انہوں نے عصمت کی تقسیم کرتے ہوئے عصمت عن الزلات کی قسم بھی تسلیم کی ہے، علماء کی عبارتوں میں عصمت سے مراد بے شک اصطلاحی عصمت ہے لیکن انبیاء کے افعال میں زَلت (لغزش) کے ذکر سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ انبیاء کرام زَلت سے بھی معصوم ہیں۔ تاکہ ان پر لازم وملزوم کا وہ اعتراض ہوسکے جو مودودی صاحب کی عبارت پر وارد ہوتا ہے بلکہ انبیاء کے افعال میں زَلت کا ذکر کرنا تو اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے ہاں عصمت عن الزلات کوئی عصمت

کی قسم ہو ہی نہیں سکتی لہٰذا مودودی صاحب کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے مفتی محمد یوسف صاحب کا عصمت عن الزلات کی قسم کا اختراع کرنا اور پھر تفہیمات میں مودودی صاحب کے نظریہ ''عصمت اٹھائے جانے'' کو عصمت عن الزلات پر محمول کرنا ایک علمی تلبیس ہے جس کا اہل السنّت کے عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور مفتی صاحب یہ بھی ملحوظ رکھیں کہ علمائے اہل السنّت والجماعت جس قسم کی بھی عصمت مانتے ہیں وہ ان کے نزدیک دائمی ہے جو نبوت و رسالت سے کسی طرح بھی منفک نہیں ہوسکتی۔ اور زَلت (لغزش) کے صدور کے باوجود بھی ان کی عصمت قائم رہتی ہے لیکن اس کے برعکس مودودی صاحب اور آپ عصمت عن الزلات کو بھی عصمت کی ایک قسم مانتے ہیں اور پھر اس عصمت کے اٹھ جانے کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور یہی آپ کا وہ عجوبہ روزگار نظریہ عصمت ہے جو کسی نے بھی اختیار نہیں کیا۔

لغزشوں کی تعداد کی بحث:

''مفتی محمد یوسف صاحب لغزشوں کی تعداد پر اعتراض'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:

''قاضی مظہر حسین صاحب نے الزامات اور اعتراضات کے شوق میں لغزشوں کی تعداد پر بھی ایک اعتراض داغ دیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

(۱) مودودی صاحب نے ڈاکٹر عبدالودود سے اپنی مراسلات میں چند لغزشوں کا ذکر کیا ہے جو دو سے زائد بھی ہوسکتی ہیں اور دوسری تصانیف میں یہ تصریح ملتی ہے کہ وہ پانچ ہیں۔ تو ''علمی جائزہ'' میں یہاں کس طرح دعویٰ کیا گیا ہے کہ مودودی صاحب نے دو لغزشوں سے زائد کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔ یہ تو صاف جھوٹ ہے اور اس غلط بیانی سے رجوع کر لینا چاہیے''۔

(۲) مودودی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہر نبی سے اللہ تعالیٰ نے

بالارادہ ایک دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہیں حالانکہ اہل سنت نے یہ تصریح نہیں کی کہ ہر نبی سے لغزش کا صدور ہوا ہے چہ جائیکہ دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہوں۔ پھر مفتی صاحب بعنوان ''یہ اعتراض کیسے تصنیف کیا گیا'' لکھتے ہیں۔ لیکن معترض صاحب نے اتنا بھی سوچ سمجھ اور غور وفکر سے کام نہ لیا کہ علمی جائزہ میں یہاں زیر بحث تمام تصانیف یا ان میں ذکر شدہ لغزشیں نہیں ہیں بلکہ صرف تفہیمات اور اس میں ذکر شدہ دو لغزشیں ہیں جن کا مولانا مدنی نے ذکر فرمایا ہے اور تفہیمات میں موضوع کے مطابق جو لغزشیں ذکر کی گئی ہیں، وہ دو سے زیادہ نہیں ہیں الخ۔

الجواب:

(ا) مفتی صاحب کچھ تو فہم وانصاف سے کام لیں آپ مودودی صاحب کی صفائی میں اپنی علمی دیانت کا بھی صفایا کر دیتے ہیں۔ آپ کی یہ تاویل میرے اعتراض کو اٹھا نہیں سکتی کیونکہ میرا اعتراض آپ کی اس عبارت پر ہے:

''نیز اہل السنّت نے لغزشوں پر کوئی حد بندی بھی قائم نہیں کی ہے۔ بلکہ مطلقاً ان کا صدور انبیاء سے جائز مانا ہے۔ اور مولانا مودودی نے صرف دو تک لغزشوں کا صدور تسلیم کیا ہے اور زائد کا انہوں نے ذکر تک نہیں کیا ہے۔ اس طرح مولانا مودودی کے عقیدہ عصمت میں دوسرے اہل السنّت کی بہ نسبت انتہائی احتیاط پائی جاتی ہے'' الخ۔ (علمی جائزہ ص ۸۱)

اس عبارت میں آپ نے عقیدہ اہل سنت اور عقیدہ مودودی کا موازنہ پیش کیا ہے اور جب بحیثیت عقیدہ کسی کے عقیدہ پر بحث کی جاتی ہے تو اس میں صرف ایک کتاب پر انحصار نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی ساری تصانیف پیش نظر رکھی جاتی ہیں۔ کیا آپ نے عقیدہ اہل سنت کو بھی کسی ایک کتاب میں منحصر کر رکھا ہے۔

(ب) اگر آپ کا مقصد یہاں تفہیمات کی عبارت ہوتی تو آپ اہل سنت کے مقابلے میں مودودی صاحب کی بیان کردہ صرف دو لغزشوں سے ان کے عقیدہ کی پاکیزگی ثابت نہ کرتے کیونکہ اگر مودودی صاحب کی دوسری تصانیف سے دو سے زائد لغزشوں کا ذکر ثابت ہو جائے تو پھر آپ کی مذکورہ تعلیل باطل ہو جائے گی۔ کہ مودودی صاحب چونکہ دو سے زیادہ لغزشوں کا صدور انبیاء علیہم السلام کے لئے نہیں مانتے اس لئے ان کا عقیدہ بہ نسبت اہل سنت کے زیادہ پاکیزہ ہے۔ لہٰذا آپ کی یہ تاویل بالکل غلط ہے کہ علمی جائزہ میں زیر بحث صرف تفہیمات میں ذکر شدہ دو لغزشیں ہیں۔

(ج) یہاں آپ نے اہل سنت کے مقابلہ میں مودودی عقیدہ عصمت کی برتری ثابت کرتے ہوئے شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ تسلیم کرلیا ہے کہ اہل سنت اور مودودی عقیدہ ایک نہیں ہے۔ مبارک ہو!

(د) زیر بحث مسئلہ میں بھی اہل سنت کے عقیدہ پر مودودی عقیدہ کی برتری ثابت نہیں ہوسکتی کیونکہ مودودی صاحب نے انبیاء علیہم السلام سے لغزشوں کا وقوع ضروری قرار دیا ہے خواہ ان کی تعداد دو ہو یا پانچ۔ لیکن علمائے اہل سنت صرف اتنا مانتے ہیں کہ انبیاء سے لغزشوں کا صدور ہوسکتا ہے لیکن ان سے لغزشوں کا وقوع ضروری نہیں مانتے۔ علاوہ ازیں مودودی صاحب کے نزدیک ہر نبی سے ایک دو لغزشوں کا صدور اللہ تعالیٰ خود کراتا ہے تاکہ لوگ ان کو خدا نہ سمجھ لیں، تو اب فرمائیے کہ اہل سنت کا عقیدہ زیادہ پاکیزہ ہے یا مودودی صاحب کا؟ ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔

بلکہ مودودی صاحب کا یہ عقیدہ بالکل فاسد ہے کہ ہر نبی سے ضرور لغزش ہونی چاہئے۔ کیا مفتی محمد یوسف صاحب کتاب وسنت سے اس پر کوئی دلیل پیش کرسکتے ہیں؟ کیا یہ اللہ تعالیٰ پر افتراء نہیں ہے کہ اس نے بالارادہ ہر نبی سے ایک دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہیں۔ ع بے ادب محروم گشت از فضل رب

بحث استغراق:

میں نے "علمی محاسبہ" میں یہ لکھا ہے کہ:

"مودودی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہر نبی سے اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ایک دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہیں حالانکہ اہل سنت نے یہ تصریح نہیں کی کہ ہر نبی سے لغزش کا صدور ہوا ہے چہ جائیکہ دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہوں"۔

اس کے جواب میں مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اسی طرح دوسرا اعتراض بھی محض شوق اعتراض پورا کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اس میں بھی یا تو علمی معیار کو نظر انداز کر دیا گیا ہے یا یہ اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ہر نبی کے لفظ سے ان کے نزدیک مراد استغراق حقیقی ہے حالانکہ یہاں مراد استغراق عرفی ہے نہ کہ حقیقی"۔

جواب الجواب:

(ا) ہر نبی کے لفظ سے اگر استغراق حقیقی نہ مراد لی جائے تو پھر مودودی صاحب کی یہ تعلیل غلط ہو جاتی ہے کہ:

"یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہوجانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں خدا نہیں ہیں"۔

(تفہیمات حصہ دوم ص ۴۳)

کیونکہ جب لغزشوں کے صدور کی علت اور حکمت ہی یہی بیان کی ہے کہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں تو پھر یہ تعلیل تب ہی درست ہوسکتی ہے کہ ہر ہر نبی سے لغزشیں سرزد ہوں ورنہ اگر کسی نبی سے لغزشیں سرزد نہ ہوں تو ان کو لوگ خدا سمجھ لیں گے۔ گویا کہ مودودی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ لوگ سب انبیاء کو خدا نہ سمجھ

لیں تو پھر ان کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ہر نبی سے لغزشیں سرزد ہوں لہٰذا یہاں استغراق حقیقی ہی مراد ہوسکتی ہے نہ کہ عرفی۔

ہماری گذارش ہے کہ مفتی صاحب اپنے پیر و مرشد ابوالاعلیٰ صاحب کی تعلیل کی غلطی مان لیں اور یا اس تعلیل کو صحیح ثابت کرنے کی مزید کوشش کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب کا یہ نکتہ لطیف نہیں بلکہ انتہائی کثیف ہے۔ اسی لئے شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی اس تعلیل کی تردید میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

''مودودی صاحب کا یہ ارشاد تا کہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ بھی بشر ہیں نہایت عجیب فلسفہ ہے۔ بشریت کے پہچاننے کے واسطے بھوک، پیاس، بیماریاں، نوم وغیرہ ظاہری لوازم بشریت کافی ہیں زلتیں اور معاصی کے صدور کی نہ ضرورت ہے، اور نہ ان کو ہر شخص محسوس کرسکتا ہے اور نہ یہ لوازمِ بشریت سے ہیں''۔ (مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت ص ۲۸)

(ب) ہر نبی کے لفظ سے استغراق حقیقی مراد نہ ہونے کی وجہ مفتی صاحب نے یہ بھی بیان کی ہے کہ:

''مزید برآں ہر نبی کے لفظ کو استغراق حقیقی کے معنوں میں لینا ممکن بھی نہیں ہے۔ کیونکہ تمام انبیاء کرام کی لغزشوں پر علم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے تمام انبیائے کرام کی تعداد معلوم ہو اور اس علم کے لئے قابل اعتماد ذرائع صرف دو ہیں۔ ایک قرآن کریم اور دوسرا حدیث رسولؐ .... تو آخر مولانا مودودی تمام انبیاء کی لغزشوں کا دعویٰ کس طرح کرسکتے ہیں الخ۔

(اتمام حجت قسط ۴ ص ۱۳)

الجواب:

(ا) یہ تو آپ ہی مودودی صاحب سے پوچھئے کہ حضرت والا! جب آپ تمام انبیاء

کی تعداد اور ان کے واقعات نہیں جانتے تو پھر ہر نبی کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے اور یہ علت کیوں بیان کی ہے کہ:

''تا کہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں خدا نہیں ہیں''۔

(ب) مودودی صاحب سے باادب یہ بھی دریافت کریں کہ آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ ''اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے ایک دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہیں'' کتاب وسنت سے اس کا ثبوت کہاں ملتا ہے؟

(ج) مفتی صاحب کی یہ تعلیل بھی انتہائی لغو ہے کہ لغزشوں کے صدور کا عقیدہ ماننے کے لئے تمام انبیاء کی تعداد اور ان کے واقعات کا علم ضروری ہے۔ کیونکہ انبیائے کرام کے متعلق کسی عقیدہ کے تسلیم کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ان سب کی تعداد بھی معلوم ہو۔ ورنہ یہ عقیدہ بھی اختیار نہیں کیا جاسکتا کہ تمام انبیاء معصوم ہیں اور ان سے گناہوں کا صدور نہیں ہوا ہے۔

کیا مفتی صاحب نے عصمت عن المعاصی کا عقیدہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد اور ان کے سارے واقعاتِ حیات کا علم حاصل کر کے اختیار کیا ہے۔ مفتی صاحب بدحواسی میں عجیب بیگانہ باتیں ارشاد فرما دیتے ہیں۔

عصمت کے عطائی ہونے کی بحث:

مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''علمی جائزہ میں تفہیمات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کا تیسرا جز اس طرح ذکر کیا ہے: یہ عصمت عطائی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی نے انہیں عطا فرمائی ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے اللہ تعالیٰ کی حفاظت ان سے اٹھ جائے تو عام انسانوں کی طرح ان سے بھی بھول چوک اور لغزش ہوسکتی ہے ____ لیکن عبارت کا یہ واضح مطلب نہ سمجھتے ہوئے قاضی صاحب موصوف نے اس پر چند در چند

اعتراضات کئے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ علمی بصیرت رکھنے والے کسی صاحب فہم کی طرف سے بھی کئے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ جتنے اعتراضات یہاں وارد کئے گئے ہیں سب کی بنیاد اس غلط مفروضہ پر رکھی گئی ہے کہ عبارت کا یہاں اصلی مقصد یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے یہ عصمت اٹھائی گئی ہے حالانکہ یہ ہرگز اس عبارت کا مقصد نہیں بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ انبیاء کی عصمت عطائی ہے نہ کہ ذاتی۔ اور اسی مقصد کے لئے عقلی اور نقلی دلائل لائے گئے ہیں۔ مقصد کی اس مختصر وضاحت کے بعد ذیل میں قاضی صاحب کے اعتراضات واشکالات ملاحظہ فرمائیں۔

ان کا پہلا اعتراض ہے کہ:

''اس میں کسی کو انکار نہیں کہ نبوت اور عصمت دونوں عطائی ہیں لیکن عطائی ہونے سے یہ کیسے لازم آگیا کہ اللہ تعالیٰ عطا کرنے کے بعد ان کو سلب بھی کر لیتا ہے۔''

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ: ''نیز اگر عصمت اٹھائی جانے کی علت عطائی ہونا ہے تو پھر نبوت بھی اٹھائی جانی چاہئے کیونکہ وہ بھی عطائی ہے الخ

(اتمام حجت قسط نمبر ۵ ص ۱۰)

الجواب:

(ا) جب عصمت اور نبوت کے عطائی ہونے میں کسی اہل حق کا اختلاف نہیں ہے اور نہ یہ مسئلہ زیر بحث تھا تو آپ نے علمی جائزہ میں کس ضرورت کے تحت عصمت کے عطائی ہونے پر دلائل قائم کر کے اس موضوع کو قریباً چھ صفحات تک پھیلا دیا ہے۔ کیا محض شوق تحقیق مقصود تھا۔ اب آپ کتنی ہی تاویلات کریں بوقت تحریر آپ کا مقصود اس بحث سے اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا کہ مودودی صاحب نے جو عصمت اٹھائے جانے کا قول

لکھا ہے اس کے توحش کو اس طرح دور کیا جائے کہ جب عصمت عطائی ہے تو اس کے اٹھائے جانے میں کیا حرج ہے۔ اسی غرض کے تحت آپ نے امام رازی اور علامہ آلوسی کی عبارتیں پیش کی ہیں۔ اور پھر اپنے تبصرہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ:

''اس جواب میں علامہ سید آلوسیؒ نے اس حقیقت کا انکشاف کر دیا اور اس کو صحیح بھی قرار دے دیا ہے کہ انبیاء کی عصمت ان کی ذاتی صفت نہیں جو ذات کے ساتھ لازم ہو کر کسی وقت اور کسی حالت میں بھی ان سے منفک نہ ہوسکے۔ . . . اور جب یہ ذاتی صفت ہونے کے بجائے عطائی نعمت قرار پائی تو ماننا پڑے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ ان سے تھوڑی دیر کے لئے اپنی حفاظت کو اٹھائے تو ہوسکتا ہے کہ ان سے کوئی لغزش سرزد ہوجائے''۔

(علمی جائزہ ص ۷۲)

فرمائیے خط کشیدہ الفاظ سے کیا آپ کا مقصد مودودی صاحب کے داغدار دامن کو بے داغ ثابت کرنے کی ایک فضول علمی کاوش نہیں ہے؟

(ب) علامہ آلوسیؒ جس عصمت کی بحث کر رہے ہیں وہ عصمت عن المعاصی ہے نہ کہ مودودی صاحب کی مفروضہ عصمت عن الزلالت۔ اور آپ نے علامہ موصوف کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے یہاں تشریح کر دی ہے کہ ''انبیاء کی عصمت ان کی ذاتی صفت نہیں جو ذات کے ساتھ لازم ہو کر کسی وقت اور کسی حالت میں بھی ان سے منفک ہوسکے''۔ حالانکہ اتمام حجت قسط ۴ ص ۱۲ میں آپ مودودی صاحب کا عقیدہ ان الفاظ میں لکھ چکے ہیں کہ:

''دوسرے اہل علم کی طرح مولانا مودودی کے نزدیک بھی جو عصمت لازم نبوت ہے۔ وہ عصمت ہے گناہوں سے، یہ نہ مولانا کے نزدیک قابل ارتفاع ہے اور نہ اس کے ارتفاع کا مولانا نے قول کیا ہے کہ اس کے نتیجہ میں

گناہ سرزد ہوں۔'' الخ

یعنی عطائی ہونے کی وجہ سے علامہ آلوسیؒ کی عبارت سے تو آپ گناہوں سے عصمت کو قابل انفکاک مان رہے ہیں اور اتمام حجت کی عبارت میں آپ اس کو نا قابل ارتفاع و انفکاک تسلیم کر رہے ہیں۔ تو ان دونوں میں صحیح بات کون سی ہے اور غلط کون سی؟

آپ کی یہ علمی تضاد بیانی آخر کس پریشانی کی وجہ سے ہے؟ علاوہ ازیں علامہ آلوسیؒ کی عبارت کا حوالہ پیش کر کے یہ تسلیم کرلیا کہ تفہیمات میں اس عصمت کے اٹھائے جانے کی بحث ہے جو علامہ آلوسیؒ کی عبارت میں مقصود ہے اور ظاہر ہے کہ علامہ آلوسی کی مراد عصمت عن المعاصی ہے نہ کہ عصمت عن الزلات۔

(ج) میرے اعتراضات کے جواب میں آپ کی مذکورہ تاویلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ انبیائے کرام سے عصمت اٹھائے جانے کا امکان مانتے ہیں نہ کہ وقوع۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ جب مودودی صاحب تفہیمات میں عصمت اٹھائے جانے کا وقوع مان رہے ہیں تو پھر آپ ان کی تائید کس بنا پر کر رہے ہیں اور عصمت کے عطائی ہونے کے مسئلہ کو کیوں زیر بحث لے آئے ہیں؟

نیز مفتی محمد یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ:

پھر حیرت یہ ہے کہ جب عصمت فریقین کے نزدیک بالاتفاق عطائی قرار پائی تو کسی ذی عقل انسان کو یہ بات تسلیم کرنے میں کیا تامل ہوسکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کو اٹھادے تو لغزش کا صدور ممکن ہے۔ (اتمام حجت قسط ۵ ص ۱۰)

الجواب:

یہ آپ کی ایک تلبیس ہے۔ کسی اہل عقل کو اس کے امکان میں اختلاف کب ہوا ہے کہ آپ یوں طعنہ دے رہے ہیں کہ کیا امکان کے لئے وقوع ضروری ہے۔

اعتراض تو یہ ہے کہ مودودی صاحب اس کا وقوع مان رہے ہیں۔ کیونکہ تفہیمات میں انہوں نے یہ لطیف نکتہ صاف لکھ دیا ہے کہ:

''اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہیں''۔ پھر آپ کیوں خواہ مخواہ مدعی سست اور گواہ چست کا مصداق بن رہے ہیں۔

ایک اور تلبیس:

قسط مذکور ص ۲۳ پر مفتی صاحب لکھتے ہیں:

اس اعتراض ۲ کے جواب میں بفرض محال اگر مان بھی لیا جائے کہ مذکورہ عبارت میں عصمت اٹھائے جانے کے لئے عصمت عطائی ہونا بیان کیا گیا ہے پھر بھی اس سے یہ بات کیسے لازم آتی ہے کہ نبوت بھی عصمت کی طرح اٹھائی جائے یا اٹھائی جانی چاہئے کیونکہ نبوت کے متعلق کتاب اللہ اور احادیث رسول میں یہ ذکر کہیں بھی نہیں آیا ہے کہ وہ بھی عصمت کی طرح کسی وقت خدا کے کسی نبی سے اٹھائی گئی ہے اس لئے باوجود عطائی ہونے کے اس کے ارتفاع کا قول نہیں کیا جاسکتا۔''

الجواب: (ا) کیا قرآن و حدیث میں عصمت اٹھائے جانے کا کہیں ذکر آیا ہے؟ اور اگر آپ یہ کہیں کہ لغزشوں کے صدور کا ذکر ہے تو ہم کہتے ہیں کہ لغزشوں کے صدور کے وقت بھی عصمت قائم رہتی ہے۔

(ب) یہی تو ہمارا اعتراض ہے کہ اگر آپ عصمت کے اٹھائے جانے کو تسلیم کریں گے تو اس سے نبوت کا اٹھالیا جانا بھی خود بخود لازم آجائے گا کیونکہ نبوت کے لئے عصمت لازم ہے۔ لازم و ملزوم میں انفکاک و ارتفاع نہیں ہوسکتا۔ اگر عصمت ہے تو نبوت باقی ہے اور اگر عصمت نہیں تو نبوت بھی ختم ہوگئی۔

مفتی صاحب میرے پیش کردہ اعتراضات سے اتنے گھبرائے ہوئے ہیں کہ مکرر وسہ کرر ایک ہی بات بیان کر رہے ہیں۔ قسط نمبر ۵ میں جو مضمون ہے اسی کا اعادہ قسط نمبر ۶ میں ہے بلکہ قسط نمبر ۷ کا نصف بھی اسی بحث کی نذر کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی مفتی صاحب موصوف کی قلبی پریشانی کو دور فرما سکتے ہیں۔ ہم نے تو احقاقِ حق کرنا ہی ہے۔

اپنی پاک دامنی:

قسط نمبر ۷ ص ۹ میں مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''میں نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اپنے علم کی حد تک اسے درست جان کر اور اپنی ضمیر کی آواز پر اسے حق سمجھ کر لکھا ہے'' الخ۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن جب آپ حضرت داؤد علیہ السلام جیسی معصوم شخصیتوں کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ان کے فعل میں خواہش نفس کا دخل تھا۔ تو آپ کی ضمیر و نیت کیونکر نفسانیت اور مودودی عصبیت سے پاک مانی جا سکتی ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کے فریضہ رسالت کی بحث:

مفتی محمد یوسف صاحب قسط نمبر ۸ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ:

''واضح رہے کہ مولانا مودودی تفہیم القرآن جلد دوم کے نئے ایڈیشن میں سے یہ فقرہ بالکل حذف کر چکے ہیں کہ: ''حضرت یونس سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں''۔ اس کے بجائے انہوں نے یہ عبارت درج کر دی ہے کہ:

''بات وہی صحیح معلوم ہوتی ہے جو مفسرین قرآن نے بیان کی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام عذاب کی اطلاع دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اپنا مستقر چھوڑ کر چلے گئے تھے''۔ اگر مودودی صاحب نے تفہیم القرآن کے نئے ایڈیشن میں یہ قابل اعتراض عبارت: ''حضرت یونس علیہ

السلام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں''۔ غلط سمجھ کر حذف کی ہے تو پھر اس عبارت کی وجہ سے ہمارا جو اعتراض تھا وہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن مفتی صاحب نے چونکہ حذف کردہ عبارت کی تائید میں پھر دلائل پیش کئے ہیں اس لئے ان کے جوابات ہمارے ذمہ ہیں۔

(ب) لیکن مودودی صاحب نے تفہیم القرآن کی عبارت میں جو یہ عبارت باقی رکھی ہے ''پس جب نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کر گیا''۔ تو اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مودودی صاحب حضرت یونس علیہ السلام کی فریضہ رسالت میں کوتاہیوں کو صحیح مانتے ہیں۔

وقت مقرر کرنے کا مسئلہ:

مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں لکھا ہے کہ ''پس جب نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کر گیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود اپنی جگہ سے ہٹ گیا الخ۔ اس پر میں نے یہ سوال پیش کیا تھا کہ:

مفتی محمد یوسف صاحب کو چیلنج ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کے لئے کوئی وقت مقرر فرمایا تھا اور اگر یہ ثابت نہ کر سکیں اور انشاء اللہ کبھی بھی ثابت نہیں کر سکیں گے تو مودودی صاحب کے اس الزام سے براءت کا اعلان کریں جو نہ صرف حضرت یونس علیہ السلام بلکہ خدا پر بھی مودودی صاحب نے افتراء کیا ہے''۔

اس کے جواب میں مفتی صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ:

وقتِ مقرر سے اگر قاضی صاحب کی مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس کے لئے وقت کا تقرر اس معنی میں کیا تھا کہ اتنے سال یا ماہ یا ہفتے اور یا اتنے دن تک آپ قوم میں رہ کر تبلیغ کریں گے تو ہم مانتے ہیں کہ اس طرح کا تقرر نہیں ہوا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرح کے معین وقت کا دعویٰ آخر کس نے کیا ہے؟

الجواب:

یہ دعویٰ مودودی صاحب کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ:

"اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود اپنی جگہ سے ہٹ گیا" آخر اردو محاورہ میں اللہ کے مقرر کردہ وقت کے الفاظ کی کیا مراد لی جائے گی۔

علاوہ ازیں مفتی صاحب فرماتے ہیں: ثانیاً آپ کو یہ علم کہاں سے حاصل ہوا ہے کہ حضرت یونس کے لئے خدا نے کوئی وقت مقرر نہیں فرمایا تھا۔ الخ

الجواب:

مفتی صاحب کا ہم پر یہ سوال بھی نہایت کم فہمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ آپ وقت مقرر کئے جانے کے مدعی ہیں۔ اور ہم اس کی نفی کرتے ہیں۔ ثبوت مدعی کے ذمہ ہوتا ہے نہ کہ معترض اور مانع کے۔ جب تک ہمارے پاس اس بات کا قطعی ثبوت نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کے لئے کوئی وقت مقرر کیا تھا۔ ہم اگر اس کا انکار کریں تو موردِ الزام نہیں ٹھہر سکتے۔ مفتی صاحب کی یہ جھنجھلاہٹ کب تک رہے گی۔ فہم وشعور سے اتنی جلدی کیوں عاری ہو گئے؟

قرآنی حقیقت:

اس عنوان کے تحت مفتی صاحب ایک دوسرے پہلو سے جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"قرآن کریم سے انبیائے کرام کی جو تاریخ معلوم ہوئی ہے اس سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اپنے تبلیغی مشن اور دعوتی کام میں خدا کی طرف سے مامور ہوتے ہیں اور تبلیغ دین کے تمام مراحل میں ابتداء سے انتہا تک وہ حکم الٰہی کے منتظر رہتے ہیں اور جب تک خدا کی طرف سے نئی ہدایت اور جدید حکم نہیں پہنچتا وہ سابقہ احکام کے تحت تبلیغ دین کے کام جاری رکھنے پر مامور رہتے ہیں۔ اس طرح خود بخود ان کا سارا وہ وقت تبلیغ دین کے فرائض انجام دینے کے لئے مقرر قرار پاتا ہے۔ جس میں ابھی تک نئی ہدایت اور جدید

حکم نہ پہنچا ہو۔ . . . . اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت یونس کا حکم ہجرت ملنے سے پہلے نکل جانا وقت مقرر سے پہلے تھا۔ لہٰذا مفسرین کرام کا یہ کہنا بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام وقت مقررہ سے قبل بطور خود اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ الخ

الجواب:

(ا) اگر مودودی صاحب کے نزدیک بھی یہی حقیقت مراد تھی تو اس کی ادائیگی کے لئے یہ الفاظ مناسب نہیں معلوم ہوتے کہ: "اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے الخ

(ب) آپ نے مفسرین کرام کی طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ انہوں نے بھی وقت مقررہ کے الفاظ لکھے ہیں۔ کیا آپ اس کے لئے کوئی صحیح حوالہ پیش کر سکتے ہیں؟ حالانکہ مفسرین نے اس جگہ جو کچھ لکھا ہے وہ صرف یہی ہے کہ "حضرت یونس علیہ السلام نے اللہ کے حکم کا انتظار نہیں کیا"۔ چنانچہ یہاں تفسیر روح المعانی کی عربی عبارات کا ترجمہ مودودی صاحب کے الفاظ میں ہم پیش کرتے ہیں جو مفتی محمد یوسف صاحب نے علمی جائزہ میں مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن سے نقل کیا ہے۔

(۱) علامہ آلوسی لکھتے ہیں: حضرت یونس کا اپنی قوم سے ناراض ہو کر نکل جانا ہجرت کا فعل تھا۔ مگر انہیں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا (روح المعانی جلد ۱۷ ص ۷۷) یعنی میں قصوروار تھا کہ انبیاء کے طریقے کے خلاف حکم آنے سے پہلے ہجرت کرنے میں جلدی کر بیٹھا۔ یہ حضرت یونس علیہ السلام سے اپنے گناہ کا اعتراف اور توبہ کا اظہار تھا۔ تا کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس مصیبت کو دور کر دے۔ (ایضاً روح المعانی ص ۷۸)

(۲) علاوہ ازیں مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ:

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا حاشیہ اس آیت پر یہ ہے کہ ____ کہ وہ

اپنی قوم پر جب کہ وہ ایمان نہ لائی خفا ہو کر چل دیئے اور قوم پر سے عذاب ٹل جانے کے بعد بھی خود واپس نہ آئے اور اس سفر کے لئے ہمارے حکم کا انتظار نہ کیا۔“ (بیان القرآن)

(۳) ”اسی آیت پر مولانا شبیر احمد عثمانی حاشیہ میں فرماتے ہیں:
قوم کی حرکات سے خفا ہو کر غصے میں بھرے ہوئے شہر سے نکل گئے۔ حکم الٰہی کا انتظار نہ کیا۔ اور وہ وعدہ کر گئے کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آئے گا۔ . . .
انی کنت من الظلمین اپنی خطا کا اعتراف کیا کہ بے شک میں نے جلدی کی کہ تیرے حکم کا انتظار کئے بغیر بستی والوں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔“

۴۔ علامہ آلوسی اذ ابق الی الفلک المشحون پر لکھتے ہیں:
”ابق کے اصل معنی آقا سے فرار ہونے کے ہیں۔ چونکہ حضرت یونس اپنے رب کے اذن کے بغیر اپنی قوم سے بھاگ نکلے تھے اس لئے اس لفظ کا اطلاق ان پر درست ہوا“۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں جب تیسرا دن ہوا تو حضرت یونس اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نکل گئے الخ (روح المعانی ج ۲۲ ص ۱۳۰)

۵۔ مولانا شبیر احمد صاحب وھو ملیم کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
”الزام یہی تھا کہ خطائے اجتہادی سے حکم الٰہی کا انتظار کئے بغیر بستی سے نکل پڑے اور عذاب کے دن کی تعیین کر دی“۔

مندرجہ بالا عبارتیں مع حوالہ جات کے خود مودودی صاحب کی ہیں جو میں نے ”علمی جائزہ“ ص ۱۱۱۔۱۱۳ سے نقل کی ہیں۔ یہاں امام رازی کی عبارت کا حوالہ میں نے قصداً حذف کر دیا کیونکہ امام موصوف کی عبارت مستقل طور پر پہلے سے زیر بحث ہے۔ جس پر آئندہ صفحات میں کلام کیا جائے گا۔ بقیہ جو عبارتیں مودودی صاحب نے پیش کی ہیں ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے حکم الٰہی کا انتظار نہیں

کیا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حق تعالیٰ نے ان کے لئے قوم میں ٹھہرنے کا کوئی وقت مقرر کیا ہوا تھا کہ وقت مقررہ کے بعد اگر جاتے تو لغزش نہ سمجھی جاتی۔ مگر حضرت یونس علیہ السلام مقررہ وقت سے چونکہ پہلے چلے گئے اس لئے ان سے یہ لغزش ہوگئی۔

(ب) اگر وقت مقرر ہوتا اور آپ اس سے پہلے چلے جاتے تو مفسرین یہ نہ لکھتے کہ آپ نے حکم خداوندی کا انتظار نہ کیا بلکہ یہ لکھتے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کیا اور قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے قوم میں سے نکل کر جانے کے لئے اجازت خداوندی کو ضروری نہ سمجھا، اسی لئے حکم الٰہی کا انتظار نہ کیا۔ حالانکہ آپ کے لئے بہتر یہ تھا کہ اجازت خداوندی کا انتظار کرتے اور پھر ضروری اس لئے نہ سمجھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نہیں ملا تھا کہ عذاب آنے تک قوم میں ٹھہرنا ہے اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگر آپ کا آخر دم تک قوم میں ٹھہرنا واجب ہوتا اور آپ پہلے چلے جاتے تو (نعوذ باللہ) بقول مودودی اتمام حجت نہ کرنے کی وجہ سے قوم پر عذاب نہ نمودار ہوتا۔ لہٰذا عذاب کا نمودار ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے قوم پر اتمام حجت بھی کر دیا اور فریضہ رسالت میں کوتاہی بھی نہیں کی۔ نیز ہم کہتے ہیں کہ اگر مودودی صاحب کے نزدیک انبیاء کرام کے واقعات میں مراد صرف خلاف اولیٰ امور ہیں تو پھر مودودی صاحب کا یہ لکھنا بھی بالکل غلط ہے کہ ترک اولیٰ کی وجہ سے اتمام حجت نہ کر سکے کیونکہ ترکِ اولیٰ کی وجہ سے اتمامِ حجت میں تو فرق نہیں پڑتا اور اگر بالفرض آپ کے لئے وقت مقرر کیا جاتا اور پھر آپ اس سے پہلے چلے جاتے تو یہ لغزش نہ ہوتی بلکہ صریح نافرمانی ہوتی۔

(ج) مفتی صاحب نے قرآن حکیم سے جو انبیائے کرام کے واقعات سے یہ ثابت کیا ہے کہ انہوں نے اجازت خداوندی کے بغیر قوم کو نہیں چھوڑا۔ تو ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا حضرت یونس علیہ السلام کو انبیائے کرام کی یہ تاریخ معلوم تھی اور پھر کیا آپ نے یہ سمجھا ہوا تھا کہ اجازتِ خداوندی کے بغیر نکلنا جائز نہیں اور اگر انبیائے کرام کی یہ تاریخ

آپ کو معلوم بھی ہو تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اجازت الٰہی کے بغیر جانا گناہ تھا۔
ان سب پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے انصاف کی بات یہی ہے کہ آپ کی لغزش یہی تھی کہ حکم الٰہی کا انتظار نہیں کیا اور مفسرین نے بھی یہی وجہ لکھی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے کوئی وقت مقرر کیا ہوا تھا۔ خواہ آپ وقت مقررہ کا جو معنی اختیار کرلیں۔

کیا حضرت یونس علیہ السلام کا یہ فعل گناہ تھا:

علامہ آلوسیؒ کی عربی عبارت میں ذنب کا لفظ ہے لیکن اس کا ترجمہ مودودی صاحب نے بجائے لغزش کے گناہ کیا ہے۔ اس سے مودودی صاحب تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کا یہ فعل گناہ تھا۔ اس کے بعد مفتی محمد یوسف صاحب کی اس صفائی کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے کہ مودودی صاحب انبیائے کرام کو گناہوں سے معصوم مانتے ہیں جیسا کہ مفتی صاحب یہ لکھ چکے ہیں کہ:

''انبیاء علیہم السلام گناہوں سے معصوم ہیں'' (اتمام حجت قسط نمبر ۴ ص ۱۲)

(ب) اور جب خود مفتی صاحب یہ لکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم میں انبیائے کرام کی جو لغزشیں مذکور ہیں وہ گناہ نہیں بلکہ ترکِ اولیٰ امور ہیں۔ تو اگر یہ سچ ہے تو مودودی صاحب کو کس بات نے مجبور کیا ہے کہ وہ ذنب کا ترجمہ گناہ لکھیں جبکہ ایک جگہ انہوں نے خود یہ تسلیم کیا ہے کہ: ذنب کا لفظ عربی زبان میں صرف گناہ کے لئے ہی نہیں آتا بلکہ قصور اور کوتاہی کے لئے بھی آتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام بے شک گناہوں سے بچے ہوئے تھے مگر لغزشیں اور کوتاہیاں ان سے بھی ہوجاتی تھیں۔ (مکاتب زندان ص ۲۲)

''تو باوجود اس کے کہ زیر بحث یہی مسئلہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام گناہوں سے معصوم ہیں اور حضرت یونس علیہ السلام نے فریضہ رسالت میں کوتاہیاں کی ہیں یا نہیں تو پھر مودودی صاحب کا تفسیر روح المعانی سے لفظ ذنب کا ترجمہ گناہ سے کرنا انتہائی تلبیس

ہے اور مفتی محمد یوسف صاحب نے بھی اپنے امام مودودی کی تقلید میں یہ لکھ دیا کہ:

''اس طرح علامہ سید آلوسی بھی توہین انبیاء کے مرتکب اور عصمت الانبیاء کے منکر ٹھہریں گے کیونکہ انہوں نے بھی یہاں ایک آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت یونس کی طرف ذنب (گناہ) کی نسبت کی ہے''۔ نیز لکھتے ہیں کہ ____

''لیکن اگر معترضین حضرات کے نزدیک امام مجاہد اور علامہ سید آلوسی ذنب اور گناہ کی نسبت کرنے پر نہ توہین انبیاء کے مرتکب ہوئے ہیں اور نہ عصمت الانبیاء کے منکر تو مولانا مودودی کو بھی کوتاہیوں کی نسبت کرنے پر نہ توہین انبیاء کا مرتکب قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ عصمت الانبیاء کا منکر کیونکہ نبی سے کوتاہی کا ہونا جرم اور گناہ نہیں ہے۔ (علمی جائزہ ص ۱۳۷)

الجواب:

علامہ آلوسیؒ اور امام مجاہدؒ نے تو لفظ ذنب لکھا ہے جس کا معنی گناہ نہیں ہے تو پھر آپ نے ان اکابر پر یہ کیوں بہتان لگایا ہے کہ انہوں نے انبیاء کی طرف گناہ کی نسبت کی ہے۔ یہ الزام آپ تب لگا سکتے تھے جب آپ یہ ثابت کرتے کہ ذنب بمعنی گناہ ہی آتا ہے اور لغزش کے لئے ذنب کا لفظ مستعمل نہیں ہے۔

ذنب کے معنی کی تحقیق:

امام راغب اصفہانیؒ ذنب کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ویستعمل فی کل فعل یستوخم عقباہ (المفردات فی غریب القرآن)

یعنی ذنب کا لفظ ہر ایسے فعل پر بولا جاتا ہے جس کا انجام ناموافق ہو۔

۲۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ عصمت انبیاء کی بحث میں لکھتے ہیں کہ: ____ ''ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیان تک کو شامل ہے اس لئے کسی نبی کو اگر خدا کی

طرف سے استغفارِ ذنب کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کے معنی صریح عصیان و گناہ کے نہیں بلکہ یہی انسانی بھول چوک اور فروگذاشت ہے جس کی اصلاح وتنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم اور لطف وعنایت سے فرماتا رہتا ہے۔ اور اسی کے لئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے''۔ اور حاشیہ میں فرائد اللغۃ فی الفروق کا حوالہ لکھا ہے کہ: وبین الاثم والذنب فرق من حیث ان الذنب مطلق الجرم عمداً کان او سھوا بخلاف الاثم فانہ ما یستحق فاعلہ العقاب فیختص بما یکون عمداً (سیرت النبی جلد۴ص ۱۰۷)'' اور اثم اور ذنب کے درمیان یہ فرق ہے کہ ذنب مطلقاً جرم کے لئے آتا ہے۔ خواہ وہ عمداً ہو یا سہواً (بھول سے) بخلاف اثم کے کہ اس کا کرنے والا سزا کا مستحق ہوتا ہے اور اثم اسی فعل کو کہتے ہیں جو قصداً کیا جائے''۔

اس سے بھی یہی ثابت ہوا کہ ذنب کا لفظ اس فعل پر بھی بولا جاتا ہے جو بھول چوک سے سرزد ہو جائے۔ لہٰذا مفتی محمد یوسف صاحب کا مودودی صاحب کی تائید میں روح المعانی وغیرہ کی عربی عبارت میں لفظ ذنب کا ترجمہ یہاں گناہ کرنا انبیائے کرام کی عصمت کو داغدار بنانے کی ایک ناجائز کوشش ہے۔ واللہ الھادی

کیا حضرت یونس بے صبر تھے؟

''مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ: غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا''۔ اس پر میں نے علمی محاسبہ میں لکھا تھا کہ:

''حضرت یونس علیہ السلام نے بے صبری کی وجہ سے اپنا مقام نہیں چھوڑا بلکہ انہوں نے اس میں اجتہاد سے کام لیا اور عذاب الٰہی کی خبر دینے کے بعد قوم میں ٹھہرنا ضروری نہ سمجھا یہ جدا بات ہے کہ اس اجتہاد میں آپ سے لغزش ہوگئی کیونکہ آپ کے لئے بہتر یہ تھا کہ بلا اذنِ خداوندی وہاں سے نہ جاتے''۔ اس

کے جواب میں مفتی محمد یوسف صاحب نے اتمام حجت قسط نمبر ۸ میں لکھا ہے کہ:

(۱) اگر حضرت یونس بے صبری کی وجہ سے نہیں چلے گئے تھے تو قرآن مجید میں ان کے حق میں یہ الفاظ کیوں استعمال کئے گئے ہیں اذ ابق الی الفلک المشحون کیا صبر کے ہوتے ہوئے ان کو عبدِ آبق کہنا درست ہوسکتا ہے۔

(۲) یہ بھی بتلائیں کہ سورۃ قلم میں حضور کو مخاطب کر کے جو فرمایا گیا ہے فاصبر لحکم ربک ولا تکن کصاحب الحوت. اس میں حضور کو صبر کا حکم دے کر لا تکن کصاحب الحوت ''مچھلی والے (حضرت یونس) کی طرح مت بنو'' کیوں کہا گیا ہے، کیا قرآن جیسی بلیغ وفصیح کتاب میں اس جملہ کا ذکر معاذ اللہ بے محل اور بے معنی کیا گیا ہے؟ یا ہم یہ سمجھیں کہ قرآن کریم میں بھی غیر ضروری اور منافی بلاغت چیزیں پائی جاتی ہیں۔ الخ

الجواب:

(۱) اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو ہر صفت میں کمال عطا کیا ہے اگر صبر مومنین کے لئے ایک کمال ہے تو تمام انبیائے کرام کو صبر بھی اعلیٰ واکمل طور پر نصیب ہوا ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا فصبر جمیل اور جس شخص کو ہم بے صبر کہیں گے اس کو صابر کامل نہیں کہہ سکتے۔ تو کیا مودودی صاحب اور مفتی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کو صابرین کی فہرست سے نکال دیا جائے۔ اگر معصوم پیغمبر صابر نہیں تو پھر کوئی امتی بھی صابر نہیں ہوسکتا، اسی بنا پر میں نے بے صبری کے لفظ پر اعتراض کیا۔ کیونکہ ہمارے محاورات میں کسی کو بے صبر کہنے سے اس کی تنقیص لازم آتی ہے بلکہ اگر مودودی صاحب کے متعلق بے صبر کے الفاظ لکھے جائیں تو ان کے معتقدین اس کو ان کی تنقیص وتوہین قرار دیں گے۔ لیکن حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق بے صبر کے الفاظ استعمال کرنے میں ان کو ذرا ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوتی حالانکہ خود اللہ تعالیٰ نے

اپنے انبیاء ورسل کے صابر ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔

ولقد کذبت رسل من قبلک فصبروا علیٰ ما کذبوا واوذوا حتیٰ اتاهم نصرنا (سورۃ الانعام ع ۴) ''اور بے شک تحقیق آپ سے پہلے پیغمبروں کو جھٹلایا گیا۔ پس انہوں نے قوم کے جھٹلانے پر صبر کیا حتیٰ کہ ان کو ہماری نصرت پہنچ گئی''۔

اس آیت کی تفسیر میں امام رازی لکھتے ہیں: فذکر فی هذه الآیة طریق آخر عن ازالة الحزن عن قلبه وذلک بان بین ان سائر الامم عاملوا انبیاء هم بمثل هذه المعاملة وان اولئک الانبیاء صبروا علیٰ تکذیبهم وایذاء هم حتیٰ اتاهم النصر والفتح والظفر وانت اولیٰ بالتزام هذه الطریقة لانک مبعوث الی جمیع العالمین فاصبر کما صبروا تظفر کما ظفروا (تفسیر کبیر)

''پس اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب سے غم کو دور کرنے کے لئے ایک دوسرا طریقہ ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ تمام امتوں نے اپنے اپنے انبیاء سے اسی طرح کا معاملہ کیا ہے اور بے شک ان پیغمبروں نے ان کی تکذیب اور ایذا پر صبر کیا۔ حتیٰ کہ ان کو ہماری طرف سے مدد فتح اور کامیابی پہنچی اور آپ کے لئے تو یہ طریقہ صبر زیادہ لازمی ہے۔ کیونکہ آپ تمام جہانوں کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔ پس آپ اسی طرح صبر کریں جس طرح ان انبیاء نے کیا۔ آپ بھی ظفریاب ہوں گے جس طرح وہ ظفریاب ہوئے ہیں''۔

فرمایئے! امام رازی کی اس تشریح کے تحت کیا حضرت یونس علیہ السلام ان انبیائے صابرین کی فہرست میں شامل نہیں ہیں''۔

۲۔ انبیائے کرام علیہم السلام کی رفعت شان کے پیش نظر اگر ان سے کسی معاملہ میں ذرا سی بھی لغزش ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب آمیز خطاب ہوتا ہے۔

چنانچہ (ا)

حضرت آدم علیہ السلام نے گونسیان (بھولنے) کی وجہ سے شجر ممنوعہ کا پھل کھایا تھا۔ فنسی آدم ولم نجد له عزماً۔ پس حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے اور ہم نے ان کا ارادہ نہیں پایا''۔ لیکن قرآن میں اس فعل کو عصیان اور غوایت سے تعبیر کیا گیا وعصیٰ آدم ربه فغویٰ حالانکہ حضرت آدم سے حقیقتاً معصیت اور نافرمانی سرزد نہیں ہوئی تھی کیونکہ معصیت اور نافرمانی وہ ہے جو قصد وارادہ سے کی جائے۔

(ب) نبی کریم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کی تدبیر سے متاثر ہوکر یہ قسم کھائی تھی کہ آئندہ شہد نوشی نہیں فرمائیں گے لیکن اس پر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں خطاب فرمایا یا ایها النبی لم تحرم ما احل الله لک تبتغی مرضات ازواجک (اے میرے نبی! آپ اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جس کو آپ کے لئے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے۔ آپ اپنی بیویوں کی مرضی چاہتے ہیں''۔ فرمایئے! کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دیا تھا اور کیا محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے ہی یہ قسم کھائی تھی؟ حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھا کہ اگر شہد میں مغافیر کے پھولوں کی کچھ بدبو بھی ہوتی ہے تو آئندہ نہیں کھاؤں گا لیکن اس کو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ الفاظ میں تعبیر فرمایا۔ مفتی صاحب! آپ یہاں بھی لم تحرم وغیرہ الفاظ قرآنی میں کوئی توجیہ وتاویل کرتے ہیں یا نہ؟

(ج) اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کی یہ خصوصیت بیان فرمائی ہے کہ الذین یبلغون رسالت الله ویخشونه ولا یخشون احداً الا الله (الاحزاب)

''جو اللہ تعالیٰ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ کے کسی سے بھی نہیں ڈرتے''۔ حالانکہ اسی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے امام الانبیاء والمرسلین کے متعلق یہ فرمایا۔ وتخشی الناس (آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں) تو یہاں

بھی آپ کوئی توجیہ کرتے ہیں یا نہ؟ ورنہ نعوذ باللہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کی یہ خصوصیت فرمائی ہے کہ وہ سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم از روئے قرآن لوگوں سے ڈرتے تھے تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء میں کیسے شمار ہوں گے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ پھر آپ اس اعتراض کا کیا جواب دیں گے؟ اسی طرح آپ نے حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں جو آیتیں پیش کی ہیں۔ ان کا مفہوم بھی ان کے علوشان کے مناسب بیان کیا جائے گا۔ بے شک ابق بھاگنے والے غلام کو کہتے ہیں۔ لیکن کیا ہمیشہ مالک سے بھاگ جانے کی علت بے صبری ہی ہوتی ہے۔ اور کیا کوئی اور وجہ نہیں بن سکتی اور اگر مفتی محمد یوسف صاحب کو یہ اصرار ہے کہ کسی جگہ سے بھاگنا ہمیشہ بے صبری کی وجہ سے ہی ہوتا ہے تو قیام پاکستان پر مودودی صاحب جو ہندوستان سے بھاگ کر پاکستان میں پناہ گزین ہوگئے تھے حالانکہ وہ پہلے قیام پاکستان کے حق میں نہ تھے۔ تو کیا آپ اپنے امام موصوف کو اس ہجرت کے بارے میں بے صبر قرار دیئے جانے پر راضی ہو جائیں گے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ تفسیر میں حضرت یونس علیہ السلام کے اس فعل کو ہجرت قرار دیا ہے چنانچہ خود آپ نے ''علمی جائزہ'' ص ۲۷ پر لکھا ہے وکان ذھابہ ھذا منھم ھجرۃ عنھم لکنہ لم یؤمر بہ۔

(روح المعانی ج ۱۷ ص ۱۸۳)

(اور حضرت یونس کا اپنی قوم سے چلا جانا بطور ہجرت کے تھا لیکن ان کو خدا کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ملی تھی) فرمایئے! جب حضرت یونس علیہ السلام کا یہ عمل ہجرت تھا تو پھر آپ اس کو خواہ مخواہ بے صبری پر کیوں محمول کرتے ہیں۔ لہٰذا لفظ ابق سے مراد صورۃً ابق ہے نہ کہ حقیقۃً جس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی معصیت صورۃً ہے نہ کہ حقیقۃً اور حضرت یونس علیہ السلام کا یہ منشا نہ تھا کہ وہ ایسی جگہ بھاگ جائیں گے جہاں نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو بھی علم نہ ہو سکے۔ جیسا کہ کوئی غلام آقا سے بھاگ جاتا ہے اور پھر آقا اس کو پکڑ نہیں سکتا لہٰذا یہاں ابق کا معنی یہ ہوگا کہ حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کو

چھوڑ کر دور نکل گئے چنانچہ مبرد میں ہے اصل ابق تباعد یعنی ابق کا اصلی معنی یہ ہے کہ دور چلا گیا اور علامہ آلوسیؒ نے بھی روح المعانی میں یہ لکھا ہے کہ: قال بعض الکمل الاباق الفرار عن السید بحیث لایھتدی الیہ طالب ای بھذا القصد وکان علیہ السلام ھرب من قومہ بغیر اذن بہ سبحانہ الیٰ حیث طلبوہ فلم یجدوہ فاستعیر الاباق لھربہ باعتبار ھذا القید لا باعتبار القید الاول ''بعض کاملین نے فرمایا کہ اباق اپنے آقا سے اس ارادے سے بھاگنے کو کہتے ہیں کہ کوئی ڈھونڈنے والا اس کو پا نہ سکے اور حضرت یونس علیہ السلام بغیر اللہ تعالیٰ کے اذن کے اپنی قوم سے بھاگ کر وہاں چلے گئے جہاں انہوں نے تلاش کے باوجود آپ کو نہ پایا۔ پس آپ کے بھاگنے کے لئے لفظ اباق مستعار لیا گیا ہے۔ اور یہاں اعتبار پہلی قید کا نہیں (کہ اپنے آقا سے اس ارادے سے بھاگے کہ وہ نہ پا سکے) بلکہ دوسری قید کا اعتبار ہے (کہ قوم تلاش کے باوجود آپ کو نہ پا سکی)''

اُمید ہے کہ اب تو مفتی محمد یوسف صاحب کی تسلی ہوگئی ہوگی۔

مودودی صاحب کے نزدیک امام الانبیاء میں بھی بے صبری پائی گئی:

صرف حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں ہی نہیں بلکہ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے تو امام الصابرین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی سورۃ المؤمن کی آیت فاصبر ان وعد اللہ حق کی تفسیر میں لکھ دیا ہے کہ:

''جس سیاق و سباق میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے اس پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس مقام پر حضور سے مراد بے صبری کی وہ کیفیت ہے جو شدید مخالفت کے اس ماحول میں خصوصیت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی مظلومیت دیکھ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر پیدا ہو رہی تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ جلدی سے کوئی معجزہ ایسا دکھایا جائے جس سے کفار قائل ہو جائیں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور کوئی ایسی بات جلدی ظہور میں آ جائے جس سے مخالفت کا یہ طوفان ٹھنڈا ہو جائے۔ یہ خواہش بجائے خود کوئی گناہ نہ

تھی جس پر کسی توبہ و استغفار کی حاجت ہوتی لیکن جس مقام بلند پر اللہ تعالیٰ نے حضور کو سرفراز فرمایا تھا اور جس زبردست اولوالعزمی کا وہ مقام مقتضی تھا اس کے لحاظ سے یہ ذراسی بے صبری بھی اللہ تعالیٰ کو آپ کے مرتبے سے فروتر نظر آئی اس لئے ارشاد ہوا کہ اس کمزوری پر اپنے رب سے معافی مانگ"۔

(تفہیم القرآن ج ۴[1])

آخر مفتی صاحب اپنے امام موصوف کی کہاں کہاں تک صفائی کرتے رہیں گے۔

ع دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

امام رازی کی زیر بحث عبارت:

مفتی محمد یوسف صاحب نے اتمام حجت قسط نمبر ۸ نمبر ۳ کے تحت یہ لکھا ہے کہ:

"پھر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر جلد ۷ ص ۱۵۸ میں یہ کس طرح لکھ دیا کہ فلم یصبر علی دعائهم و کان الواجب علیه ان یستمر علی الدعاء (حضرت یونس نے ان کو دعوت حق دینے پر صبر نہ کیا بلکہ اسے چھوڑا درآنحالیکہ ان پر واجب تھا کہ دعوت کا کام برابر جاری رکھتے) کیا امام موصوف کو بھی آپ مولانا موصوف کی طرح خدا اور حضرت یونس دونوں پر مفتری قرار دیں گے یا نہیں۔ نہیں تو کیوں؟ انہوں نے بھی تو حضرت یونس کی طرف صاف طور پر بے صبری کی نسبت کی ہے" الخ

الجواب:

(ا) میں نے "علمی محاسبہ" میں امام رازی کی اس عبارت پر مدلل تبصرہ کیا ہے جس کے جواب سے مفتی صاحب درحقیقت عاجز ہیں۔ صرف اپنی بات کی پیچ رکھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے سے باز نہیں آتے۔ "علمی محاسبہ" میں بندہ نے یہ جواب دیا تھا کہ امام رازی کی عبارت میں لفظ واجب سے مراد واجب عرفی ہے نہ کہ شرعی اور اس کی دلیل میں خود امام رازی کی ہی یہ عبارت لکھی تھی۔ بل کان الاولی له ان یصابر و ینتظر الاذن من الله فی المهاجرة عنهم ولهذا قال تعالیٰ و لا تکن کصاحب الحوت کان الله تعالیٰ اراد

---

(۱) یہ عبارت تفہیم القرآن جلد ۴ کے پہلے ایڈیشن میں ہے لیکن بعد کے ایڈیشن میں یہ عبارت حذف کر دی گئی ہے۔

لمحمد صلی الله علیه وسلم افضل المنازل و اعلاها (تفسیر کبیر)" بلکہ حضرت یونس علیہ السلام کے لئے اولیٰ (بہتر) یہی تھا کہ وہاں برقرار رہتے اور قوم کو چھوڑنے کے لئے اذن خداوندی کا انتظار کرتے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضور سے فرمایا کہ آپ مچھلی والے کی طرح نہ ہوں گویا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ اور افضل درجہ حاصل کریں"؛ تو جب امام رازی خود حضرت یونس علیہ السلام کے قوم کے نہ چھوڑنے کو صرف اعلیٰ اور افضل قرار دے رہے ہیں تو ثابت ہوگیا کہ امام رازی کی سابقہ عبارت میں فکان الواجب علیه کے الفاظ سے مراد واجب شرعی ہرگز نہیں ہے یعنی حضرت یونس علیہ السلام نے کسی واجب حکم کو ترک نہیں کیا۔ بلکہ آپ نے ایک اولیٰ اور افضل صورت کو ترک کیا تھا۔ کیا مفتی صاحب موصوف نے امام رازی کی یہ عبارت نہیں پڑھی اور کیا مفتی صاحب سالہا سال کی تدریس کے باوجود ترک واجب اور ترک اولیٰ میں فرق نہیں سمجھتے۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں مفتی — کار دیں بس تمام خواہد شد

مفتی صاحب کی بیچارگی:

مفتی صاحب کے تمام استدلالات کو ھباءً منثورًا کردینے والی امام رازی کی یہی مذکورہ بالا عبارت ہے جس کے جواب سے وہ ہمیشہ کے لئے عاجز ہیں لیکن اعتراف کے بجائے انہوں نے جواب کا شوق ضرور پورا کردیا ہے۔ چنانچہ بعنوان "دوسری دلیل کا جواب" لکھتے ہیں:

"جہاں تک دوسری دلیل کا تعلق ہے کہ خود امام رازی نے بھی اسے دوسری جگہ خلاف الاولیٰ یا ترک اولیٰ قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے اندر رہنا حضرت یونس پر واجب شرعی نہیں بلکہ عرفی بمعنی الاولیٰ تھا تو یہ بھی قاضی صاحب موصوف کی غلط فہمی ہے ورنہ امام رازی کی جس عبارت

سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس میں تو جو کچھ ذکر ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت یونس کا اپنی قوم کو چھوڑ کر جانا حرام و محظور نہ تھا اس سے قاضی صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب ان کا چلا جانا حرام نہ ہوا تو ثابت ہوا کہ ٹھہرنا اس پر واجب نہ تھا حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ٹھہرنا ان پر واجب ہو جیسا کہ کان الواجب علیہ ان یستمر علی الدعاء کے لفظ سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے اور قوم کو چھوڑ کر چلا جانا ترک واجب تھا لیکن حرام و محظور اس لئے نہ ہوا کہ یہ ترک واجب خطائے اجتہادی پر مبنی تھا کیونکہ حضرت یونسؑ نے اپنے اجتہاد سے یہ گمان کرلیا کہ مجھے ٹھہرنے اور جانے میں اختیار ہے اس لئے چلے گئے اور ترکِ واجب جب خطائے اجتہادی کی وجہ سے ہو تو وہ حرام نہیں ہوسکتا۔ مگر لغزش اور کوتاہی ضرور ہوتا ہے۔''

تلبیس ہی تلبیس:

مفتی صاحب کا یہ جواب کوئی علمی جواب نہیں بلکہ تلبیس ہے یا جہالت کیونکہ:

(ا) میں نے امام رازی کی زیر بحث عبارت میں وجوب سے مراد جو ترک اولیٰ لیا تھا اس کی دلیل میں یہ عبارت پیش نہیں کی کہ قلنا لانسلم انها کانت محظورة. جس کی تشریح یہاں مفتی صاحب کر رہے ہیں بلکہ دوسری عبارت پیش کی تھی یعنی بل کان الاولی له ان یصابر وینتظر الخ (بلکہ حضرت یونس کے لئے بہتر یہی تھا کہ وہاں برقرار رہتے اور انتظار کرتے) اس عبارت سے صاف ثابت ہے کہ خود امام رازی کے نزدیک عبارت سابقہ یعنی فکان الوجب علیہ میں واجب سے مراد اولیٰ ہے اور مفتی صاحب بھی امام رازی کی یہ مراد سمجھ رہے ہیں لیکن بجائے اعترافِ حق کے یہ فرما رہے ہیں کہ:

''ہوسکتا ہے کہ ٹھہرنا ان پر واجب ہو''۔ حالانکہ یہاں ہوسکنے یا نہ ہوسکنے کی بحث نہیں ہے۔ بلکہ بحث اس میں ہو رہی ہے کہ قوم میں ٹھہرنا حضرت یونس پر واجب تھا یا

نہ؟ یہ نکتہ بھی مفتی صاحب کا عجیب ہے کہ ___ ''مگر حرام و محظور اس لئے نہ ہوا کہ یہ ترک واجب خطائے اجتہادی پر مبنی تھا'' الخ ___ ہم پوچھتے ہیں کہ جب آپ کے نزدیک حضرت یونس کا یہ فعل ترک واجب تھا اور ترک واجب ہی حرام ہوتا ہے۔ تو اس فعل کے واجب یا حرام ہونے کا ثبوت حضرت یونس علیہ السلام کے اس فعل سے پہلے ہونا چاہیے یا بعد میں؟ ظاہر ہے کہ ارتکاب فعل سے امر و نہی پہلے ہوتا ہے۔ لیکن آپ اس فعل کے حرام نہ ہونے کا ثبوت حضرت یونس علیہ السلام کے فعل کے بعد نکال رہے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ آپ کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت یونسؑ پر قوم میں ٹھہرنا واجب تھا۔

(ب) اور آپ کا یہ لکھنا بھی لغو ہے کہ: ''ترک واجب جب خطائے اجتہادی کی وجہ سے ہو تو وہ حرام نہیں ہوسکتا مگر لغزش اور کوتاہی ضرور ہوتا ہے اس لئے کہ:

(۱) بالفرض اگر واجب کا ترک یا حرام کا ارتکاب خطائے اجتہادی کی وجہ سے ہو جائے تو اس کو لغزش کہیں گے نہ کہ گناہ۔ لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ فعل سے پہلے ہی واجب یا حرام نہ تھا۔

(۲) علاوہ ازیں جب آپ کے نزدیک حضرت یونس علیہ السلام نے اس واجب کا ترک بے صبری کی وجہ سے کیا تھا تو پھر اس کو آپ خطائے اجتہادی کس طرح کہہ سکتے ہیں کیونکہ خطائے اجتہادی تو وہاں ہوتی ہے جہاں پورے صبر و استقلال سے پوری کوشش کے ساتھ ایک فعل کیا جاتا ہے لیکن باوجود اس کے اس میں خطا ہو جاتی ہے۔ لیکن آپ کے نزدیک جب حضرت یونس علیہ السلام کو علم تھا کہ قوم میں ٹھہرے رہنا آپ پر واجب شرعی ہے اور پھر محض بے صبر ہو کر آپ وہاں سے چلے گئے تو یہ فعل تو معصیت کہلائے گا نہ کہ خطائے اجتہادی اور لغزش اور اگر آپ اس کو خطائے اجتہادی اور لغزش ہی مانتے ہیں تو پھر حضرت یونس کو بے صبر قرار دینے سے توبہ کریں۔

تفسیر خازن کی عبارت کا مطلب:

میں نے حضرت یونس علیہ السلام کے اس فعل کو ترکِ اولیٰ قرار دیتے ہوئے اس کی تائید میں تفسیر خازن کا بھی حوالہ پیش کیا تھا، جس کے جواب میں مفتی صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ: ____ یہی مطلب خازن کی اس عبارت سے بصراحت معلوم ہوتا ہے جس کو ۱۹-اپریل ۱۹۶۸ء کے ترجمان اسلام میں ص ۷ پر خود قاضی صاحب نے نقل کیا ہے"۔ چنانچہ لکھتے ہیں: وذلک ان یونس ظن انه مخیر ان شاء اقام وان شاء خرج (''یعنی حضرت یونس اس لئے چلے گئے کہ انہوں نے گمان کرلیا کہ مجھ پر ٹھہرنا واجب نہیں بلکہ جانے اور ٹھہرنے میں مجھے اختیار ہے'' گویا یہ کام خطائے اجتہادی کی وجہ سے ہوا تھا اور یہ لغزش ہوسکتا ہے نہ کہ گناہ'' (آئین ۳۱ مارچ ۱۹۶۹ء)۔

الجواب:

(۱) مفتی محمد یوسف صاحب کی حالت قابل رحم ہے، اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ناواقف لوگ مفتی صاحب کے ان جوابی مضامین سے گمراہی میں پڑ جائیں گے تو جواب کی ضرورت نہ سمجھتا۔ مفتی صاحب! آپ ہوش وحواس قائم فرما کر خازن کی عبارت سمجھنے کی کوشش کریں۔ تفسیر خازن میں جب تصریح ہے کہ حضرت یونس نے یہ سمجھا کہ ان کو ٹھہرنے اور نہ ٹھہرنے میں اختیار ہے تو پھر قوم میں ٹھہرنا آپ کے لئے کس دلیل سے واجب ہوگیا۔ اس سے تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ٹھہرنے کا حکم نہیں ملا تھا۔ اور نہ ہی من جانب اللہ ٹھہرنے کا وقت ہی مقرر ہوا تھا اسی لئے تو آپ نے اپنے اجتہاد سے قوم میں سے نکل جانے کو ترجیح دی حالانکہ اللہ کے نزدیک قوم میں ٹھہرے رہنا آپ کے لئے اولیٰ (بہتر) قرار دیا جاسکتا ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ٹھہرنا واجب ہوتو آپ ٹھہرنے یا نہ ٹھہرنے میں اختیار حاصل ہونے کا کیسے خیال فرماسکتے ہیں۔ مثلاً ہر مسلمان کی طرح مفتی صاحب پر بھی نماز فرض ہے لیکن کیا مفتی

صاحب یہ فرماسکتے ہیں کہ نماز پڑھنا یا نہ پڑھنا میرے اختیار میں ہے اور اس تصور کے تحت اگر آپ نماز ترک کردیں گے تو یہ آپ کا گناہ نہیں ہوگا بلکہ لغزش ہوگی؟ **بینوا توجروا۔**

(۲) باقی رہا یہ اشکال کہ جب امام رازی کے نزدیک بھی حضرت یونس کا یہ فعل ترک اولیٰ تھا۔ جیسا کہ ان کی عبارت پہلے گذر چکی ہے تو پھر آپ نے **فکان الواجب علیه** سے اس کو کیوں تعبیر کیا تو اس کے متعلق تفسیر نسفی میں ہے: **لان ترک الافضل منهم کترک الواجب من الغیر** (ص ۴۵۴) ''یعنی انبیاء علیہم السلام کا کسی افضل کام کو چھوڑنا ایسا ہے جیسا کہ غیر نبی کا واجب کو چھوڑ دینا'' اور قبل ازیں بعنوان ''مفتی صاحب کی علمی غلطیاں'' کے تحت تلویح کی یہ عبارت پیش کرچکا ہوں کہ **انما یعاتبون لجلالة قدرهم ولان ترک الافضل عنهم بمنزلة ترک الواجب عن الغیر** (یعنی انبیاء کرام کا لغزش پر ان کی جلالت شان کے پیش نظر مواخذہ ہوتا ہے اور اس لئے کہ اگر ان سے کوئی افضل کام ترک ہوجائے تو وہ بمنزلہ اس کے ہے کہ کسی غیر نبی سے کوئی واجب ترک ہوجائے) کاش کہ مفتی صاحب انبیائے کرام کی جلالت شان کے پیش نظر عصمت انبیاء کی بحث پر قلم اٹھاتے، علاوہ ازیں توضیح تلویح میں یہ لکھا ہے کہ: **وقد یطلق الواجب عندنا علی المعنی الاعم ایضا ای اعم من الفرض والواجب بالتفسیر المذکور**[1]

صبر کا معنی ومفہوم:

مفتی محمد یوسف صاحب نے حضرت یونس علیہ السلام کے لئے بے صبری ثابت کرنے اور اس بات کے لئے کہ آپ پر قوم میں آخر تک ٹھہرنا واجب تھا امام رازی کی یہ عبارت پیش کی تھی: **والاقرب فیه وجهان (الاول) ان ذنبه کان لان الله تعالی وعده انزال الاهلاک بقومه فظن انه نازل لامحالة فلاجل هذا الظن لم یصبر علی دعائهم**

---

(۱) یعنی ہمارے ہاں کبھی واجب کا اطلاق عام معنی پر ہوتا ہے فرض اور واجب سے مذکور تفسیر کے تحت اور وہ یہ ہے کہ کسی کام کا کرنا اس کے چھوڑنے سے بہتر ہو۔

فکان الواجب علیه ان یستمر علی الدعاء (تفسیر کبیر ج ۷ ص ۱۵۸) میں نے ''علمی محاسبہ'' میں اس کا ترجمہ یہ لکھا ہے:

''یعنی حضرت یونس علیہ السلام کی لغزش کے بارے میں دو وجہیں زیادہ قریب ہیں، ان میں سے اول یہ ہے کہ آپ کی لغزش (کوتاہی) یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے قوم پر ہلاکت کا عذاب نازل کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ پس آپ اس خیال سے کہ قوم پر عذاب تو لامحالہ (یقیناً) نازل ہوگا ان میں دعوت کے لئے نہ ٹھہرے۔ تاہم آپ کے لئے یہ بہتر تھا کہ دعوت دینے میں آخر تک رہتے''۔

میرے اس ترجمہ پر مفتی صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ: ذنب کے لفظ سے تو بالاتفاق گناہ مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ انبیاء گناہوں سے معصوم ہیں۔ باقی ماندہ دو لفظوں میں امام موصوف نے حضرت یونسؑ کی طرف بے صبری کی نسبت کی ہے اور دوسری یہ بات منسوب کی ہے کہ ''دعوت پر قائم رہنا ان پر واجب تھا'' یہ دونوں باتیں ایک طرف مولانا مودودی کے دعوے کو حرف بحرف ثابت کر رہی تھیں اور دوسری طرف قاضی صاحب کے تمام اعتراضات اور الزامات کی جڑ کاٹنے والی تھیں اس لئے قاضی صاحب نے تینوں باتوں میں زور لگا کر تحریفات بنام تاویلات کا دروازہ کھولنا شروع کیا۔ چنانچہ سب سے پہلے ذنب کا ترجمہ لغزش سے کر دیا گیا اور فلم یصبر علی دعائهم کا ترجمہ یوں کیا گیا ''ان میں دعوت کے لئے نہ ٹھہرے'' اور فکان الواجب علیه کا ترجمہ یہ کیا گیا ''تاہم آپ کے لئے بہتر یہ تھا'' (ترجمان اسلام ۱۹، اپریل ۱۹۶۸ء)

اس کے بعد مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ: رہا لم یصبر علی دعائهم کا ترجمہ کہ ''وہ ان میں دعوت کے لیے نہ ٹھہرے'' تو نہ معلوم یہ کون سے لغات القرآن سے لیا گیا ہے، ٹھہرنا لفظ اقامت کے معنی تو ہوسکتے ہیں اقام فی المکان کا محاورہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جبکہ وہ مکان میں کسی وقت

کے لئے ٹھہرا رہے۔ خود قاضی صاحب نے بھی خازن کی عبارت ان شاء اقام کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ حضرت یونس کو اختیار تھا کہ وہ اپنی قوم میں ٹھہرے رہیں لیکن ٹھہرنا لفظ صبر کا معنی ہرگز نہیں ہوسکتا البتہ صبر کے ساتھ ایک لازمی معنی ضروری ہے الخ (اتمام حجت قسط ۱۱۔ آئین ۳۱ مارچ ۱۹۶۹ء ص ۱۲)

مجھ پر تحریف کا الزام بہتان ہے:

مفتی صاحب نے مجھ پر تین تحریفات کا الزام لگایا ہے کہ:

(۱) میں نے ذنب کا ترجمہ لغزش سے کیا ہے۔ حالانکہ مفتی صاحب خود ہی یہ لکھ بھی رہے ہیں کہ: ''ذنب کے لفظ سے تو بالاتفاق گناہ مراد نہیں ہوسکتا''۔ تو پھر بجائے گناہ کے ذنب کا ترجمہ لغزش کرنے میں، میں نے کیا گناہ کیا ہے۔ البتہ خود مفتی صاحب نے مودودی صاحب کی تقلید میں ذنب کا ترجمہ گناہ کر کے گناہ کا ارتکاب کیا ہے جس کی بحث پہلے گذر چکی ہے۔

(۲) مجھ پر دوسرا بہتان تحریف کا یہ لگایا ہے کہ میں نے صبر کا معنی ٹھہرنا لکھا ہے حالانکہ خود مفتی صاحب پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ امام رازی نے حضرت یونس کی طرف ''دوسری یہ بات منسوب کی ہے کہ دعوت پر قائم رہنا ان پر واجب تھا''۔ فرمائیے! آپ نے صبر کا ترجمہ قائم رہنا کیا ہے اور میں نے ٹھہرنا لکھا ہے۔ اور اقامت کا معنی ٹھہرنا بھی خود تسلیم کر رہے ہیں تو پھر میرا ترجمہ غلط اور آپ کا صحیح کیسے ہوگیا؟ کیا ٹھہرنا اور قائم رہنا ایک ہی بات نہیں ہے۔ خدا جانے مفتی صاحب اتنے بدحواس کیوں ہوگئے ہیں۔ اور دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ مجھ پر تحریف کا الزام لگانے کے بعد خود ہی ٹھہرنے کے متعلق یہ اعتراف کرتے ہیں کہ: ''البتہ صبر کے ساتھ ایک لازمی معنی ضرور ہے''۔ تو میں نے اگر صبر کا لازمی معنی ٹھہرنا لکھ دیا ہے تو اس کو آپ تحریف کیوں قرار دے رہے ہیں۔ کیا لازمی معنی کو کوئی اہل علم اور صاحب عقل تحریف کہہ سکتا ہے۔ معنوی تحریف تو یہ ہے کہ اصلی معنی

ومفہوم کو بدل دیا جائے۔ چونکہ آپ نے خود ہی اپنی مذکورہ عبارت میں صبر کا معنی قائم رہنا بیان کر دیا ہے جس کے بعد مزید جواب دینے کی ضرورت نہیں رہتی لیکن آپ کی دینی فہم اور علمی دیانت کی حقیقت کھولنے کے لئے مزید یہ عرض کرتا ہوں کہ صبر کا ترجمہ بعض محققین، مفسرین نے بھی ٹھہرنا ہی کیا ہے چنانچہ:

(۱) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ آیت واصبر لحکم ربک فانک باعیننا کا ترجمہ یہ لکھتے ہیں ("اور آپ اپنے رب کی اس تجویز پر صبر سے بیٹھے رہئے"۔ (بیان القرآن سورۃ الطور) فرمائیے! کیا بیٹھے رہئے اور ٹھہرنے میں کوئی فرق ہے۔

(۲) نیز حضرت تھانویؒ سورۃ اعراف ع ۱۱ کی آیت فاصبروا حتیٰ یحکم اللہ بیننا کا ترجمہ یہ لکھتے ہیں" تو ذرا ٹھہر جاؤ یہاں تک کہ ہمارے درمیان میں اللہ تعالیٰ فیصلہ کئے دیتے ہیں"۔

(۳) امام المترجمین حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت واصبر لحکم ربک فانک باعیننا کا ترجمہ یوں لکھا ہے۔"اور تو ٹھہرا رہ منتظر اپنے رب کے حکم کا۔تو تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے"۔

(۴) اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ اسیر مالٹا نے بھی اس آیت کا یہی ترجمہ لکھا ہے۔"اور تو ٹھہرا رہ منتظر اپنے رب کے حکم کا"۔اور حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضرؑ کے واقعہ میں آیت قال انک لن تستطیع معی صبرا (سورہ کہف) کا ترجمہ بھی یہ لکھا ہے کہ:"بولا تو نہ ٹھہر سکے گا میرے ساتھ ٹھہرنا" اور شیخ الہندؒ نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے تو فرمائیے کیا آپ صبر کا ترجمہ ٹھہرنا کرنے پر حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا تھانویؒ پر بھی تحریف کا الزام لگانے کی جسارت کرسکیں گے۔اور تعجب یہ ہے کہ مفتی صاحب کے امام

ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بھی آیت واستعینوا بالصبر والصلوۃ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ:

صبر کے معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں" الخ تو کیا روکنے اور باندھنے میں ٹھہرنا نہیں پایا جاتا ہے؟ اہل فہم وانصاف کے لئے اتنا ہی کافی ہے ورنہ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اصحاب لغت اور دیگر مفسرین کے اقوال بھی پیش کئے جاتے۔باقی رہا تیسرا الزام تحریف کا کہ میں نے واجب کا ترجمہ اولیٰ (بہتر) سے کیا ہے تو اس پر پہلے مفصل بحث گذر چکی ہے۔

مفتی صاحب نے ذنب کا ترجمہ گناہ کیوں کیا ہے:

مفتی محمد یوسف صاحب قسط ۹ آئین ۸ مارچ ۱۹۶۹ء میں لکھتے ہیں:

امام رازی کی عبارت میں حضرت یونس علیہ السلام کی طرف ذنب کی نسبت کی گئی ہے۔ "علمی جائزہ" میں یہ عبارت نقل کرتے ہوئے اس لفظ کا ترجمہ گناہ سے کیا گیا ہے۔اس پر قاضی مظہر حسین صاحب لکھتے ہیں:

"گناہ کا ترجمہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں یہ بات آئے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے اس معاملہ میں کوئی گناہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ لفظ ذنب کا اطلاق ادنیٰ سے ادنیٰ لغزش پر بھی ہوتا ہے جس کا گناہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔فیض الباری شرح البخاری میں ہے الذنب غیر المعصیۃ یعنی گناہ سے ذنب جدا امر ہے" الخ (ترجمان اسلام ۱۲-اپریل ۱۹۶۸ء)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آگے چل کر مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"میں حیران ہوں کہ دوسروں کی نیتوں، سینوں میں پوشیدہ اور مخفی باتوں سے تو خدا کے علاوہ اور کوئی شخص آگاہ نہیں ہوسکتا۔ یہ علم تو علام الغیوب کی اس برتر ذات کے ساتھ مخصوص ہے جس سے کائنات ہست و بود میں ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں رہ سکتی اللہ اعلم بما فی صدور العلمین، لیکن نہ معلوم قاضی مظہر حسین صاحب اپنے آپ کو

خدا کے ساتھ اس کی ایک مخصوص صفت میں کس طرح شریک فرمارہے ہیں کہ ذنب کا ترجمہ گناہ کرنے میں میرے دل میں یہ بات پوشیدہ تھی کہ پڑھنے والے کے دل میں یہ بات آئے کہ حضرت یونس سے اس معاملہ میں کوئی گناہ ہوگیا تھا"۔

اس کے بعد مفتی صاحب یوں گوہرافشانی فرماتے ہیں کہ:

لیجئے میں خود بتارہا ہوں کہ ذنب کا ترجمہ گناہ سے کیوں کیا گیا ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ ذنب کے معروف اور متبادر معنی گناہ کے ہیں۔ اہل لغت نے بھی اس لفظ کے معنی گناہ کے کئے ہیں الذنب ھو الجرم جمعہ ذنوب (منجد) ذنب کے معنی جرم اور گناہ کے ہیں اور اس کا جمع ذنوب ہے اور قرآن وحدیث میں بھی بیسیوں جگہ گناہ کے معنوں میں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے۔ میں نے علمی جائزہ میں اس لفظ کا ترجمہ گناہ اس لئے بھی کیا ہے کہ آپ جیسے حضرات کو اس طرف متوجہ کرسکوں کہ دیکھئے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تو حضرت یونس علیہ السلام کی طرف ذنب کی نسبت کی ہے جس میں احتمال ہی کے درجہ میں نہیں بلکہ معروف ومشہور استعمال کے اعتبار سے بھی یہ گنجائش موجود ہے کہ اس سے گناہ مراد لیا جائے حالانکہ کسی نے بھی امام رازی کو اس نسبت کی وجہ سے نہ عصمتِ انبیاء کا منکر قرار دیا ہے اور نہ توہین انبیاء کا مرتکب"۔ (اہتمام حجت قسط ۹ ص ۱۲۔ ۸ مارچ ۱۹۶۹ء)

الجواب:

ذنب کا ترجمہ گناہ کرنے کی آپ نے جو توجیہات وتاویلات کی ہیں یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ کی قبیل سے ہیں کیونکہ:

(۱) بحث یہ نہیں ہے کہ ذنب بمعنی گناہ آتا ہے یا نہیں۔ بلکہ زیر بحث یہ بات ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت یونس علیہ السلام کے تذکرے میں

لفظ ذنب سے کیا مراد لیا ہے۔ ہمارا دعوئی ہے کہ امام موصوف کی مراد ذنب سے زَلت اور لغزش ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کے اس فعلِ ہجرت کو ترک اولیٰ قرار دیا ہے جس کی بحث گذر چکی ہے۔ تو جب عربی محاورات میں ذنب کا اطلاق لغزش اور خطا پر بھی آتا ہے اور امام رازی کی مراد بھی خود ان کی دوسری عبارت سے واضح ہوگئی اور آپ خود بھی یہ تسلیم کرچکے ہیں کہ:

جہاں تک ذنب کا ترجمہ لغزش سے کرنے کا تعلق ہے اس میں ہمارے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ جہاں بھی انبیاء کی طرف ذنب کی نسبت کی گئی ہو وہاں اس سے مراد لغزش ہوگی نہ کہ گناہ"۔ (اہتمام حجت قسط ۱۱، ص ۱۲، آئین ۳۱ مارچ ۱۹۶۹ء)

تو اگر ذنب کے معروف اور متبادر معنی گناہ کے بھی ہوں اور قرآن مجید میں بھی بیسیوں جگہ ذنب بمعنی گناہ مستعمل ہوا ہو تو اس کے باوجود آپ کے لئے یہ کیونکر جائز ہوسکتا ہے کہ آپ امام رازی کی عبارت میں لفظ ذنب کا ترجمہ گناہ ہی کریں، کیا امام رازی کو آپ ان تمام اہل علم میں شمار نہیں کرتے جو بقول آپ کے اس بات پر متفق ہیں کہ جہاں بھی انبیاء کی طرف ذنب کی نسبت کی گئی ہو وہاں اس سے مراد لغزش ہوگی نہ کہ گناہ"۔

(۲) اور آپ یہ بھی تاویل نہیں کرسکتے کہ ذنب کا ترجمہ گناہ کرنے سے آپ کی مراد صورتاً گناہ ہے نہ کہ حقیقتاً جیسا کہ بعض علماء نے لفظ گناہ سے یہی مراد لی ہے کیونکہ اہل لغت اور قرآنی استعمال کو بطور دلیل پیش کرنے سے آپ کا مقصد ذنب بمعنی گناہ حقیقی ہی ہوسکتا ہے نہ کہ مجازی۔

(۳) اور منجد کی عبارت الذنب ھو الجرم جمعہ ذنوب کا ترجمہ جو آپ نے لکھا ہے کہ: ذنب کے معنی جرم اور گناہ کے ہیں اور اس کا جمع ذنوب ہے" تو اس میں بھی آپ نے لفظ گناہ کا اپنی طرف سے اضافہ کردیا ہے۔ حالانکہ ہر جرم کو گناہ نہیں کہتے چنانچہ امام

راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لفظ جرم کے متعلق لکھا ہے کہ:

اصل الجرم قطع الثمرة عن الشجرة. . . . . واستعیر لکل اکتساب مکروہ'' یعنی درخت سے پھل کاٹنے کو جرم کہتے ہیں. . . . . . اور یہ لفظ (جرم) ہر مکروہ فعل کے لئے مستعار لیا گیا ہے'' فرمائیے کیا ہر مکروہ فعل لازماً گناہ اور حرام ہی ہوتا ہے جبکہ حرام سے کم فعل مکروہ کی دو قسمیں ہیں۔ مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی اور مکروہ تنزیہی کو گناہ اور حرام نہیں کہا جاتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ از روئے لغت جرم کا لفظ گناہ کے لئے بھی آتا ہے اور عام غیر پسندیدہ فعل اور خطا کے لئے بھی اور مفتی صاحب موصوف نے خود بھی تقصیر کے لئے لفظ جرم استعمال کیا ہے۔ چنانچہ جنگ خندق میں نمازیں فوت ہونے کی بحث میں لکھتے ہیں: ''اور یہ سمجھا کہ یہ تقصیر ہمارے لئے قابل مواخذہ جرم ہوگی۔'' (اتمام حجت قسط ۱۰)

لیکن اس کے باوجود آپ اس کوشش میں ہیں کہ ذنب کا معنی لازماً گناہ ہی سمجھا جائے۔

(۴) قرآن مجید میں رحمۃ للعالمین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی ذنب کی نسبت کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے واستغفر لذنبک وللمؤمنین والمؤمنات (اور آپ اپنے ذنب کے لئے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے ذنب کے لئے استغفار کریں) یہاں بھی لفظ ذنب مستعمل ہے تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی ذنب سے مراد آپ گناہ ہی لیں گے۔ اگر قرآن میں بیسیوں جگہ ذنب بمعنی گناہ مستعمل ہوا؟ تو قرآن میں ہی آیت مذکورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب بمعنی لغزش استعمال ہوا ہے تو آپ نے اس قرآنی محاورہ کو کیوں نظر انداز کر دیا ہے۔

(۵) صاف بات ہے کہ جب تمام اہل علم کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے لئے ذنب بمعنی لغزش استعمال ہوتا ہے نہ کہ بمعنی گناہ تو پھر ایک پیغمبر معصوم حضرت یونس علیہ السلام کے لئے ذنب کا ترجمہ آپ نے اور مودودی صاحب نے گناہ کیوں لکھا ہے؟ کیا

یہ اس بات کا قرینہ نہیں ہے کہ آپ ناواقف قارئین کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ امام رازی نے بھی حضرت یونس کی طرف گناہ کی نسبت کی ہے حالانکہ امام رازی کا دامن اس سے پاک ہے۔

۶۔ مفتی محمد یوسف صاحب جب لاجواب ہو کر زیادہ پریشان ہوتے ہیں تو غیر متعلقہ حقائق و معارف کا بیان شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی توحید اور مسئلہ علم الغیب کے موضوع پر علم و عرفان کے موتی بکھیرتے ہوئے بندہ گنہگار کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''لیکن نہ معلوم قاضی مظہر حسین صاحب اپنے آپ کو خدا کے ساتھ اس کی ایک مخصوص صفت (یعنی علم غیب) میں کس طرح شریک فرما رہے ہیں کہ ذنب کا ترجمہ گناہ سے کرنے میں میرے دل میں یہ بات پوشیدہ تھی کہ پڑھنے والے کے دل میں یہ بات آئے کہ حضرت یونس سے اس معاملہ میں کوئی گناہ ہو گیا تھا''۔

الجواب:

(ا) جب حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں آپ ذنب کا ترجمہ بجائے لغزش کے صاف طور پر گناہ لکھ رہے ہیں۔ تو اس بات کے سمجھنے میں علم غیب کی ضرورت ہی کیا ہے۔ علم غیب کا تعلق تو عالم اسباب سے بالاتر کسی پوشیدہ اور مخفی چیز کے علم سے ہوتا ہے۔ بلاواسطہ وحی و اطلاع خداوندی کے اور آپ نے ذنب کا ترجمہ خود گناہ لکھ دیا ہے جس کو ہر پڑھا لکھا آدمی پڑھ سکتا ہے۔ تو جو کچھ آپ نے لکھا ہے میں نے آپ کے ذمہ وہی بات لگائی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کو علم غیب کی تعریف بھی معلوم نہیں ہے۔

(ب) مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگر قرائن و علامات کی بنا پر کوئی بات کہی جائے تو اس کو نہ علم الغیب کہتے ہیں اور نہ دعویٰ علم غیب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہوتا ہے اور اگر آپ کے علمی معیار پر دعویٰ علم الغیب اسی کا نام ہے جس کا الزام مجھ پر لگایا گیا ہے

تو پھر آپ یہ فرمائیں کہ آپ کے امام مودودی صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ:

(۱) ''حضرت یونس سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں (تفہیم القرآن سورہ یونس) حالانکہ آپ باوجود ایڑی سے چوٹی تک علمی زور لگانے کے ابھی تک قوم میں رہنے کو فرض وواجب نہیں ثابت کرسکے۔

(۲) نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہوگیا تھا۔ (رسائل ومسائل ج ۱ ص ۳۱) حالانکہ قرآن وحدیث میں کسی جگہ حضرت موسیٰ کے اس فعل کو بہت بڑا گناہ نہیں کہا گیا۔

(۳) حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ ___ ''جو فعل ان سے صادر ہوا تھا اس کے اندر خواہش نفس کا کچھ دخل تھا''۔ (تفہیم القرآن جلد ۴ ص ۳۵ سورہ ص) حالانکہ کسی نص سے یہ ثابت نہیں۔

(۴) حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے لئے جو دعا فرمائی اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ''محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے''۔ (تفہیم القرآن سورہ ہود)

(۵) اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں ہوجانے دی ہیں''۔ (تفہیمات جلد ۲ ص ۴۳)

(۶) سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دجال کے متعلق لکھا ہے کہ: ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضور سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے''۔

(ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۶ء)

(۷) ایک جلیل القدر صحابی حضرت سعد بن عبادہ انصاری رضی اللہ عنہ کے متعلق خلافت کی امیدواری کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔ اس پورے گروہ میں صرف سعد بن عبادہ ایک ایسے شخص تھے جن کے اندر امیدواری کی بو پائی جاتی تھی''۔

(جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد ص ۷)

اس امیدواری کی بو آپ کو کیسے معلوم ہوگئی؟

(۸) کاتب وحی حضرت امیر معاویہ صحابی رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ: ''زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی''۔

(خلافت وملوکیت ص ۱۷۵)

حضرت معاویہ کی یہ نیت آپ نے کیونکر معلوم کی کہ آپ نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔''

ان عبارات میں مودودی صاحب نے انبیائے معصومین اور امام الانبیاء والمرسلین اور بعض جلیل القدر صحابہ مرضیین کے اعمال اور ان کی نیات وجذبات کے متعلق جو کچھ تبصرہ کیا ہے کیا یہ سب دعویٰ علم غیب پر مبنی قرار دیا جائے گا؟

رسول اللہ ﷺ کی عظیم تنبیہ:

رسول کریم امام المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا: ینبغی لعبد ان یقول انا خیر من یونس بن متیٰ (''کسی بندے کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں'') اس پر امام نوویؒ فرماتے ہیں: والثانی انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھذا زجراً عن ان یتخیل احد من الجاھلین شیئا من حط مرتبۃ یونس صلی اللہ علیہ وسلم من اجل مافی القرآن العزیز من قصتہ (شرح مسلم) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ سلم نے یہ زجر وتنبیہ اس لئے فرمائی کہ کہیں کوئی جاہل قرآن عزیز میں حضرت یونس کے قصہ کی بنا پر آپ کی تنقیص شان کا خیال نہ کرے) تو اس میں ابوالاعلیٰ اور مفتی محمد یوسف اور ان کے ہمنوا مدعیان اصلاح وارشاد کے لئے سخت تازیانہ عبرت ہے کہ جس پیغمبر معصوم کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت سے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو ان پر فضیلت نہ دو۔ کیا اس ارشاد نبوی کا یہی تقاضا

ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کی عصمت کو بے داغ ثابت کیا جائے، فریضہ رسالت کی ادائیگی میں ان کی کوتاہیاں، ان کا قوم پر اتمام حجت نہ کرنا، بے صبر ہو کر قوم کو چھوڑ دینا ثابت کرنا اور ذنب کا ترجمہ گناہ سے کر کے ان کو گناہ گار ثابت کرنا اور اس مہم میں بیسیوں صفحات سیاہ کر کے اپنا نامہ اعمال سیاہ کیا جائے فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ترک فرائض کی دو صورتیں:

مفتی محمد یوسف صاحب ترک فرائض کی بحث میں فرماتے ہیں کہ:

”ترک فرائض مطلقاً گناہ نہیں ہے بلکہ گناہ وہ ترک فرائض ہے جو مخالفت حکم کی صورت میں ہو اس لئے ذیل میں کوتاہی اور مخالفت کے مابین فرق واضح کرنے کے لئے ایک ضروری توضیح پیش کی جاتی ہے تاکہ غلط فہمی رفع ہو جائے۔ اسلامی شریعت میں ترک فرائض کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) ایک صورت تو یہ ہے کہ دیدہ دانستہ جان بوجھ کر فرض چھوڑ دیا جائے اور شرعی عذر کوئی بھی موجود نہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بھول چوک یا خطائے اجتہادی اور یا حادثہ عمومی اور بلوئ عام کی وجہ سے فریضہ چھوٹ جائے نہ کہ دیدہ دانستہ چھوڑ دیا جائے۔

پہلی صورت میں ترک فریضہ کا نام مخالفت ہے اور یہ ترک چونکہ معصیت کی تعریف میں آتا ہے اس میں دنیا و آخرت دونوں میں سزا کی وعید سنائی گئی ہے . . . . لہٰذا یہ ترکِ فرائض انبیاء علیہم السلام سے سرزد نہیں ہو سکتا۔

رہی ترک فرائض کی دوسری صورت تو اس میں چونکہ حکم کی خلاف ورزی کرنے کا قصد اور ارادہ نہیں ہوتا اس لئے اس کا نام لغزش اور کوتاہی ہے اور یہ گناہ اور معصیت کی تعریف میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ فعل میں گناہ اور معصیت کا پہلو جب آ سکتا ہے کہ اس میں تین چیزیں پائی جائیں۔ ایک اس فعل کی حرمت، دوسری اس کی حرمت پر فاعل کا علم اور تیسری چیز فاعل کا ارادہ اور قصد۔ یہ تینوں چیزیں مل کر کسی فعل کو گناہ بنا سکتی ہیں۔ چونکہ

کوتاہی اور لغزش میں فعل کا ارادہ اور قصد نہیں ہوتا اس لئے وہ معصیت اور گناہ بھی نہیں ہو سکتا اگرچہ اس کا تعلق فریضہ رسالت کی ادائیگی سے کیوں نہ ہو الخ۔

الجواب (۱) جب تک مفتی صاحب موصوف یہ نہ ثابت کریں کہ اللہ کی طرف سے عذاب کی اطلاع دینے کے باوجود حضرت یونس علیہ السلام پر قوم میں آخر وقت تک ٹھہرنا فرض تھا اس وقت تک ان کی مذکورہ تفصیل مفید نہیں ہو سکتی۔ امام رازی کی عبارت سے جو انہوں نے استدلال کیا تھا اس کا ابطال پہلے کر چکا ہوں۔ البتہ اتمام حجت میں تفسیر قرطبی سے انہوں نے حسب ذیل عبارت پیش کی ہے:

غاضب قومه فذهب فاراً بنفسه ولم يصبر على اذاهم وقد كان الله امره بملازمتهم والدعاء الى الايمان فكان ذنبه خروجه من بينهم من غير اذن من الله

(بحوالہ جمل ج ۳ ص ۵۵۳)

”حضرت یونس قوم پر غصہ ہو کر خود بھاگ نکلے اور قوم کی ایذا رسانی پر انہوں نے صبر نہ کیا۔ درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا کہ اپنی قوم میں رہ کر ان کو ایمان کی دعوت دیتے رہیں۔ پس حضرت یونس کا قصور یہ تھا کہ وہ اذن خداوندی کے بغیر قوم کے درمیان سے نکل کر چلے گئے“۔

اس عبارت میں صاف طور پر یہ تصریح کی گئی ہے کہ حضرت یونس کو اللہ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ اپنی قوم کے اندر رہ کر قوم کو ایمان کی دعوت دیتے رہیں اور جب انہیں صریح حکم ثابت ہو گیا تو قاضی صاحب کے وضع کردہ اصول کی رو سے بھی حضرت یونس علیہ السلام پر قوم میں رہ کر تبلیغ پر قائم رہنا ضروری ثابت ہوا۔ لہٰذا اس کے بعد اذن خداوندی کے بغیر جانا فرائض رسالت کی ادائیگی میں لازماً کوتاہی شمار ہوگا۔ مگر گناہ اور معصیت نہ ہوگا“۔

(اتمام حجت قسط ۱۱ ص ۱۳ آئین ۳۱ مارچ ۱۹۶۹ء)

تفسیر قرطبی کی عبارت کا جواب:

(۱) الحمدللہ مفتی محمد یوسف صاحب نے تفسیر قرطبی کی عبارت میں لفظ ذنب کا ترجمہ یہاں بجائے گناہ کے ''قصور'' کیا ہے۔ اگر وہ امام رازی کی عبارت میں بھی ذنب کا ترجمہ گناہ نہ کرتے تو اس بحث میں وقت نہ صرف کرنا پڑتا۔

(۲) تفسیر قرطبی کے الفاظ یہ ہیں: و قیل انه غاضب قومه الخ (''اور کہا گیا ہے کہ اپنی قوم سے غضبناک ہو گئے'') حالانکہ جس بات کو قیل سے ذکر کیا جائے وہ ضعیف ہوتی ہے۔ چنانچہ نبراس شرح شرح العقائد میں ہے۔ وفی لفظ قیل اشارة الی الضعف ص ۱۱۶ (اور قیل کے لفظ میں ضعف کی طرف اشارہ ہے) اس لئے عصمت انبیاء علیہم السلام کی بحث میں ضعیف قول حجت نہیں ہوسکتا۔

(۳) تفسیر قرطبی کے مذکورہ الفاظ وقد کان امره بملازمتهم والدعاء (یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو قوم میں رہنے اور دعوت دینے کا حکم دیا تھا) سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دعوت و تبلیغ کے لئے قوم میں رہنے کا حکم دیا تھا) لیکن اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ کب تک ٹھہرنے کا حکم تھا۔ بظاہر اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ فریضہ رسالت کی ادائیگی کے لئے قوم میں ٹھہرنے کا حکم تھا۔ اور جب آپ نے فریضہ رسالت پورا پورا ادا کر کے قوم پر اتمام حجت کر دیا تو پھر قوم میں ٹھہرنا ضروری نہ رہا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ وحی حکم دیا کہ آپ قوم کو یہ اطلاع دے دیں کہ تین دن کے بعد ان پر عذاب آ جائے گا۔ چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں علامہ علی قاریؒ لکھتے ہیں:

ومختصر قصته علیه الصلوٰة والسلام ان الله تعالیٰ بعثه الی اهل نینوی من ارض الموصل فدعاهم الی الایمان فلم یؤمنوا فاوحی الله الیه ان اخبرهم ان العذاب یاتیهم بعد ثلاثة ایام فخرج یونس علیه الصلوٰة والسلام من بینهم فظهر سحاب اسود ودنا حتیٰ وقف فوق بلدهم فظهر منه دخان الخ۔

''حضرت یونس علیہ السلام کا مختصر قصہ یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ارض موصل میں نینوی کے باشندوں کی طرف بھیجا۔ پس آپ نے ان کو ایمان کی دعوت دی۔

لیکن وہ ایمان نہ لائے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ ان کو یہ خبر دیدیں کہ بیشک تین دن کے بعد ان پر عذاب آ جائے گا۔ پس حضرت یونس ان کے درمیان سے نکل گئے۔ اس کے بعد ایک سیاہ بادل نمودار ہوا اور قریب آ گیا حتیٰ کہ ان کے شہر کے اوپر چھا گیا اور اس میں سے دھواں نکلا۔''

اب مفتی محمد یوسف صاحب ہی از روئے انصاف بتائیں کہ اگر قوم کے لئے ابھی دعوت و تبلیغ کی ضرورت باقی رہتی تو عذاب کیوں آتا؟ لہٰذا ثابت ہوا کہ فریضہ رسالت ادا کر دینے کے بعد قوم میں ٹھہرنا فرض نہ رہا تھا جس کے لئے قوم میں ٹھہرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ البتہ اولیٰ اور افضل یہی تھا کہ حکم خداوندی کے انتظار میں قوم میں ٹھہرے رہتے۔ لیکن آپ نے ٹھہرنا یا نہ ٹھہرنا برابر سمجھا اس لئے قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تو اس ترکِ اولیٰ کی وجہ سے ہی آپ کو گرفت ہوئی نہ کہ ترک واجب کی وجہ سے۔

(۴) علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں کہ وقد کان امره میں امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ استحباب کے لئے ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے یا ایها الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوه (سورۃ البقرہ) ''اے ایمان والو! جب تم مقررہ مدت تک آپس میں لین دین کرو تو تم اس کو لکھ لو۔''

تفسیر مظہری میں ہے والجمهور علی انه امر استحباب (اور جمہور علماء کے نزدیک یہ امر استحباب کے لئے ہے) یعنی اگر کوئی لکھ لے تو بہتر ہے۔ لیکن لکھنا ضروری اور واجب نہیں۔ یعنی اتمام حجت اور فریضہ رسالت کی ادائیگی کے باوجود قوم میں ٹھہرے رہنا بہتر تھا نہ کہ واجب۔ اسی لئے تو تمام علمائے اہل السنت والجماعت حضرت یونس علیہ السلام کی اس لغزش کو ترکِ اولیٰ قرار دیتے ہیں نہ کہ ترک واجب۔

(۵) آپ کا یہ لکھنا بھی آپ کو مفید نہیں کہ اگر حکم کی مخالفت بلا قصد و ارادہ ہو تو گناہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ واجب حکم کا ترک کرنا گناہ کبیرہ ہے اور مذہب مختار یہی ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام سے عمداً کی طرح سہواً بھی گناہ کبیرہ کا صدور نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ نے

عصمت عن الکبائر سہواً کے عنوان کے تحت خود یہ تسلیم کیا ہے کہ:

"سہواً و خطاءً صدورِ کبائر میں اگر چہ علماء آپس میں مختلف ہوئے ہیں مگر مذہب مختار اس میں بھی یہی ہے کہ اس طرح کے صدور کبائر سے بھی انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں" الخ (علمی جائزہ ص ۴۸)

اس لئے آپ کی یہ مراد کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے فرض حکم کی مخالفت عمداً نہیں کی اس لئے ان کے لئے یہ لغزش ہوگی نہ کہ گناہ بالکل غلط ہے۔

(۶) علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کے اس فعل (ترک فریضہ رسالت) کی وجہ نسیان اور سہو بھی آپ ثابت نہیں کر سکتے اس لئے کہ اگر آپ اس بات پر مصر ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام نے فریضہ رسالت کو ترک کیا تھا تو پھر آپ کو ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ آپ نے گناہ کا ارتکاب کیا۔ کیونکہ گناہ کے ثبوت کے لئے جو آپ نے تین چیزیں بیان کی ہیں وہ یہاں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ بقول آپ کے یونس علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوم میں ٹھہرے رہنا فرض تھا۔ اور آپ کو اس فرض کا علم بھی تھا اور آپ نے قصد و ارادہ سے قوم کو چھوڑا بھی تھا۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی   تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

(۷) جس تفسیر کبیر کی زیر بحث عبارت سے آپ نے سہارا لیا تھا اسی تفسیر میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے اس موقف کی تردید کر رہے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کو آخر تک قوم میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا چنانچہ سورۃ انبیاء کی آیت و ذا النون اذ ذهب مغاضباً سے منکرین عصمت کے ایک استدلال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

قلنا لا نسلم انها كانت محظورة فان الله تعالىٰ امره بتبليغ الرسالة اليهم وما امره بان يبقى معهم ابداً الخ (ہم کہتے ہیں کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ قوم سے غصہ ہو کر جانا ممنوع تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس کو قوم تک رسالت کے پہنچانے کا حکم دیا تھا۔ اور آپ کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ ان کے

ساتھ ہمیشہ تک باقی رہیں الخ)"

امام رازیؒ کے اس جواب سے مفتی محمد یوسف صاحب کی وہ مثال بھی مفید نہ رہی جو انہوں نے اس سلسلہ میں جرنیل اور فوج کی پیش کی تھی۔ علاوہ ازیں امام رازیؒ کی مذکورہ تصریح سے تفسیر قرطبی کا مطلب بھی حل ہو جاتا ہے کہ قوم کے ساتھ رہنے کا حکم ہمیشہ کے لئے نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

اس بحث میں مفتی صاحب نے انبیاء کرام کے ترک فرائض کی تین مثالیں پیش کی ہیں، فرماتے ہیں (۱) ایک قسم وہ لغزشیں ہیں جن میں صریح حکم امتناعی کا ترک پایا جاتا ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی وہ لغزش جو درخت کھانے سے متعلق ہے لاتقربا هذه الشجرة فتكونا من الظّلمين کا حکم صریح ترک کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہ لغزش جو قتل قبطی سے متعلق تھی۔ (۲) دوسری قسم ان لغزشوں کی ہے جن میں صریح حکم ایجابی ترک کیا گیا ہے جیسے عبداللہ بن ام مکتوم کے سوال علمنی مما علمك الله کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعراض کہ اس میں بظاہر بلغ ما انزل اليك من ربك کا ایجابی حکم ترک کیا گیا ہے۔ (۳) اور تیسری قسم میں وہ ہیں جن میں نہ صریح حکم ایجابی کا ترک پایا جاتا ہے اور نہ صریح حکم امتناعی کا . . . جیسے غزوۂ بدر میں قیدیوں سے جزیہ لے کر چھوڑ دینا۔

لغزش کی ان تینوں قسموں میں سے آخری قسم کے متعلق تو یہ کہنا درست ہے کہ اس کا تعلق فرائض رسالت کی ادائیگی سے نہیں ہے کیونکہ یہاں پہلے سے کوئی فرض موجود ہی نہیں تھا۔ لیکن پہلی دو قسموں کے متعلق یہ کہنا کہ ان کا تعلق بھی فریضہ رسالت کی ادائیگی سے نہیں ہے یہ معنی رکھتا ہے کہ لا تقربا هذه الشجرة اور لا تقتلوا النفس التي حرم الله کے صریح امتناعی احکام سے اس درخت کا پھل کھانا ممنوع نہیں ہوا تھا اور قتل نفس بھی حرام نہیں ہوا تھا اور

ان سے اجتناب فرض ولازم بھی نہیں تھا۔اسی طرح بلغ ما انزل الیک من ربک سے بھی تبلیغ فرض اور لازم نہیں قرار پاچکی تھی۔ . . . ماننا پڑے گا کہ پہلی دو قسموں میں لغزش کا تعلق فرائض اور واجبات رسالت اور ان کی ادائیگی سے ہے لیکن چونکہ ان میں سے بعض کے اندر فعل کا قصد وارادہ نہ تھا جیسے حضرت موسیٰ کا قبطی کو قتل کرنا اور بعض میں لغزش اجتہادی غلطی سے سرزد ہوئی تھی جیسے حضرت آدم کا درخت کھانا یا حضور کا عبداللہ بن ام مکتوم سے اعراض کرنا اس لئے یہ لغزشیں ان کے حق میں گناہ اور معصیت قرار نہیں دی جاسکتیں۔ بخلاف مخالفت کے کہ اس میں دیدہ دانستہ جان بوجھ کر فریضہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بھول چوک یا خطائے اجتہادی کے لئے اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا الخ

(اتمام حجت قسط نمبر ۱۰ ص ۱۴۔۱۵۔ آئین ۲۱ مارچ ۱۹۶۹ء)

الجواب:

(۱) پہلے تو ہمارا یہ گمان تھا کہ مفتی محمد یوسف صاحب اپنے مقتدا مودودی صاحب کی حمایت میں صرف حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق ہی فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں مانتے ہیں۔لیکن ان کی بیان کردہ مثالوں سے واضح ہوگیا کہ وہ نعوذ باللہ رحمۃ للعالمین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہی گمان فاسد رکھتے ہیں کہ حضور نے بھی نعوذ باللہ فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں کی تھیں لاحول ولا قوۃ الا باللہ

خدا جانے مفتی صاحب کو اس دام ابلیس سے کب نجات ہوگی۔ واللہ الہادی

واقعہ حضرت آدم علیہ السلام:

(۲) بحث تو اس میں ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے فریضہ رسالت میں کوتاہی ہوسکتی ہے یا نہیں۔اس لئے یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کو پیش کرنا خلاف موقع ہے۔

کیونکہ حضرت آدم پر اس وقت رسالت ونبوت کی وحی نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔اور نہ ہی کسی درخت کے پھل کھانے سے منع کرنے کا تعلق فریضہ رسالت سے ہوسکتا ہے۔کیونکہ فریضہ رسالت تو وہ ہے جس کا تعلق امت سے بھی ہو۔(۱)

واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام:

(۳) اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی جب قبطی کافر کو صرف ایک مکا مارا اور اس پر اس کی موت واقع ہوگئی تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی احکام رسالت نازل نہ ہوئے تھے۔کیونکہ وحی رسالت تو حضرت شعیب علیہ السلام سے واپسی پر آپ پر نازل ہوئی تھی۔اور مفتی صاحب موصوف کے امام مودودی صاحب کے نزدیک بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ بالفعل نبوت سے پہلے کا ہے چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہوگیا تھا'' (رسائل ومسائل حصہ دوم ص ۳۱)

اسے کہتے ہیں ''مدعی سست اور گواہ چست''

مذکورہ دو مثالیں پیش کرنے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ چشم بد دور مفتی صاحب فریضہ رسالت کی تعریف ہی نہیں جانتے۔ علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں کہ مفتی صاحب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل کو لغزش قرار دیتے ہیں۔لیکن مودودی صاحب اس فعل کو بہت بڑا گناہ لکھ رہے ہیں اور اگر یہاں مفتی صاحب یہ تاویل کریں کہ مودودی صاحب کے نزدیک بھی یہ فعل لغزش ہی ہے کیونکہ گناہ کبیرہ خطا سے سرزد ہوا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مودودی صاحب کی مراد بھی اس سے لغزش ہوتی تو پھر وہ قبل نبوت اور بعد نبوت کا یہاں فرق نہ بیان کرتے۔

---

(۱) یہاں میں نے اس بحث کو نظرانداز کردیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے سے جو منع فرمایا گیا تھا تو یہ نہی تنزیہی تھی یا تحریمی، شفقۃً تھی یا تشریعاً کیونکہ وہ جداگانہ بحث ہے۔جس کا فریضہ رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہے ۱۲۔

واقعہ حضرت عبداللہ بن اُم مکتومؓ:

اسی طرح حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کے واقعہ کا تعلق بھی فریضہ رسالت سے نہیں ہے۔ اور مفتی صاحب نے جو اس لغزش کو آیت بلغ ما انزل الیک من ربک کے ساتھ متعلق کیا ہے یہ بھی ان کی کم فہمی ہے۔ کیا مفتی صاحب یہ بتلا سکتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کے لئے کوئی خاص حکم نازل ہوا تھا جس کے پہنچانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوتاہی ہوئی نعوذ باللہ یا اس وقت من جانب اللہ کوئی جدید حکم نازل ہوا تھا جس کا پہنچانا اسی وقت ضروری تھا۔ آخر اس فریضہ رسالت کی تعیین بھی تو فرمائیں؟ نیز مفتی صاحب نے عبداللہ بن ام مکتومؓ کے الفاظ علمنی مما علمک اللہ سے جو استدلال کیا ہے وہ غلط ہے کیونکہ اس علم سے مراد بعض نازل شدہ سورتوں کی تعلیم ہے جو عبداللہ بن ام مکتومؓ دوسرے صحابہ سے بھی سیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

''تا آں نابینا پس و پیش مجلس را ندیدہ و متصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آمدہ نشست و گفت کہ مرا فلاں و فلاں سورۃ از قرآن مجید بیاموزید'' الخ

تا آنکہ وہ نابینا (یعنی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم) مجلس کی حالت کو نہ دیکھتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متصل بیٹھ گئے اور کہا کہ حضور ﷺ مجھے فلاں فلاں سورۃ قرآن مجید کی سکھلا دیں''۔

اور علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض سرداران قریش کو مذہب اسلام کے متعلق کچھ سمجھا رہے تھے اتنے میں ایک نابینا مسلمان (جن کو ابن ام مکتوم کہتے ہیں) حاضر خدمت ہوئے اور اپنی طرف متوجہ کرنے لگے کہ فلاں آیت کیونکر ہے۔ یا رسول اللہ مجھے اس میں سے کچھ سکھایئے جو اللہ نے آپ کو سکھلایا ہے۔ حضرت کو ان کا بے وقت کا پوچھنا گراں گذرا۔ آپ کو خیال ہوا ہوگا کہ

میں ایک بڑے اہم کام میں مشغول ہوں۔ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار اگر ٹھیک سمجھ کر اسلام لے آئیں تو بہت لوگوں کے مسلمان ہونے کی توقع ہے۔ ابن ام مکتوم بہر حال مسلمان ہے، اس کو سمجھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے ہزار مواقع حاصل ہیں الخ (فوائد القرآن)

علاوہ ازیں مفتی صاحب سے ہمارا سوال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو سرداران قریش کو اسلام کی تبلیغ فرما رہے تھے تو کیا اس کا فریضہ رسالت سے کوئی تعلق نہ تھا اور وہ نابینا صحابی تو تعلیم کے طالب ہوئے تھے نہ کہ تبلیغ کے کیونکہ وہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے مسلمان ہو چکے تھے۔ لہٰذا مفتی محمد یوسف صاحب کا یہ امام المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک بہتان ہے کہ حضور ﷺ نے یہاں فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کی۔ اس واقعہ کی حقیقت صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ کفار کی نیتوں کو جانتے تھے کہ وہ حضور ﷺ کی تبلیغ سے متاثر نہیں ہوتے اور وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اولیٰ اور افضل صورت یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف توجہ فرماتے جو ایک مخلص صحابی تھے۔ تو گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ایک افضل اور بہتر صورت کو چھوڑ کر صرف ایک جائز اور فاضل صورت کو اختیار کیا اور اسی کو ترکِ اولیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن مفتی صاحب قابل رحم ہیں

ع ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''

آیت بلغ ما انزل الیک من ربک سے اہل حق کا استدلال:

پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ آیت بلغ ما انزل الیک من ربک سے حضرت ابن ام مکتوم صحابی کے واقعہ کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس آیت سے تو ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں ہو سکتی، پوری آیت یہ ہے: یآایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ط وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ ط

والله يعصمك من الناس ط (سورۃ مائدہ ع ۹)

''اے رسول پہنچادے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے اور اگر ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام اور اللہ تجھ کو بچالے گا لوگوں سے''۔

اس پر علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی ؒ فرماتے ہیں ___ اگر بفرض محال کسی ایک چیز کی تبلیغ میں بھی آپ سے کوتاہی ہوئی تو بحیثیت رسول (خدائی پیغامبر) ہونے کے رسالت و پیغام رسانی کا جو منصب جلیل آپ کو تفویض ہوا ہے سمجھا جائے گا کہ آپ نے اس کا حق کچھ بھی ادا نہ کیا . . . . اگر بفرض محال تبلیغ میں ادنیٰ سے ادنیٰ کوتاہی ہوئی تو سمجھو کہ آپ اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے...... لہٰذا یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ کسی ایک پیغام کے پہنچانے میں بھی ذرا سی کوتاہی کریں''۔ اس آیت سے علامہ عثمانی ؒ تو یہ نتیجہ نکال رہے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تبلیغ رسالت میں ادنیٰ سے ادنیٰ کوتاہی بھی ناممکن اور محال ہے۔ لیکن علامہ مفتی محمد یوسف صاحب اس کے برعکس عبداللہ بن ام مکتوم ؓ کے واقعہ میں اس آیت سے یہ استدلال کر رہے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگئی تھی نعوذ باللہ۔

۲۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''يقول تعالى مخاطباً عبده و رسوله محمدا صلى الله عليه وسلم باسم الرسالة وآمراً له بابلاغ جميع ما ارسله الله به وقد امتثل عليه افضل الصلوٰة والسلام ذلك و قد تام به اتم القيام قال البخاري من تفسير هذه الآية . . . عن عائشة رضى الله عنها قالت من حدثك ان محمداً كتم شيئاً مما انزل الله عليه فقد كذب الخ۔

''اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے بندے اور اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول کے نام سے خطاب فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ آپ ان تمام باتوں کو پہنچادیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھیجا ہے۔ اور

بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم خداوندی کی پوری پوری تعمیل کی اور پوری طرح اس کو قائم کیا۔ اور امام بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو آدمی تجھ سے یہ کہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ باتوں میں سے کسی ادنیٰ چیز کو بھی چھپایا ہے تو اس نے جھوٹ بولا ہے'' الخ۔

معلوم ہوتا ہے کہ مفتی محمد یوسف صاحب آیت بلغ ما انزل الیک من ربک کا ترجمہ بھی نہیں سمجھ سکے۔ ورنہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم صحابی کے واقعہ کو اس کے خلاف نہ قرار دیتے۔ کیونکہ آیت کا مدلول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی وحی آپ پر نازل ہو وہ امت تک پہنچادیں اور حضور نے ہر بات دین کی امت تک پہنچادی۔ یہ مطلب نہیں کہ ہر ہر فرد کو وحی کی ہر ہر بات پہنچائی جائے۔

تبلیغِ رسالت میں کوتاہی ماننے والا واجب القتل ہے:

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۵۴۴ھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کرنے والے کے متعلق فرماتے ہیں: مثل ان ينسب اليه اتيان كبيرة او مداهنة في تبليغ الرسالة او في حكم بين الناس او يغض من مرتبته او شرف نسبه او وفور علمه اوزهده او يكذب بما اشتهر من امور اخبربها صلى الله عليه وسلم وتواتر الخبر بها . . . . وان لم يتعمد ذمه ولم يقصد سبه الخ (شفاء جز ثانی ص ۵۰۸) اور نسیم الریاض میں اس عبارت کا ترجمہ یہ لکھا ہے کہ:

''مثلاً کہے کہ آپ ؐ سے گناہ کبیرہ صادر ہوا ہے یا آپ ؐ نے تبلیغ رسالت یا تبلیغ احکام میں کوتاہی کی ہے کہ آپ نے جیسا کہ چاہیے لوگوں کو احکام الٰہی نہیں پہنچائے یا آپ کی مرتبت عالی اور شرافتِ نسب اور مزید علم یا زہد وغیرہ کی تنقیص کرے یا آپ کو ناقص جانے یا امور مشہورہ میں سے جن کی آپ نے

خبر دی ہے اور وہ حد تواتر کو پہنچ چکی ہیں کسی خبر کی تکذیب کرے۔ . . . گو اس کی حالت ظاہری سے یہ امر معلوم ہوتا ہو کہ اس نے یہ بات آپ کی مذمت اور گالی کی غرض سے نہیں کہی۔ . . . تو اس وجہ کا بھی یہی حکم ہے جو پہلی وجہ کا ہے کہ یہ شخص بلا تاخیر قتل کیا جاوے"۔ (ص ۲۷۸)

جو شخص یہ کہے کہ حضور رحمۃ للعالمین خاتم النبیین محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ رسالت میں کوتاہی کی ہے وہ قاضی عیاض جیسے محدث و عارف وغیرہ کے نزدیک واجب القتل ہے۔ کاش کہ مفتی محمد یوسف صاحب مودودی صاحب کی حمایت میں اس مقام پر نہ پہنچتے جہاں بجز حرمان و بدنصیبی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

مفتی محمد یوسف صاحب کے نزدیک امام الانبیاء نے بھی فریضہ رسالت میں کوتاہیاں کی ہیں

مفتی صاحب اس کے بعد بعنوان "ترک فرائض مطلقاً گناہ نہیں ہے" لکھتے ہیں کہ:

"یہ حقیقت قابل انکار نہیں اور خود کتب حدیث بتاتی ہیں کہ لیلۃ التعریس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فجر کی نماز فوت ہو چکی تھی جو عموم بلویٰ کی شکل میں پیش آیا تھا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بمعہ کل فوج کے نیند کا غالب آ جانا۔ اب چونکہ جان بوجھ کر فریضہ نہیں چھوڑا گیا تھا اس لئے وہ گناہ اور معصیت ثابت نہ ہوا۔ پھر اس واقعہ کے متعلق اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضور علیہ ﷺ نے نماز کی حفاظت کے لئے ایک درجہ میں انتظام بھی فرما دیا تھا کہ حضرت بلالؓ کو طلوع فجر کی نگرانی کے لئے بطور خاص مقرر کیا گیا تھا۔ مگر رات بھر سفر کرنے سے پہنچی ہوئی تکان کی بدولت وہ بھی اپنا کام پورا نہ کر سکے اس بنا پر نیند کے غلبہ کی وجہ سے دین کا بنیادی فریضہ فوت ہو گیا۔ اب چونکہ یہ جان بوجھ کر نہیں فوت کیا گیا تھا اس لئے کوئی مسلمان یہ

کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ گناہ کا کوئی کام تھا جو معاذ اللہ حضور سے یا صحابہ سے سرزد ہو گیا تھا۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ترک فرائض مطلقاً گناہ نہیں۔ نہ فرائض کی ادائیگی میں گناہ کا صدور جرم اور گناہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس واقعہ میں فواتِ نماز پر جب صحابہ کرام پریشان ہوئے اور یہ سمجھا کہ یہ تقصیر ہمارے لئے قابل مواخذہ جرم ہو گی تو حضور اکرم نے انہیں سمجھاتے ہوئے فرمایا: انہ لا تفریط فی النوم وانما التفریط فی الیقظۃ. "یعنی قابل مواخذہ تقصیر وہ نہیں جو نیند کی حالت میں سرزد ہو بلکہ وہ ہے جو حالت یقظہ و بیداری میں صادر ہو"۔ (آئین ۲۱ مارچ ۱۹۶۹ء اتمام حجت قسط ۱۰، ص ۱۵)

الجواب (۱): واقعہ لیلۃ التعریس سے غلط استدلال:

لیلۃ التعریس کے اس واقعہ کو زیر بحث مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ بحث عام فرض کے متعلق نہیں ہے جو ہر مسلمان پر فرض ہے بلکہ بحث اس فرض میں ہے جس کا تعلق رسالت سے ہو۔ ثانیاً بحث اس میں ہے کہ فریضہ رسالت ادا تو کیا جائے لیکن اس میں کوتاہی ہو جائے۔ اور یہاں تو فرض نماز ادا نہیں ہو سکا۔

۲۔ اس قسم کا ترکِ فرض جو لیلۃ التعریس میں ہوا۔ جس طرح گناہ نہیں ہے اسی طرح زلت اور لغزش بھی نہیں ہے۔ کیونکہ لغزش فعل میں ہوا کرتی ہے اور یہاں سرے سے فعل ہی نہیں پایا جاتا۔

۳۔ گناہ اور لغزش کا تعلق اس فعل سے ہوتا ہے جس کا بندہ مکلّف ہو۔ اور حالت نیند میں آدمی مکلّف ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ احساس ہی باقی نہیں رہتا اور گو انبیائے کرام کی یہ خصوصیت ہے کہ نیند میں ان کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل جاگتا رہتا ہے۔ لیکن وقت نماز کا ادراک آنکھ کرتی ہے نہ کہ دل اس لئے غیر اختیاری طور پر نماز فوت ہو گئی۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ نعوذ باللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز چھوڑ دی۔ تو پھر

لغزش کیسی اور گناہ کیسا۔ لہٰذا مفتی صاحب کے یہ الفاظ نری جہالت اور بدحواسی پر مبنی ہیں کہ: ”نہ فرائض کی ادائیگی میں گناہ کا صدور جرم اور گناہ ہے“ جب گناہ کا صدور ہی نہیں ہوا تو اس کو جرم اور گناہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔

حدیث کے ترجمہ میں مفتی صاحب کی غلطی:

مفتی صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ: اس واقعہ میں فوات نماز پر جب صحابہ کرام پریشان ہوئے اور یہ سمجھا کہ یہ تقصیر ہمارے لئے قابل مؤاخذہ جرم ہوگی تو حضور اکرم نے انہیں سمجھاتے ہوئے فرمایا انہ لا تفریط فی النوم وانما التفریط فی الیقظۃ (ابوداؤد) ”یعنی قابل مواخذہ تقصیر وہ نہیں جو نیند کی حالت میں سرزد ہوجائے بلکہ وہ ہے جو حالت یقظہ و بیداری میں صادر ہوجائے“۔

الجواب:

مفتی صاحب نے اس حدیث شریف کا ترجمہ بالکل غلط کیا ہے۔ کیونکہ ارشاد نبوی کا مطلب تو یہ ہے کہ نیند میں جو حالت پیش آجائے وہ تقصیر ہی نہیں۔ تقصیر تو وہ فعل ہے جو حالت بیداری میں ہو۔ اور حضور ﷺ کے یہ الفاظ ہی مفتی صاحب کی تردید کے لئے کافی ہیں۔ لیکن مفتی صاحب اپنی کم فہمی سے لا تفریط فی النوم کا یہ مطلب لے رہے ہیں کہ نیند میں تقصیر قابل مواخذہ نہیں۔ یعنی نیند کی حالت میں نماز کا فوت ہوجانا تقصیر اور کوتاہی تو ہے لیکن اس پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب ہوتا تو یہ فرماتے کہ لا مواخذۃ فی النوم (یعنی نیند میں کوئی مواخذہ نہیں ہے) حالانکہ حدیث میں مواخذہ کا سرے سے کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔

جنگ خندق میں نمازوں کا فوت ہونا:

غزوہ خندق کے عنوان کے تحت مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

یہ حقیقت بھی علمائے دین سے پوشیدہ نہیں ہے کہ غزوہ خندق میں بھی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک کی بجائے چار نمازیں فوت ہوگئی تھیں لیکن یہاں بھی یہ نمازیں جان بوجھ کر نہیں چھوڑی گئی تھیں بلکہ ایک عام حادثہ پیش آنے کی وجہ سے فوت ہوچکی تھیں اس لئے ان کا فوت ہوجانا بھی گناہ اور معصیت قرار نہیں دیا گیا ہے الخ۔

الجواب:

(۱) ”گو غزوہ خندق میں نمازیں بیداری کی حالت میں فوت ہوئی تھیں لیکن اس کا بھی زیر بحث مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ واقعہ بھی زلت اور لغزش کی تعریف میں نہیں آسکتا“ کیونکہ جنگ کی شدت اور مجبوری کی وجہ سے یہ نمازیں فوت ہوگئی تھیں اور اس وقت نماز خوف کا حکم بھی نازل نہیں ہوا تھا۔ گویا کہ یہ بھی غیر اختیاری ترکِ نماز ہے اور کسی محقق نے بھی اس کو لغزش میں شمار نہیں کیا۔

تردیدِ مفتی بقلمِ مودودی:

جناب مفتی محمد یوسف صاحب نے تو مودودی صاحب کی ناجائز حمایت میں غلط استدلالات پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی بھی مذموم کوشش کی ہے کہ العیاذ باللہ حضور سرور کائنات ﷺ نے بھی فرائض رسالت میں کوتاہیاں کی ہیں۔ لیکن قارئین حیران ہوں گے کہ خود مودودی صاحب کی تحریر سے بھی مفتی صاحب کی واضح تردید ہوجاتی ہے۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب ع ۵ کی آیت الذین یبلغون رسالت اللہ کی تفسیر میں لکھا ہے۔ یعنی انبیاء کے لئے ہمیشہ یہ ضابطہ مقرر رہا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم بھی آئے اس پر عمل کرنا ان کے لئے قضائے مبرم ہے جس سے کوئی مفر ان کے لئے نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر کوئی کام فرض کردے تو اسے وہ کام کر کے ہی رہنا ہوتا ہے، خواہ ساری دنیا اس کی مخالفت پر تل گئی ہو“ (تفہیم القرآن ج ۴ طبع ششم جون ۱۹۷۴ء ص ۱۰۲)

جب بقول مودودی اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنا انبیائے کرام کے لئے قضائے

مبرم ہے تو اس میں کوتاہی اور لغزش تو محال ہوگی۔ اس سے جہاں مفتی صاحب کے استدلالات کا ابطال ہوتا ہے وہاں خود مودودی صاحب کے اپنے زیر بحث نظریہ کی بھی تردید ہوجاتی ہے کہ: ''حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں'' اسے کہتے ہیں ؎

جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے

امکان اور امتناع کی علمی بحث:

تفہیمات کی زیر بحث عبارت کے سلسلے میں مفتی محمد یوسف صاحب بعنوان ''یہ علمی تحقیق کی بحث ہے آپ علمی معیار سامنے رکھئے'' لکھتے ہیں:

''اس کے علاوہ لغزش سے اگر معصیت مراد لی جائے جیسا کہ قاضی صاحب کا خیال ہے تو پھر بھی اس کے متعلق موصوف کا یہ دعویٰ صریح طور پر غلط بلکہ علمائے حق اور اہل علم کی تصریحات سے ناواقفیت پر مبنی ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے لغزش بمعنی معصیت کا صدور محال ہے۔ کیونکہ اہل علم نے صاف طور پر تصریح فرمائی ہے کہ معصوم سے گناہ کا صدور محال اور ممتنع نہیں ہوتا بلکہ مختار اور مقدور ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر ان سے گناہ کا صدور محال اور ممتنع تسلیم کیا جائے تو ان کے چھوڑ دینے پر انبیاء مکلف نہیں رہ سکتے اور چھوڑ دینے پر انہیں اجر وثواب بھی نہیں مل سکتا۔ حالانکہ وہ بھی عام بندگان خدا کی طرح گناہ چھوڑ دینے پر مکلف ہیں اور چھوڑ دینے پر اجر وثواب کے بھی مستحق ہیں یہی وجہ ہے کہ عصمت کی وہ تعریف علمائے علم کلامؒ نے فاسد قرار دی ہے جس میں انبیاء علیہم السلام سے گناہوں کا صدور محال اور ممتنع تسلیم کیا گیا ہے چنانچہ جن لوگوں نے عصمت کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ: ھی خاصیة فی نفس الشخص اوفی بدنه یمتنع بسببها صدور الذنب عنه (شرح عقائد) یعنی عصمت انسان معصوم کے نفس یا اس کے بدن میں ایک صفت اور خاصیت ہے جس کی وجہ سے انسان معصوم سے گناہ کا

صدور محال و ممتنع ہوتا ہے'' (شرح عقائد) تو اس پر علامہ سعد الدین تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے رد کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

هذا فاسد كيف ولو كان صدور الذنب ممتنعا لما صح تكليفه ترك الذنب ولما كان مثاباً عليه (شرح عقائد ص ۱۱۳) یہ تعریف اس بنا پر فاسد ہے کہ اس میں معصوم سے گناہ کا صدور ممتنع قرار دیا گیا ہے حالانکہ معصوم سے اگر گناہ کا صدور ممتنع ہوتا تو گناہ چھوڑنے پر وہ مکلف صحیح نہیں رہتا نہ اس کو گناہ چھوڑنے پر اجر وثواب مل سکتا ہے'' (ص ۱۱۳)

الجواب:

(۱) میں نے علمی محاسبہ میں تفہیمات کی عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''چونکہ انبیاء علیہم السلام کا فریضہ یہی ہے کہ وہ منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کریں اس لیے ان سے ایسی خطاؤں اور لغزشوں کا صدور محال ہونا چاہئے جو اس عظیم مقصد میں حارج ہوگا۔ اس پر مفتی صاحب موصوف نے علمی معیار پر بحث کرنے کی نصیحت کی ہے اور عصمت کی تعریف کرتے ہوئے میری اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ ''انبیاء سے ایسی خطاؤں اور لغزشوں کا صدور محال ہونا چاہئے'' حالانکہ خود مفتی صاحب ''عصمت عن الکفر والکذب'' کے عنوان کے تحت یہ لکھ چکے ہیں کہ:

''ایک دفعہ جب انبیاء علیہم السلام منصب رسالت اور مقام نبوت پر فائز ہوجاتے ہیں تو پھر کسی حالت میں بھی ان سے کفر سرزد نہیں ہوسکتا اور نہ تبلیغ دین یا کسی دوسرے معاملہ میں وہ جھوٹ بول سکتے ہیں''

(علمی جائزہ ص [illegible])

اب ہم مفتی صاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام جھوٹ

کیوں نہیں بول سکتے۔ کیا بعد از نبوت جھوٹ بولنے پر ان کو قدرت نہیں رہتی؟ اگر ان کو اس پر قدرت و اختیار نہیں ہوتا تو پھر وہ مکلّف کیونکر ہوں گے۔ اور جھوٹ نہ بولنے پر ان کو ثواب کیونکر ملے گا۔ اور اگر ان کو قدرت اور اختیار تو حاصل ہوتا ہے لیکن ان سے جھوٹ صادر نہیں ہوسکتا تو اس کا یہی مطلب ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے جھوٹ کا صدور ناممکن ہے اور ناممکن چیز کو ہی محال اور ممتنع سے تعبیر کیا جاتا ہے تو جو کچھ میں نے لکھا ہے کہ انبیاء سے گناہ کا صدور محال ہے، وہی آپ ان الفاظ میں لکھ چکے ہیں کہ انبیاء جھوٹ نہیں بول سکتے تو پھر مجھ پر الزام و اعتراض آپ کا بالکل غلط اور جہالت پر مبنی ہے۔

۲۔ معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب موصوف ماشاء اللہ خود ہی ممکن اور ممتنع اور ان کے اقسام کا فرق نہیں جانتے ورنہ ان کو مندرجہ حوالہ جات پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ میری مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے گناہ اور معصیت کا صدور ممکن بالذات اور محال اور ممتنع بالغیر ہے۔ یعنی ان کو معصیت پر قدرت تو حاصل ہے لیکن بوجہ عصمت کے ان سے شرعاً معصیت اور گناہ کا صدور نہیں ہوسکتا جیسا کہ محققین اہل سنت نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات پر تو قدرت حاصل ہے کہ وہ کافر اور مشرک کو جنت الفردوس میں داخل کردے لیکن وہ ایسا کرتا نہیں۔ چنانچہ بیضاوی میں ہے "وعدم غفران الشرک مقتضی لوعید فلا امتناع فیه لذاته" (اور شرک کا نہ بخشنا اللہ تعالیٰ کی وعید کا مقتضا ہے پس اس میں بالذات کوئی امتناع (یعنی استحالہ) نہیں ہے) یہ مسئلہ کتب کلامیہ میں مصرّح ہے، طوالت کے خوف سے عبارتیں چھوڑ دی ہیں۔ بہر حال مفتی صاحب کی زبوں حالی یہاں تک ہے کہ دوسروں کو علمی معیار قائم کرنے کی نصیحت کرتے خود علم سے کورے ہوگئے۔ اعاذنا اللہ من سوء الفهم۔

۳۔ تفہیمات کی عبارت پر جو میرا اعتراض تھا اس کا جواب مفتی صاحب نہیں دے سکے، کیونکہ میں نے تو مودودی صاحب کے اس نظریہ کے پیش نظر کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو

منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحۃً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے الخ

یہ اعتراض کیا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے خطاؤں اور لغزشوں سے اس لئے محفوظ فرمایا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرسکیں تو یہ مصلحت تو ان کی ساری معصومانہ زندگی کے لئے ہونی چاہئے جس کے لئے لازم ہے کہ ان سے کبھی بھی کوئی خطا اور لغزش سرزد نہ ہو اور یہ اعتراض مودودی موقف کی بنا پر وارد ہوتا ہے نہ کہ اہل سنت کے عقیدہ پر۔ کیونکہ اہل سنت کے نزدیک انبیاء کرام کی زلت اور لغزش کا تعلق فریضہ نبوت و رسالت سے نہیں ہوتا اس لئے ان کی زلت اور لغزش کی وجہ سے منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے میں کوئی نقصان نہیں آتا۔ بہر حال مفتی محمد یوسف صاحب اپنا سارا علمی زور لگانے کے باوجود عصمت انبیاء کی اس بحث میں عاجز رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق و نصرت سے میں نے ان کی حجت کا پورا پورا ابطال کردیا ہے، حق تعالیٰ مودودی جماعت کو انبیائے کرام علیہم السلام کی تنقیص اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توہین کے جرم سے توبہ کی توفیق عطا فرمائیں اور ہم سب کو مذہب اہل السنّت والجماعت کی اتباع اور خدمت کی ہمیشہ توفیق نصیب ہو، آمین۔

خادم اہل سنت

الاحقر مظہر حسین غفرلہ

۲۱ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ

مطابق ۲۹-اکتوبر ۱۹۷۲ء

عصمت انبیاء کی حقیقت

مفتی محمد یوسف صاحب نے جواب الجواب میں بعنوان ''یہ اتمام حجت کا آغاز ہے'' ہفت روزہ آئین لاہور میں جو قسطیں شائع کی ہیں ان کا مسکت جواب گذشتہ اوراق میں ''ابطال حجت'' کے عنوان سے عرض کردیا گیا ہے جس کے بغور مطالعہ کے بعد ہر صاحبِ فہم اور طالبِ حق مسلمان پر واضح ہوجائے گا کہ مفتی صاحب باوجود اپنی پوری علمی کاوشوں کے اپنے امام ومقتدا مودودی صاحب کے نظریہ عصمتِ انبیاء کو صحیح نہیں ثابت کرسکے لیکن مفتی صاحب نے مسئلہ عصمت انبیاء میں مودودی نظریہ کا دفاع کرتے ہوئے جو مختلف اقوال نقل کئے ہیں ان کی وجہ سے بعض ناواقف اور سطحی نظر والے قارئین اس غلط فہمی میں مبتلا ہوسکتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام بوجہ انسان ہونے کے مطلقاً گناہوں سے معصوم نہیں ہیں اور ان سے صغیرہ یا کبیرہ گناہ سرزد ہوجاتے ہیں اور چونکہ عصمتِ انبیاء کا مسئلہ اسلام کا ایک بنیادی اور اصولی مسئلہ ہے جس کا اعتراف خود مفتی صاحب موصوف بھی کرچکے ہیں اس لئے اس امر کی ضرورت سمجھی گئی ہے کہ ''عصمت انبیاء کی حقیقت'' کے مستقل عنوان کے تحت اس مسئلہ پر بحث کرکے شبہات واعتراضات کا ازالہ کردیا جائے وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

عصمت کا لغوی اور شرعی معنی:

عربی لغت میں عصمت کا معنی ہے بچانا۔ روک لینا۔ بچاؤ۔ محفوظ رکھنا۔ (ملاحظہ ہو المنجد وغیرہ) اسی سے عاصم اسم فاعل ہے یعنی بچانے والا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے کافر بیٹے کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

لا عاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم (سورۃ ھود رکوع ۴) ''آج اللہ کے حکم (یعنی قہر سے) کوئی بچانے والا نہیں۔ لیکن جس پر وہی رحم کرے۔'' (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

اور معصوم اسم مفعول ہے جس کا معنی ہے۔ بچایا ہوا۔ محفوظ رکھا ہوا۔ اور شرعی اصطلاح میں عصمت کا معنی گناہوں سے بچانے کے ہیں۔ اور معصوم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچاتا ہے اور اس سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوسکتا۔ اہل السنت والجماعت کے نزدیک اولاد آدم میں معصوم صرف انبیائے کرام علیہم السلام ہیں۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غیر نبی سے ضرور گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعض وہ بندے بھی گناہوں سے ساری عمر محفوظ رہتے ہیں جو پیغمبر نہیں ہیں۔ اور ایسے حضرات کو اصطلاحاً محفوظ کہا جاتا ہے۔ معصوم اور محفوظ میں یہ فرق ہے کہ معصوم سے تو گناہ کا صدور ہو ہی نہیں سکتا اور محفوظ (غیر نبی) سے گناہ سرزد تو ہوسکتا ہے لیکن فضلِ خداوندی کے تحت اس سے گناہ واقع نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ عصمت انبیاء کرام کی خصوصی صفت ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتی۔

عصمت انبیاء کا ثبوت قرآن مجید سے:

قرآن مجید میں گو انبیائے کرام کے لئے معصوم کا لفظ مذکور نہیں ہے لیکن شرعی اصطلاح میں معصوم ہونے کا جو مطلب ہے وہ قرآن مجید کی محکم آیات سے ثابت ہے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ چونکہ عصمت نبوت کے لوازم میں سے ہے اس لئے ہر نبی میں اس صفت خاصہ کا پایا جانا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اگر لوازم نبوت میں سے کوئی بات ایک نبی کے لئے ثابت ہوجائے تو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے لئے اس کا تسلیم کرنا ضروری ہوگا کیونکہ نبوت میں سب برابر کے شریک ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رتبہ اور کمال میں سب انبیاء برابر ہیں۔ اور ان کو ایک دوسرے پر فضیلت وفوقیت حاصل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انبیاء کرام علیہم السلام کی ایک دوسرے پر فضیلت کی صراحت فرمادی ہے۔ تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض ○ (یہ پیغمبر ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دے دی ہے) اس پر ایک اور شبہ واقع ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تفضلوا بین الانبیاء (انبیاء کو ایک

دوسرے پر فضیلت نہ دو) تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبوت کے اعتبار سے تو سب برابر ہیں۔ لیکن دوسرے کمالات وخصوصیات کی وجہ سے ان کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہے چنانچہ امام قرطبیؒ اس شبہ کے جواب میں فرماتے ہیں: ان المنع من التفضیل هو من جهة النبوة التي هي خصلة واحدة لاتفاضل فيها وانما التفاضل في الاحوال والخصوص والكمالات. (تفسیر قرطبی جلد دوم)

"یعنی انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت دینے سے جو منع فرمایا گیا ہے وہ صرف نبوت کی جہت (پہلو) سے ہے جو ایک ہی خصلت (صفت) ہے جس میں باہمی تفاضل نہیں ہے اور ان کو آپس میں جو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہے وہ ان کے احوال، خصوصیات اور کمالات کی بنا پر ہے"۔

قرآن حکیم میں انبیائے کرام علیہم السلام کی عصمت متعدد پہلوؤں سے ثابت ہوتی ہے جس پر حسب ذیل آیات صراحۃً دلالت کرتی ہیں۔

انتخاب خداوندی:

آیت نمبر (۱) اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلاً و من الناس

(پ۱۷ سورہ الحج رکوع ۱۰)

ترجمہ (الف) "اللہ چھانٹ لیتا ہے فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں" (حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ)

(ب) اللہ تعالیٰ (کو اختیار ہے رسالت کے لئے جس کو چاہتا ہے) منتخب کرلیتا ہے فرشتوں میں سے (جن فرشتوں کو چاہے) احکام پہنچانے والے۔ (جو مقرر فرمادیتا ہے) اور (اسی طرح) آدمیوں میں سے"

(حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنا پیغام پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ خود ہی فرشتوں میں سے بھی چھانٹ لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ مقصد یہ ہے کہ وہ فرشتے

اللہ تعالیٰ کا پیغام پیغمبروں تک پہنچاتے ہیں اور پھر پیغمبر اس پیغام خداوندی کو دوسرے لوگوں تک پہنچادیتے ہیں اور فرشتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے: لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون مایؤمرون○ (پ۲۸ سورۃ التحریم رکوع ۱)

ترجمہ (الف) "بے حکمی نہیں کرتے اللہ کی جو بات ان کو فرمادی اور وہی کرتے ہیں جو حکم ہو" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) خدا کی ذرا نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو (فوراً) بجالاتے ہیں" (حضرت تھانویؒ)

اس آیت میں تصریح ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم میں نافرمانی نہیں کرتے۔ جس سے یہ لازم آتا ہے کہ پیغمبر بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے کیونکہ اپنا پیغام پہنچانے کے لئے خود اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھی اور پیغمبروں کو بھی چھانٹتا ہے۔ اس لئے پیغام خداوندی (فریضہ رسالت) پہنچانے میں معصوم ہونا (اور اس میں کوتاہی نہ کرنا، اور حکم خداوندی کی نافرمانی نہ کرنا) فرشتوں کی طرح انبیائے کرام کے لئے بھی لازم ہوگا۔ ورنہ اگر فرشتوں کو تو پیغام خداوندی پہنچانے میں معصوم مانیں (کہ ان سے پیغام خداوندی اور فریضہ رسالت کی ادائیگی میں بالکل کوتاہی نہیں ہوتی) اور انبیائے کرام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیوں کا صدور مانیں (جیسا کہ مفتی محمد یوسف صاحب نے مودودی صاحب کی تقلید میں حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیوں کا صدور تسلیم کیا ہے) تو العیاذ باللہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ سے بھی انبیائے کرام کے انتخاب میں کوتاہی ہوگئی ہے۔

(ب) آیت انھم عندنا لمن المصطفین الاخیار (پ۲۳ سورۃ ص رکوع ۴)

ترجمہ: (الف) اور وہ سب ہمارے پاس ہیں چنے نیک لوگوں میں" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) اور وہ حضرات ہمارے یہاں منتخب اور سب سے اچھے لوگوں میں سے ہیں"۔ (مولانا تھانویؒ) علامہ سید آلوسی مصری اس آیت کے تحت لکھتے

ہیں: وجہ الاصطفاء فی جمیع الرسل انہ سبحانہ خصھم بالنفوس المقدسیۃ وما یلیق بھا من الملکات الروحانیۃ والکمالات الجسمانیۃ حتیٰ انھم امتازوا کما قیل علی سائر الخلق خلقا و خلقا وجعلوا خزائن اسرار اللہ تعالیٰ ومظھر اسمائہ وصفاتہ ومحل تجلیہ الخاص من عبادہ ومھبط وحیہ ومبلغ امرہ ونھیہ وھذا ظاھر فی المصطفین المذکورین فی الآیۃ من الرسل۔ (روح المعانی جلد۳)

''اور تمام پیغمبروں کے چنے ہوئے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نفوس قدسیہ سے مختص کیا ہے اور ان کو روحانی ملکات اور جسمانی کمالات سے جو ان کی شان کے لائق ہیں حتیٰ کہ جیسا کہا گیا ہے کہ وہ تمام مخلوق سے صوری اور معنوی کمالات میں ممتاز ہوگئے ہیں اور وہ اسرار خداوندی کے خزانے بنادیئے گئے ہیں، وہ اس کے اسماء وصفات کے مظہر ہیں وہ اس کے بندوں میں سے اس کی تجلی خاص کے محل ہیں اور اس کی وحی اترنے کی جگہ ہیں اور اس کے امر اور نہی کے مبلغ ہیں اور آیت میں اللہ تعالیٰ کے جن منتخب شدہ پیغمبروں کا ذکر ہے ان میں یہ صفات بالکل ظاہر ہیں''۔

آیت نمبر (۲) اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ (پ ۸ سورۃ الانعام رکوع ۱۵)

ترجمہ (ا) اللہ بہتر جانتا ہے جہاں بھیجے اپنا پیغام (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) اس موقع کو تو خدا ہی خوب جانتا ہے جہاں بھیجے اپنا پیغام (وحی کے ذریعہ سے بھیجتا ہے)'' (مولانا تھانویؒ)

اس آیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے پیغمبروں کا انتخاب کرتا ہے اور نبوت و رسالت کسبی نہیں کہ کسی کو اس کی سابقہ محنت و اطاعت کی بنا پر عطا کی جائے بلکہ یہ ایک عظیم الشان وہبی نعمت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنا انتخاب ہے جس کو چاہے اپنی حکمت کے ماتحت پیغمبر بنادے لیکن

اس کے انتخاب میں کسی طرح کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کوتاہی بھی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ وہ علی کل شئ قدیر ہے اور بکل شئ علیم ہے، وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے اور ہر ہر چیز کو خوب اچھی طرح جانتا ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں ''خیر یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ کون شخص اس کا اہل ہے کہ منصب پیغمبری پر سرفراز کیا جائے اور اس عظیم الشان امانت الٰہیہ کا حامل بن سکے''

(حواشی ترجمہ قرآن از شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب اسیر مالٹا قدس سرہٗ)

فریضہ تبلیغ رسالت:

آیت نمبر (۳) الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ (پ۲۲، سورۃ الاحزاب ع ۵)

ترجمہ (الف) '' وہ جو پہنچاتے ہیں پیغام اللہ کے اور ڈرتے ہیں اس سے اور نہیں ڈرتے کسی سے سوائے اللہ کے'' (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) ''یہ سب پیغمبران گذشتہ ایسے تھے کہ اللہ کے احکام پہنچایا کرتے تھے اور اس باب میں اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے''

(مولانا تھانویؒ)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں کے متعلق اعلان فرمایا ہے کہ وہ اس کے پیغامات لوگوں تک پہنچاتے رہے ہیں اور اس فریضہ رسالت کی ادائیگی میں ان کو کسی غیر اللہ کا خوف لاحق نہیں ہوتا تھا۔

آیت نمبر (۴) قل انی لن یجیرنی من اللہ احد و لن اجد من دونہ ملتحداً ○ الا بلاغاً من اللہ ورسلتہ ط (پ۲۹ سورہ جن ع ۲)

ترجمہ (ا) ''تو کہہ مجھ کو نہ بچاوے گا اللہ کے ہاتھ سے کوئی اور نہ پاؤں گا اس کے سوا سرک رہنے کو کہیں جگہ۔ مگر پہنچانا ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے

پیغام دینے۔" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) آپ کہہ دیجئے کہ (اگر خدانخواستہ میں ایسا کروں تو) مجھ کو خدا (کے غضب) سے کوئی نہیں بچاسکتا اور نہ میں اس کے سوا کوئی پناہ (کی جگہ) پاسکتا ہوں۔ لیکن خدا کی طرف سے پہنچانا اور اس کے پیغاموں کا ادا کرنا یہ میرا کام ہے۔"

(حضرت تھانویؒ)

اس آیت میں خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ اعلان کرایا ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے پیغامات و احکام لوگوں تک پہنچادئے ہیں۔ تو کیا اس قسم کے اعلان کے بعد بھی یہ نظریہ قائم کیا جاسکتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ نابینا صحابی کے بارے میں فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگئی جیسا کہ مفتی محمد یوسف صاحب نے پیش کیا ہے۔

آیت نمبر (۵) عالم الغیب فلا یظهر علی غیبه احداً ○ الا من ارتضی من رسول فانه یسلک من بین یدیه و من خلفه رصدا ○ لیعلم ان قد ابلغوا رسلت ربهم واحاط بما لدیهم واحصی کل شئی عددًا ○

(پ۲۹ سورۃ الجن ع۲)

ترجمہ: (ا) جاننے والا بھید کا، سو نہیں خبر دیتا اپنے بھید کی کسی کو مگر جو پسند کرلیا کسی رسول کو۔ تو وہ چلاتا ہے آگے پیچھے چوکیدار۔ تاکہ جانے کہ انہوں نے پہنچائے پیغام اپنے رب کے اور قابو میں رکھا ہے جو ان کے پاس ہے اور گن لی ہے ہر چیز کی گنتی۔ (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) (اور) غیب کا جاننے والا وہی ہے سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ہاں اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو تو (اس طرح اطلاع دیتا ہے کہ) اس پیغمبر کے آگے اور پیچھے محافظ فرشتے بھیج دیتا ہے (اور یہ انتظام اس لئے کیا جاتا

ہے) تاکہ (ظاہری طور پر) اللہ کو معلوم ہو جائے کہ ان فرشتوں نے اپنے پروردگار کے پیغام (رسول تک بحفاظت) پہنچادئے اور اللہ ان پہرہ داروں کے تمام احوال کا احاطہ کیئے ہوئے ہے اور اس کو ہر چیز کی گنتی معلوم ہے۔"

(مولانا تھانویؒ)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغامات و احکامات بندوں تک صحیح طور پر پہنچانے کے لئے ہی اپنی وحی فرشتوں کی حفاظت میں نازل کرتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ ہوسکے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحبؒ اس آیت کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

"یعنی اپنے بھید کی پوری خبر کسی کو نہیں دیتا۔ ہاں رسولوں کو جس قدر ان کی شان و منصب کے لائق ہو بذریعہ وحی خبر دیتا ہے۔ اس وحی کے ساتھ فرشتوں کے پہرے اور چوکیاں رکھی جاتی ہیں کہ کسی طرف سے شیطان اس میں دخل کرنے نہ پائے اور رسول کا اپنا نفس بھی غلط نہ سمجھے یہی معنی ہیں اس بات کے کہ پیغمبروں کو (اپنے علوم و اخبار میں) عصمت حاصل ہے، اوروں کو نہیں۔ انبیاء کی معلومات میں شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی۔ دوسروں کی معلومات میں کئی طرح کے احتمال ہیں اس لئے محققین صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ولی اپنے کشف کو قرآن و سنت پر عرض کرکے دیکھے اگر ان کے مخالف نہ ہو تو غنیمت سمجھے ورنہ بے تکلف رد کردے۔ یہ زبردست انتظامات اس غرض سے کئے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ لے کہ فرشتوں نے پیغمبروں کو یا پیغمبروں نے دوسرے بندوں کو اس کے پیغامات ٹھیک ٹھیک بلا کم و کاست پہنچادیئے ہیں۔"

آیت نمبر (۶): وان تکذبوا فقد کذب امم من قبلکم ط وما علی الرسول الا البلاغ المبین ○ (پ۲۰ سورہ عنکبوت ع۲)

ترجمہ (ا) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اور اگر تم جھٹلاؤ گے تو جھٹلا چکے ہیں بہت

فرقے تم سے پہلے اور رسول کے ذمہ یہی ہے پہنچا دینا کھول کر" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) اور اگر تم لوگ مجھ کو جھوٹا سمجھو تو (میرا کچھ نقصان نہیں کیونکہ) تم سے پہلے بھی بہت سی امتیں (اپنے پیغمبروں کو) جھوٹا سمجھ چکی ہیں (اور ان کا بھی کچھ نقصان نہیں ہوا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ) پیغمبر کے ذمہ تو صرف (بات کا) صاف طور پر پہنچا دینا ہے" (مولانا تھانویؒ)

اس آیت میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بھی اس حقیقت کا اعلان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اللہ کا پیغام اور حکم لوگوں تک صاف صاف پہنچا دیتے ہیں۔ اور اس میں وہ کسی طرح کی کوتاہی نہیں کر سکتے۔ اس آیت سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ انبیائے کرام صرف پیغام رساں ہوتے ہیں۔ اور اس پیغام وحی خداوندی کی تشریح وتبیین اور امت کی تربیت وتزکیہ ان کے فرائض نبوت میں شامل نہیں ہیں جیسا کہ منکرین حدیث چکڑالوی اور پرویزی پارٹی کا نظریہ ہے۔ کیونکہ دوسری آیات میں وحی خداوندی پہنچانے کے علاوہ ان کے دوسرے فرائض رسالت بھی صاف صاف مذکور ہیں۔ چنانچہ امام الانبیاء والمرسلین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ○ (پ ۲۸ سورۃ الجمعہ ع ۱)

ترجمہ: (ا) وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول ان ہی میں کا، پڑھتا ان کے پاس اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا اور سکھاتا کتاب اور عقلمندی اور اس سے پہلے پڑے تھے وہ صریح بھلاوے میں (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں ان ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ اور اخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی (کی باتیں) سکھلاتے ہیں۔ اور یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے"۔ (مولانا تھانویؒ)

آیت نمبر (۷) یقوم لیس بی ضلالة ولکنی رسول من رب العلمین ○ ابلغکم رسلت ربی وانصح لکم واعلم من الله مالا تعلمون.

(پ ۸ سورۃ الاعراف ع ۸)

ترجمہ (ا) "بولا اے میری قوم میں ہرگز بہکا نہیں، لیکن میں بھیجا ہوا ہوں جہان کے پروردگار کا، پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور نصیحت کرتا ہوں تم کو اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) "انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم مجھ میں تو ذرا بھی غلطی نہیں لیکن میں پروردگار عالم کا رسول ہوں، تم کو اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں خدا کی طرف سے ان امور کی خبر رکھتا ہوں جن کی تم کو خبر نہیں"۔ (مولانا تھانویؒ)

ان آیات میں اپنی قوم سے یہ خطاب حضرت نوح علیہ السلام کا ہے جو ساڑھے نو سو سال اپنی قوم میں تبلیغ فرماتے رہے ہیں۔ آپ اتمام حجت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے تو تم تک اللہ تعالیٰ کے پیغامات ٹھیک ٹھیک پہنچا دیئے ہیں جو انتہائی خیر خواہی اور نصیحت پر مبنی ہیں۔ ان کے بعد اسی سورۃ میں حضرت ہود علیہ السلام کا تذکرہ ہے اور آپ نے بھی قوم سے یہ فرمایا ہے۔

قال یقوم لیس بی سفاهة ولکنی رسول من رب العلمین ○ ابلغکم رسلت ربی وانا لکم ناصح امین ○ (الاعراف ع ۹)

ترجمہ (ا): بولا۔ اے قوم میں کچھ بے عقل نہیں۔ لیکن میں بھیجا ہوا ہوں جہان کے پروردگار کا۔ پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ میں ذرا بھی کم عقلی نہیں لیکن میں پروردگار عالم کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔ تم کو اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا

ہوں اور میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں"۔ (مولانا تھانویؒ) ان کے بعد حضرت صالح علیہ السلام کا بھی اپنی قوم سے اسی طرح کا خطاب مذکور ہے۔

قال یقوم لقد ابلغتکم رسالة ربی ونصحت لکم ولکن لا تحبون الناصحین O (الاعراف، ع ۱۰)

ترجمہ (ا) اے قوم میں پہنچا چکا تم کو پیغام اپنے رب کا اور بھلا چاہا تمہارا لیکن تم نہیں چاہتے بھلا چاہنے والوں کو (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) اور فرمانے لگے کہ اے میری قوم میں نے تم کو اپنے پروردگار کا حکم پہنچا دیا تھا اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی۔ لیکن تم لوگ خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے تھے"۔ (مولانا تھانویؒ)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ تمام پیغمبر اپنی امت تک فریضہ رسالت ٹھیک ٹھیک پہنچاتے رہے ہیں اور اس میں ان سے کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ورنہ بطور اتمام حجت کے قوم کو خطاب کر کے یوں نہ فرماتے کہ ہم نے اپنے رب کے پیغامات واحکام تم تک پہنچا دیئے ہیں۔

اتمامِ حجت:

آیت نمبر (۸) رسلاً مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجة بعد الرسل و کان اللہ عزیزاً حکیماً O (پ ۶ سورۃ النساء ع ۲۳)

ترجمہ (ا) بھیجے پیغمبر خوشخبری اور ڈر سنانے والے تا کہ باقی نہ رہے لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع رسولوں کے بعد۔ اور اللہ زبردست ہے حکمت والا"۔ (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) "ان سب کو خوشخبری دینے والے اور خوف سنانے والے پیغمبر بنا کر اس لئے بھیجا کہ تا کہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہے اور اللہ تعالیٰ پورے زور والے ہیں بڑی حکمت والے ہیں۔ (مولانا تھانویؒ)

اس آیت نے وضاحت کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام کو بھیجنے کا مقصد اتمامِ حجت ہی ہوتا ہے تا کہ منکرین و معاندین کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہے۔ لیکن مودودی صاحب کا اور ان کی تقلید میں مفتی محمد یوسف صاحب کا اس آیت کے خلاف نظریہ یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم پر اتمام حجت نہیں کر سکے تھے۔ اس مسئلہ کی بحث "علمی محاسبہ" سے دوبارہ مطالعہ کر لی جائے۔

آیت تبلیغ:

آیت نمبر (۹) یآ ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالته ط واللہ یعصمک من الناس ط

(پ ۶۔ سورۃ المائدہ ع ۱۰)

ترجمہ (ا) "اے رسول پہنچا دے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے اور اگر ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام اور اللہ تجھ کو بچا لے گا لوگوں سے" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) "اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ (لوگوں کو) سب پہنچا دیجئے اور اگر (بفرض محال) ایسا نہ کریں گے تو آپ نے اللہ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا (کیونکہ یہ مجموعہ فرض ہے تو جیسا کل کے اخفاء سے یہ فوت ہوتا ہے اسی طرح بعض کے اخفاء سے بھی وہ فرض فوت ہوتا ہے) اور (تبلیغ کے باب میں کفار کا کچھ خوف نہ کیجئے کیونکہ) اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے (یعنی اس سے کہ آپ کو مقابل ہو کر قتل و ہلاک کر ڈالیں) محفوظ رکھے گا"۔ (مولانا تھانویؒ)

علامہ شبیر احمد عثانی صاحبؒ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

"اگر بفرض محال کسی ایک چیز کی تبلیغ میں بھی آپ سے کوتاہی ہوئی تو بحیثیت رسول (خدا کا پیغامبر) ہونے کے رسالت و پیغام رسانی کا جو منصب

جلیل آپ کو تفویض ہوا ہے سمجھا جائے گا کہ آپ نے اس کا حق کچھ بھی ادا نہ کیا ___ حضور ﷺ کے اس احساس قوی اور تبلیغی جہاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے وظیفہ تبلیغ میں مزید استحکام و تثبیت کی تائید کے موقع پر مؤثر ترین عنوان یہ ہی ہوسکتا تھا کہ حضور کو یآ ایھا الرسول سے خطاب کر کے صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ اگر بفرض محال تبلیغ میں ادنیٰ سی کوتاہی ہوئی تو سمجھو کہ آپ اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے _ لہٰذا یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ کسی ایک پیغام کے پہنچانے میں بھی ذرا سی کوتاہی کریں گے''۔

اس آیت کو آیتِ تبلیغ کہتے ہیں جس میں خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ نے حضور رحمۃ للعالمین خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کے فریضہ رسالت کی اہمیت واضح فرمائی گئی ہے اور اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انبیائے کرام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوسکتی۔ اس بارے میں ان حضرات کو قطعی عصمت حاصل ہے۔ کیونکہ اگر بالفرض فریضہ رسالت میں ان سے کوتاہی ہوجائے تو پھر مقصدِ رسالت ہی فوت ہوجاتا ہے اور بعثت انبیاء علیہم السلام میں حکمت خداوندی کی حیثیت ہی ختم ہوجاتی ہے۔

اور آیت نمبر ۳ کی زیر بحث آیت تبلیغ تک تمام آیات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام سے فریضہ رسالت کے دائرہ میں کوتاہی کا صدور محال ہے اور فریضہ رسالت کے بارے میں عصمت انبیاء کا یہ عقیدہ اجماعی ہے جس کے خلاف ابوالاعلیٰ مودودی اور مفتی محمد یوسف کے اوہام واختراعات کسی درجہ میں بھی قابل اعتناء نہیں ہیں۔ آیت تبلیغ کی بحث "علمی محاسبہ" میں بھی گذر چکی ہے۔ محدث کبیر حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور ومقبول کتاب الشفاء میں لکھتے ہیں:

تقدم الكلام فى قتل القاصد لِسبّه والإزْراء به و غمصِه بأىّ وجهٍ كانَ من ممكن أوْ مُحالٍ فهذا وجه بين لا اشكال فيه. الوجه

الثانى لا حق به فى البيان والجلاءِ وهو أن يكونَ القائلُ لما قالَ فى جهته ﷺ غير قاصد للسبّ والإزراءِ ولا مُعتقدٍ لهُ ولكنه تكلم فى جهته ﷺ بكلمة الكفر من لعنه أو سبه أو تكذيبه أو اضافة ما لا يجوز عليه أو نفى ما يجب له مِمّا هُوَ فى حقه ﷺ نقيصة مثل أن ينسب اليه اتيان كبيرة أو مداهنة فى تبليغ الرِّسالة أو فى حكم بين النّاس أو يَغُضّ من مرتبته أو شَرَفِ نَسَبِه أو وفور علمه أو زُهده أو يكذب بما اشتهر من امور أخبرَ بها ﷺ وتواتر الخبر بها عن قصدٍ لردّ خبره أو يأتى بسفه من القول أو قبيح من الكلام ونوع من السَّبِّ فى جهته وان ظهر بدَليل حالِهِ أنه لم يعتمد ذمَّهُ ولم يقصد سبه امّا لِجهالةٍ حملته على ما قالهُ أو لفجر أو سكر اضْطَرَّهُ اليه أو قِلّةِ مُراقبة وضبطٍ لِلسانه وعجرفةٍ وتهَوُّرٍ فى كلامه فحُكمُ هذا الوجه حكم الوجه الأوّل القتلُ دُون تلعثم اذ لا يعذر أحد فى الكفر بالجهالةِ ولا بِدَعوىٰ زلل اللّسان ولا بشئٍ مِمّا ذكرناه اذا كان عقله فى فطرته سليمًا الّا مَنْ أُكره وقلبه مُطْمَئِنٌّ بالإيمان وبهذا أفتى الأندلسيون على ابن حاتم فى نفيه الزُّهدَ عنْ رسول الله ﷺ الّذى قدّمْناهُ.

''اس شخص کے قتل میں پہلے کلام گذر چکا ہے جو کوئی آپ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قصداً گالی دے یا آپ کی منقصت کرے یا آپ کو کوئی عیب لگادے اور یہ (تعییب) اور تنقیص کسی امر ممکن کے ساتھ یا محال کے ساتھ، سو یہ وجہ تو بالکل ظاہر اور روشن ہے اس میں کسی قسم کا اشکال نہیں اور دوسری وجہ جو بیان اور ظہور میں اسی وجہ سے ملحق ہے اور وہ یہ ہے کہ قائل کا اسی

امر سے جو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم کی شان میں کیا ہے آپ کو گالی اور آپ کی تحقیر کرنا مقصود نہ ہو اور نہ وہ اس کا مستحق ہو لیکن اس نے آپؐ کی شان میں کوئی کلمہ کفر بکا ہے، مثلاً آپ کو لعنت کی ہے یا آپ کو گالی دی ہے یا آپ کی تکذیب کی ہے یا ان امور میں سے جو آپ کے حق میں منقصت ہیں، آپ کی جانب کوئی ایسا امر منسوب کیا ہے جو آپ پر ناجائز ہے یا آپ سے کسی ایسے امر کی نفی کی جس کا کہ آپ کے لئے ہونا ضروری ہے مثلاً کہے کہ آپ سے گناہ کبیرہ صادر ہوا ہے یا آپ نے تبلیغ رسالت یا تبلیغ احکام میں کوتاہی کی ہے کہ آپ نے جیسا کہ چاہئے لوگوں کو احکام الٰہی نہیں پہنچائے یا آپؐ کی مرتبت عالی اور شرافت نسب اور مزید علم یا زہد وغیرہ کی تنقیص کرے اور آپؐ کو ناقص جانے یا امور مشہورہ میں سے جن کی کہ آپ نے خبر دی ہے اور وہ حد تواتر کو پہنچ چکے ہیں کسی خبر کی بارادہ رد و تکذیب کرے یا آپ کی شان میں کوئی بے ہودہ اور بری بات کہے اور آپ کو گالی دے گو اس کی حالت ظاہری سے یہ امر معلوم ہوتا ہو کہ اس نے یہ بات آپؐ کی مذمت اور گالی کی غرض سے نہیں کہی ہے چاہے تو یہ بات اس نے جہالۃً کہی ہو یا کسی تنگی (او بضجر) اور ملال یا نشہ کے سبب سے کہی ہو جس نے اس کو اس بے ہودگی پر مجبور کیا ہو یا قلت مراقبہ اور عدم ضبط لسان اور لاپرواہی اور دلیری اس بے ہودگی کا باعث ہوئی ہو کہ (ان تمام صورتوں میں) اس وجہ کا بھی وہی حکم ہے جو پہلی وجہ کا ہے کہ یہ شخص بلا تاخیر قتل کیا جاوے۔ کیونکہ جہالت اور دعویٰ زلت لسانی یا امور مذکورہ میں سے کسی امر کے سبب انسان کفر میں معذور نہیں سمجھا جاتا بشرطیکہ وہ فطرت عقل سلیم رکھتا ہو' الخ (شمیم الریاض ترجمہ شفاء قاضی عیاضؒ جلد دوم ص ۲۷۹، مطبوعہ نولکشور لکھنوی مارچ ۱۹۱۴ء، مطابق ماہ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ)

مندرجہ عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے کبیرہ گناہ کا ارتکاب ہوا ہے یا حضور نے تبلیغ رسالت یا تبلیغ احکام میں کوتاہی کی ہے وہ اس شخص کی طرح واجب القتل مجرم ہے جو العیاذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دے۔ گو اس کا ارادہ تنقیص و توہین کرنے کا نہ ہی ہو۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ عبرت۔ عبرت۔ عبرت۔

شیعہ نظریہ عصمت:

گو شیعوں کا بظاہر یہ عقیدہ ہے کہ وہ انبیائے کرام کو نہ صرف صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے بلکہ نسیان و سہو سے بھی معصوم مانتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے وہ از روئے تقیہ انبیائے کرام علیہم السلام سے اظہار کفر بھی تسلیم کرتے ہیں اور فریضہ رسالت کی ادائیگی میں بھی ان کو ٹال مٹول کرنے والا مانتے ہیں اور زیر بحث آیت تبلیغ میں تو ان کی روایات عجیب وغریب ہیں۔ جن سے عصمت و رسالت انبیاء کی خصوصیت ہی ختم ہو جاتی ہے چنانچہ آیت: یآ ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک کے تحت مشہور شیعہ مفسر مولوی مقبول احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ:

کافی[1] میں ہے کہ جناب امام محمد باقر[2] علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرا فریضہ برابر نازل ہوتا رہتا تھا اور ولایت و امامت سب سے آخری فریضہ ہے۔ اس کے نازل ہو چکنے کے بعد خدا تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔

---

(۱) شیعہ مذہب کا مدار چار کتابوں پر ہے۔ ۱- کافی (جس کے دو حصے ہیں) اصول کافی اور فروع کافی ۲- تہذیب الاحکام۔ ۳- الاستبصار۔ ۴- من لا یحضرہ الفقیہ، ان سب میں سے زیادہ صحیح کافی ہے۔ کتاب کافی کی مفصل بحث میری کتاب بشارت الدارین بالصبر علی شہادۃ الحسینؓ میں مذکور ہے۔

(۲) بقول امام محمد باقر جب حضرت علیؓ کی ولایت و امامت کا فریضہ سب سے آخر میں نازل ہوا تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قبل ازیں مکی اور مدنی زندگی میں رسول اللہؐ نے کلمہ اسلام میں حضرت علیؓ کی ولایت وخلافت بلا فصل کا اقرار کبھی نہیں کرایا اور یہ آجکل شیعوں نے جو کلمہ اسلام میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ وصی رسول اللہ وخلیفۃ بلا فصل اختیار کرلیا ہے یہ خود ساختہ اور بے بنیاد ہے اس کو کلمہ اسلام و ایمان ماننے کا عقیدہ صریح کفر ہے۔

"گویا خدا تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ اب میں کوئی اور واجب نازل نہ کروں گا تمہارے لئے تمام واجبات کو پورا کرچکا"۔ اس کے بعد مولوی مقبول احمد نے احتجاج طبرسی سے ایک طویل روایت پیش کی ہے جو امام محمد باقرؒ سے مروی ہے اس میں یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ:

"پس اے محمدؐ آپ علیؓ کو علم ہدایت قائم کردیں اور ان کے لئے بیعت لے لیں اور میرے عہد کی ان لوگوں کے ساتھ پھر تجدید کریں اور جو پیمان ان سے آپ لے چکے ہیں اسے پھر لے لیں اس لئے کہ میں آپ کو اٹھانے والا اور اپنے حضور میں بلانے والا ہوں پس جناب رسول خدا اپنی قوم سے عموماً اور اہل نفاق وشقاق سے خصوصاً اندیشہ ناک تھے کہ پھوٹ ڈالیں گے اور کفر کی طرف عود کریں گے چونکہ ان کی عداوت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ علیؓ مرتضی کی طرف سے کیا کینہ ان کے دلوں میں بھرا ہوا ہے۔ پس حضرت نے جبرئیل امین سے کہا کہ پروردگار عالم سے یہ سوال کرو کہ لوگوں کے شر سے مجھے محفوظ رکھے۔ اور اس بات کے منتظر رہے کہ جبرئیل امین خدا کی طرف سے حفاظت کی ضمانت لائیں۔ اس لئے اس حکم کو پہنچانے میں اس وقت تک تاخیر کی کہ مسجد خیف میں پہنچے۔ پس جس وقت مسجد خیف میں پہنچے ہیں تو جبرئیل امین پھر یہ حکم لائے کہ لوگوں سے عہد لو اور علیؓ مرتضی کو علم ہدایت قائم کرو۔ مگر اس وقت تک من جانب اللہ حفاظت کا وعدہ نہیں آیا جو حضرت کا مقصود تھا۔ پھر حضرت روانہ ہوئے یہاں تک کہ مکہ اور مدینہ کے مابین کراع الغمیم تک پہنچے پھر جبرئیل امین آئے اور وہی حکم من جانب اللہ لائے جو پہلے آچکا تھا مگر حفاظت کا وعدہ اب بھی نہیں تھا۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اے جبرئیل مجھے اپنی قوم سے اندیشہ ہے اور یہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے اور علیؓ کے بارے میں میرے قول کو قبول نہ کریں گے۔ پھر حضرت روانہ ہوگئے اور جب غدیر خم پر پہنچے جو

جحفہ کے سامنے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس وقت جبرئیل امین ایسے وقت کہ ٹھیک پانچ گھنٹے دن چڑھا۔ انتہائی تاکیدی حکم سے وعدہ عصمت و حفاظت لے کر آئے۔ اور کہا کہ یا رسول اللہ! خدا تعالیٰ آپ کو سلام پہنچاتا ہے اور یہ فرماتا ہے یآ ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس ان اللہ لا یھدی القوم الکفرین O (ضمیمہ مقبول بنام اشارات تفسیر ص۱۰۲، ۱۰۳)

یہی روایت آیت تبلیغ کے بارے میں شیعوں کے رئیس المحدثین علامہ باقر مجلسی نے اپنی ضخیم کتاب حیات القلوب جلد دوم میں درج کی ہے۔ اس روایت پر تبصرہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جب حکم خداوندی کی تعمیل میں امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جان کے خوف سے یوں پس وپیش کریں تو العیاذ باللہ ایسی نبوت ورسالت کیونکر قابل اعتماد رہ سکتی ہے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے خوف سے اللہ تعالیٰ کی وحی کو یوں نظر انداز فرماتے رہے تو پھر اس بات پر کیسے یقین حاصل ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی قرآن کی تبلیغ بھی بلاحیل وحجت صحیح صحیح فرمائی ہوگی۔ خصوصاً مکی زندگی میں اور پھر توحید ورسالت کی ابتدائی دعوت کے موقع پر جب کہ آپ بالکل تنہا تھے اور قریش جیسی اکھڑ اور جنگجو قوم آپ کے خون کی پیاسی تھی اس قسم کی روایات اور ان پر مبنی یہ عقیدے بظاہر تو حضرت ابوبکرؓ صدیق اور حضرت عمرؓ فاروق کو مطعون ومجروح کرنے کے لئے ہیں جو رسالت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے انتہائی قابل اعتماد عینی گواہ ہیں لیکن ان کی تہہ میں یہ بات مخفی ہے کہ حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہی نہ تھے العیاذ باللہ۔

عصمت لسانی:

آیت نمبر (۱۰) لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ O ان علینا جمعہ وقرآنہ O فاذا قرانہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ O (پ ۲۹۔ سورۃ القیامۃ ع۱)

ترجمہ(ا) نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کہ شتاب اس کو سیکھ لے، وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو سمیٹ رکھنا اور پڑھنا اور پھر جب ہم پڑھنے لگیں تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے۔ پھر مقرر ہمارا ذمہ ہے اس کو کھول بتانا''

(حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ)

(ب) ''اور اے پیغمبر آپ (قبل وحی کے ختم ہو چکنے کے) قرآن میں اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تاکہ آپ اس کو جلدی جلدی لیں (کیونکہ) ہمارا ذمہ ہے (آپ کے قلب میں) اس کا جمع کر دینا (اور آپ کی زبان سے) اس کا پڑھوا دینا (جب یہ ہمارے ذمہ ہے) تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں (یعنی ہمارا فرشتہ پڑھنے لگا کرے) تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجئے پھر اس کا بیان کرا دینا بھی ہمارا ذمہ ہے۔'' (مولانا اشرف علیؒ تھانوی)

علامہ شبیر احمد صاحبؒ عثمانی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''شروع میں جس وقت حضرت جبرئیل اللہ کی طرف سے قرآن لاتے، ان کے پڑھنے کے ساتھ حضرت بھی دل میں پڑھتے جاتے تھے تاکہ جلد اسے یاد کر لیں مبادا جبرئیل چلے جائیں اور وحی پوری طرح محفوظ نہ ہو سکے مگر اس صورت میں آپ کو سخت مشقت ہوتی تھی جب تک پہلا لفظ کہیں اگلا سننے میں نہ آتا اور سمجھنے میں بھی ظاہر ہے دقت پیش آتی ہوگی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس وقت پڑھنے اور زبان ہلانے کی حاجت نہیں۔ ہمہ تن متوجہ ہو کر سننا ہی چاہئے، یہ فکر مت کرو کہ یاد نہیں رہے گا پھر کیسے پڑھوں گا اور لوگوں کو کس طرح سناؤں گا، اس کا تمہارے سینے میں حرف بحرف جمع کر دینا اور تمہاری زبان سے پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے۔ جبرئیل جس وقت ہماری طرف سے پڑھیں تو آپ خاموشی سے سنتے رہیے۔ آگے کا یاد کرانا اور اس کے علوم و معارف کا تمہارے اوپر کھولنا اور تمہاری زبان سے دوسروں تک پہنچانا ان سب

باتوں کے ہم ذمہ دار ہیں۔ اس کے بعد حضور نے جبرئیل کے ساتھ ساتھ پڑھنا ترک کر دیا، یہ بھی ایک معجزہ ہوا کہ ساری وحی سنتے رہے اس وقت زبان سے ایک لفظ نہ دہرایا لیکن فرشتے کے جانے کے بعد پوری وحی لفظ بہ لفظ کامل ترتیب کے ساتھ بدوں ایک زیر زبر کی تبدیلی کے فرفر سنا دی اور سمجھا دی''۔

فرمایئے! اس سے زیادہ فریضہ رسالت میں کسی قسم کی ادنیٰ سے ادنیٰ کوتاہی کے ناممکن ہونے کی کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ معجزانہ طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حرف بحرف قرآن اسی وقت یاد کرا دیا جاتا ہے اور حضور ﷺ کی زبان مبارک پر اللہ تعالیٰ کی پوری نگرانی قائم ہو جاتی ہے۔ وہی سناتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سنانا چاہتے ہیں۔ اور پھر قرآنی آیات کی مراد اور اس کا بیان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے، کیا معجزانہ حفظ و حفاظت اسی لئے ہے تاکہ بقول مودودی بعد میں انبیائے کرام فریضہ رسالت میں کوتاہیاں کرتے رہیں؟

خواہش نفس سے عصمت:

آیت نمبر (۱۱) وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحی (پ ۲۷، سورۃ النجم ع ۱)

ترجمہ (ا): اور نہیں بولتا ہے اپنی چاؤ سے، یہ تو حکم ہے جو بھیجتا ہے'' (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) اور نہ آپ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں، ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے'' (مولانا تھانویؒ)

آیت میں نطق سے کیا مراد ہے اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن کی وحی ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حضور ﷺ کی بات ہے جو اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرماتے ہیں خواہ وہ قرآن ہو یا کوئی اور بات لیکن آیت سے یہ تو قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ حضور ﷺ کی بات خواہش نفس پر مبنی نہیں ہوتی اور یہی حقیقت ہر نبی کے لئے تسلیم کرنا پڑے گی خواہ حضرت یونسؑ ہوں یا حضرت داؤدؑ لہٰذا مودودی صاحب کا یہ لکھنا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے کسی فعل میں خواہش نفس کا بھی دخل

نا بالکل باطل ہوگا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں مودودی صاحب کی عبارت پر فصل بحث "ابطال حجت" میں مذکور ہے۔ وہاں دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔

عصمت قلبی:

آیت (۱۲) لو لا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئاً قلیلاً.

(پ ۱۵ سورۃ بنی اسرائیل ع ۸)

ترجمہ (ا) اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے تجھے ٹھہرا رکھا تو تو لگ ہی جاتا جھکنے ان کی طرف"

(حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) "اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے" (مولانا تھانویؒ)

اس آیت کے تحت حضرت مولانا اشرف علیؒ صاحب تھانوی فرماتے ہیں:

"یہ ارشادِ عتاب نہیں بلکہ اظہارِ محبوبیت ہے کہ آپ ایسے محبوب ہیں کہ ہم نے رکون قلیل کے قرب سے بھی آپ کو بچالیا" (تفسیر بیان القرآن)

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

"ترکن رکون سے ہے جو ادنیٰ جھکاؤ اور خفیف میلانِ قلب کو کہتے ہیں، اس کے ساتھ شیئاً قلیلاً بڑھایا گیا تو ادنیٰ سے ادنیٰ ترین مراد ہوگا پھر لقد کدت فرما کر اس کے وقوع کو اور بھی گھٹا دیا۔ یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ آپ پیغمبر معصوم ہیں جن کی عصمت کی سنبھال حق تعالیٰ اپنے فضل خصوصی سے کرتا ہے تو ان چالاک شریروں کی فریب بازیوں سے بہت ہی تھوڑا سا ادھر جھکنے کے قریب ہو جاتے مگر انبیاء کی عصمت کا تکفل ان کا پروردگار کر چکا ہے اس لئے اتنا خفیف جھکاؤ بھی نہ پایا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں تقویٰ کی فطری قوت کس قدر مضبوط اور ناقابل تزلزل تھی۔"

جب اس آیت سے واضح ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اطہر حق

تعالیٰ کی خصوصی نگرانی میں ہے اور کسی غلط کام کی طرف حضور کے قلب کا ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی نہیں پایا جاسکتا تو پھر فریضہ رسالت میں کوتاہی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کا کیا احتمال ہوسکتا ہے۔

عصمت ذہنی:

آیت (۱۳) سنقرئک فلا تنسیٰ الا ماشاء اللہ (پ ۳۰۔ سورۃ الاعلیٰ)

ترجمہ (ا) ہم پڑھا دیں گے تجھ کو پھر تو نہ بھولے گا مگر جو چاہے اللہ (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) (اس قرآن کی نسبت ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) ہم جتنا قرآن نازل کرتے جائیں گے آپ کو پڑھا دیا کریں گے (یعنی یاد کرا دیا کریں گے) پھر آپ اس میں سے کوئی جز نہیں بھولیں گے مگر جس قدر بھلانا اللہ کو منظور ہو۔ (کہ نسخ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے) (مولانا تھانویؒ)

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحبؒ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

"یعنی جس طرح ہم نے اپنی تربیت سے ہر چیز کو بتدریج اس کے کمال مطلوب تک پہنچایا ہے تم کو بھی آہستہ آہستہ کامل قرآن پڑھا دیں گے اور ایسا یاد کرا دیں گے کہ اس کا کوئی حصہ بھولنے نہ پاؤ گے"۔

نسیان یعنی کسی چیز کا ذہن و دماغ سے بھول جانا انسانی عوارضات میں سے ہے۔ چنانچہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام بھی بھول گئے تھے لیکن انبیائے کرام علیہم السلام پر نسیان طاری ہونے میں بھی حکمتیں ہوتی ہیں ورنہ ان کے ذہن اور دماغی قویٰ بھی اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں صاف اعلان فرما دیا ہے کہ ہم جو آپ کو پڑھائیں گے وہ آپ نہیں بھولیں گے۔ البتہ کسی خاص حکمت کے تحت کوئی حصہ قرآن مجید کا آپ بھول جائیں تو یہ اس سے مستثنیٰ ہوگا اور قرآن مجید کی بعض آیات منسوخ التلاوت ہیں کہ حضورؐ کو اللہ کی طرف سے بھلا دی گئی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میں بھولتا نہیں

بلکہ بھلا دیا جاتا ہوں۔ بہر حال جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذہنی اور دماغی عصمت کا یہ حال ہے تو پھر معصیت اور گناہ کا وہاں کیا دخل ہو سکتا ہے۔

عصمت رائے:

آیت (۱۴) انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ (پ ۵ سورۃ النساء ع ۱۶)

ترجمہ (ا) ہم نے اتاری تجھ کو کتاب سچی کہ تو انصاف کرے لوگوں میں جو سوجھا دے تجھ کو اللہ۔ (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) ''بیشک ہم نے آپ کے پاس یہ نوشتہ بھیجا ہے واقعہ کے موافق تا کہ آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلا دیا ہے''۔ (مولانا تھانویؒ)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے مابین نزاعات کا فیصلہ کرنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآنی آیات کے علاوہ غیر متلو وحی کے ذریعہ حضور ﷺ کی رہنمائی فرماتے ہیں۔ وحی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک وحی متلو ہے جس کے الفاظ وکلمات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں اور یہ قرآن ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور دوسری وحی قرآن کے علاوہ ہے جس کو غیر متلو کہتے ہیں جس کے الفاظ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں ہوتے لیکن معنی اور مفہوم اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء کیا جاتا ہے اور اس غیر متلو وحی کے تحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ فرماتے ہیں اور جہاں قرآن یا غیر قرآن کی وحی نازل نہ ہو تو وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اجتہاد سے فیصلہ دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بھی وحی کے تابع ہوتی ہے اور جس واقعہ میں وحی نازل نہیں ہوتی وہاں حکمت خداوندی کے تحت اختلاف رائے کی گنجائش ہوتی ہے اور اس میں حضور ﷺ اپنے اصحاب کرامؓ سے مشورہ بھی لیتے تھے اور بعض دفعہ اپنی رائے ترک کر کے صحابہ کرامؓ کی رائے پر عمل فرما دیتے تھے اور اس سے

مقصود باہمی مشاورت کی تعلیم وتربیت ہوتی تھی۔ وامرھم شوریٰ بینھم. (سورۃ الشوریٰ) (اور ان مسلمانوں کا کام آپس کے مشورہ سے ہوتا رہے) دوسری جگہ ارشاد فرمایا وشاورھم فی الامر (آل عمران) ''اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے۔'' (مولانا تھانویؒ)

اس آیت کے تحت حضرت مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں:

''اور یہ جو کہا گیا ہے کہ خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے۔ تو مراد ان سے وہ امور ہیں جن میں آپ پر وحی نازل نہ ہوئی ہو ورنہ بعد وحی کے پھر مشورہ کی کوئی گنجائش نہیں''۔

سورۃ شوریٰ ع ۴ کی مندرجہ آیت (وامرھم شوریٰ بینھم) کے تحت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

مشورہ سے کام کرنا اللہ کو پسند ہے، دین کا ہو یا دنیا کا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مہمات امور میں برابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرماتے تھے اور صحابہ آپس میں مشورہ کرتے تھے۔ حروب (یعنی جنگوں) وغیرہ کے متعلق بھی اور بعض مسائل واحکام کی نسبت بھی بلکہ خلافت راشدہ کی بنیاد ہی شوریٰ پر قائم تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت ان کاموں میں ہے جو مہتم بالشان ہوں اور جو قرآن وسنت میں منصوص نہ ہوں۔ جو چیز منصوص ہو اس میں رائے اور مشورہ کے کوئی معنی نہیں اور ہر چھوٹے بڑے کام میں اگر مشورہ ہوا کرے تو کوئی کام نہ ہو سکے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مشورہ ایسے شخص سے لیا جائے جو عاقل وعابد ہو ورنہ اس کی بے وقوفی یا بددیانتی سے کام خراب ہونے کا اندیشہ رہے گا''۔

عصمت فعلی:

آیت (۱۵) والنجم اذا ھویٰ ما ضل صاحبکم وما غویٰ (سورۃ النجم ع ا پ ۲۷)

ترجمہ (ا) ''قسم ہے تارے کی جب گرے بہکا نہیں تمہارا رفیق اور بے راہ نہیں چلا'' (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) ”قسم ہے (مطلق) ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے، یہ تمہارے (ہمہ وقت) ساتھ کے رہنے والے نہ راہ (حق) سے بھٹکے اور نہ غلط رستہ ہوئے۔ (مولانا تھانویؒ)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: ”رفیق سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یعنی نہ آپ غلط فہمی کی بنا پر راستے سے بہکے اور نہ اپنے قصد واختیار سے جان بوجھ کر بے راہ چلے بلکہ جس طرح آسمان کے ستارے طلوع سے لے کر غروب تک ایک مقررہ رفتار سے متعین راہ پر چلے جاتے ہیں، کبھی ادھر ادھر ہٹنے کا نام نہیں لیتے۔ آفتاب نبوت بھی اللہ کے مقرر کیے ہوئے راستے پر برابر چلا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ ایک قدم ادھر یا ادھر ہٹ جائے۔ ایسا ہو تو ان کی بعثت سے جو غرض متعلق ہے وہ حاصل نہ ہو“۔

سورۃ النجم مکی سورۃ ہے جس کی مندرجہ آیت میں ماضل صاحبکم وما غویٰ کے ارشاد سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوگیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ضلالت اور غوایت دونوں سے معصوم ہیں۔ ضلالت کہتے ہیں بلا قصد وارادہ غلطی کرنے کو اور غوایت نام ہے قصد وارادہ سے غلطی کرنے کا تو ان دونوں باتوں کی نفی سے یہ لازم آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عصمت فعلی حاصل ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ونگرانی کے تحت حضور کو قلبی، ذہنی، لسانی وغیرہ عصمتیں حاصل ہیں جن کا ثبوت سابقہ آیات سے پیش کیا جاچکا ہے اسی طرح افعال میں بھی حضور ﷺ کو عصمت حاصل ہے اور حضور ﷺ خلاف امر رسالت نہ غلط فہمی کی بنا پر کوئی کام کرتے ہیں اور نہ ہی قصد وارادہ کے تحت آپؐ سے نافرمانی کا صدور ہوتا ہے۔ یہی مطلب ہے معصوم ہونے کا کہ انبیاء علیہم السلام گناہ اور معصیت سے پاک ہیں خواہ وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ۔ علاوہ ازیں ستارے کی قسم کھانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ایک غروب ہونے والا ستارہ ان تمام چیزوں کی صفات واثرات سے پاک رہتا ہے جن میں اس کا غروب ہوتا ہے اسی طرح نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم اپنی قوم میں رہنے کے باوجود ان کی خرابیوں اور کمزوریوں سے پاک اور معصوم ہیں۔

۲۔ تفسیر روح المعانی میں علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں:

ای ماعدل عن طریق الحق الذی هو مسلک الآخرة وهو استعارة وتمثیل لکونه علیه الصلوة والسلام علی الصواب فی اقواله و افعاله (وما غوی) ای ما اعتقد باطلاً قط لان الغی الجهل مع اعتقاد فاسد وهو خلاف الرشد“.

”یعنی آپ اس طریق حق سے ادھر ادھر نہیں ہٹے جو آخرت کا راستہ ہے اور یہ استعارہ اور تمثیل ہے یہ بات سمجھانے کے لئے کہ آپ اپنے اقوال وافعال میں بالکل حق وصواب پر ہیں (وما غوی) یعنی آپ نے کبھی بھی باطل کا اعتقاد نہیں رکھا کیونکہ غی اس جہالت کو کہتے ہیں جو فاسد اعتقاد کے ساتھ ہو اور یہ رشد کے خلاف ہے“۔

آیت نمبر ۱۶:

قال الذین لا یرجون لقآء نا ائت بقرآن غیر هذا او بدله ط قل ما یکون لی ان ابدله من تلقاء نفسی ان اتبع الا مایوحیٰ الی ج انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم O (پ ۱۱۔ سورۃ یونس ع ۲)

ترجمہ (ا) اور جب پڑھتے ان کے پاس آیتیں ہماری صاف، کہتے ہیں جن کو امید نہیں ہے ہم سے ملاقات کی، لے آ کوئی اور قرآن اس کے سوا یا اس کو بدل ڈال۔ تو کہہ میرا کام نہیں کہ اس کو بدلوں اپنی طرف سے، میں تابع ہوں اس کا جو حکم آوے میری طرف۔ میں ڈرتا ہوں اگر بے حکمی کروں اپنے رب کی بڑے دن کی مار سے“۔ (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) ”اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جو بالکل صاف صاف ہیں (یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے (آپ سے یوں) کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی (پورا) دوسرا قرآن (ہی) لا یئے یا (کم سے کم)

اس میں کچھ ترمیم کر دیجئے۔ آپ (یوں) کہہ دیجئے کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کردوں۔ بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہنچا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے بھاری دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں'' (مولانا تھانویؒ)

علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''یعنی کسی فرشتے یا پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ اپنی طرف سے کلام الٰہی میں ترمیم کر کے ایک شوشہ بھی تبدیل کر سکے۔ پیغمبر کا فرض یہ ہے کہ جو وحی خدا کی طرف سے آئے بلا کم و کاست اس کے حکم کے موافق چلتا رہے۔ وہ خدا کی وحی کا تابع ہوتا ہے، خدا اس کا تابع نہیں ہوتا کہ جیسا کلام تم چاہو خدا کے یہاں سے لاکر پیش کر دے۔ وحی الٰہی میں ادنیٰ سے ادنیٰ تصرف اور قطع و برید کرنا بڑی بھاری معصیت ہے۔ پھر جو معصوم بندے سب سے زیادہ خدا کا ڈر رکھتے ہیں (یعنی انبیاء علیہم السلام) وہ ایسی معصیت اور نافرمانی کے قریب کہاں جا سکتے ہیں۔ انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم ۝ میں گویا ان بے ہودہ فرمائش کرنے والوں پر تعریض ہوگئی کہ ایسی سخت نافرمانی کرتے ہوئے تم کو بڑے دن کے عذاب سے ڈرنا چاہئے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ:

(ا) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم از خود وحی الٰہی میں ترمیم وتحریف نہیں کر سکتے۔

(ب) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل وحی کے ذریعے ہوتا ہے۔

(ج) اگر بالفرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی حکم الٰہی کی نافرمانی سرزد ہو جائے تو عذاب آخرت کا خطرہ ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر ملحوظ رہے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خود یہ اعلان کرایا ہے کہ ان اتبع الا ما یوحی الیّ یعنی میں تو اس امر کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر بذریعہ وحی نازل ہوتا ہے۔ تو باذن الٰہی اس اعلان کے بعد یہ امر محال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکم خداوندی کی تعمیل

نہ کریں اور آپ سے معصیت و نافرمانی کا صدور ہو جائے اور اسی عصمت فعلی کی حقیقت سمجھانے کے لئے انی اخاف کا بھی اعلان فرمادیا یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی (معصیت) کا نتیجہ عذاب آخرت ہے اور چونکہ حضورؐ عذاب آخرت سے قطعی طور پر مامون ہیں اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضور ﷺ سے کسی قسم کا گناہ نہیں سرزد ہو سکتا خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ۔

انبیائے کرام مطاع مطلق ہیں:

آیت (۱۷) وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (پ۵ سورۃ النساء ع۹)

ترجمہ (ا) ''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم مانیں اللہ کے فرمانے سے'' (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) ''اور ہم نے تمام پیغمبروں کو اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بہ حکم خداوندی ان کی اطاعت کی جائے۔'' (مولانا تھانویؒ)

علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں:

''یعنی اللہ تعالیٰ جس رسول کو اپنے بندوں کی طرف بھیجتا ہے سو اسی غرض کے لئے بھیجتا ہے کہ اللہ کے حکم کے موافق بندے ان کے کہنے کو مانیں''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر پیغمبر کی مطلقاً اطاعت کا واضح حکم دیا ہے۔ جس سے یہ لازم آتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام سے کسی قسم کی معصیت (نافرمانی) سرزد نہ ہو سکے۔ ورنہ بالفرض اگر ان سے کسی درجے کی نافرمانی کا صدور ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امت اس نافرمانی اور معصیت میں بھی پیغمبر کی اطاعت کرے العیاذ باللہ۔

آیت نمبر ۱۸:

قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (پ۱۸ سورۃ النور ع۷)

ترجمہ (ا) تو کہہ حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا۔ (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) ''آپ کہئے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو'' (مولانا تھانوی)

علامہ عثمانیؒ لکھتے ہیں: یعنی پیغمبر پر خدا کی طرف سے تبلیغ کا بوجھ رکھا گیا

ہے۔ سو اس نے پوری طرح ادا کر دیا اور تم پر جو بوجھ ڈالا گیا وہ تصدیق وقبولِ حق کا ہے اور یہ کہ اس کے ارشاد کے موافق چلو۔ اگر تم اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے اس کے احکام کی تعمیل کرو گے تو کامیابی دارین کی راہ پاؤ گے اور دنیا و آخرت میں خوش رہو گے ورنہ پیغمبر کا کچھ نقصان نہیں۔"

آیت نمبر ۱۹:

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ج (پ۵ سورۃ النساء ع ۱۱)

ترجمہ (ا) "جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ کا۔" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی" (مولانا تھانویؒ)

آیت نمبر ۱۸ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا مستقل حکم دیا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا بھی مستقل حکم دیا گیا ہے اور آیت نمبر ۱۹ میں وضاحت فرمادی گئی کہ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی بھی اطاعت کر لی۔ یعنی اطاعت رسول واسطہ ہے اطاعت خداوندی کا اور اطاعت طوع سے ہے جس کا معنی ہے خوشی سے پیروی کرنا اور حکم ماننا۔ تو اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گناہ اور معصیت کے سرزد ہونے کا احتمال بھی ہو تو حضور ﷺ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا مستقل واسطہ قرار دینے کا حکم صحیح نہیں رہتا کیونکہ گناہ اور معصیت کی پیروی حرام ہے۔ لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام مطلقاً معصوم ہیں اور ان سے نافرمانی کا صدور نہیں ہوسکتا۔

آیت نمبر ۲۰:

ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنت تجری من تحتھا الانھر خالدین فیھا وذلک الفوز العظیم ○ ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعد حدودہ یدخلہ ناراً خالداً فیھا ولہ عذاب مھین ○ (پ۴ ۔سورۃ النساء ع ۲)

ترجمہ (ا) اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور اس کے رسول کے وہ داخل کرے

اسے باغوں میں جن کے نیچے بہتی ندیاں رہ پڑے ان میں اور وہی ہے بڑی مراد ملنی اور جو کوئی بے حکمی کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور بڑھ جائے اس کی حدوں سے اس کو داخل کرے آگ میں رہ پڑے اس میں اور اس کو ذلت کی مار ہے"۔ (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) "اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور رسول کی پوری اطاعت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایسی بہشتوں میں داخل کردیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا نہ مانے اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جائے اس کو آگ میں داخل کردیں گے۔ اس طور سے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ایسی سزا ہوگی جس میں ذلت بھی ہے"۔ (مولانا تھانویؒ)

ان آیات میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت سے جنت ملے گی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے جہنم کا عذاب ملے گا۔ تو اگر یہ بھی احتمال ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر سکتے ہیں تو پھر حضور ﷺ کی اطاعت پر جنت کا انعام اور حضور ﷺ کی نافرمانی پر جہنم کی سزا کیونکر متفرع ہوسکتی ہے جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ارشاد یہ ہے کہ لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق "یعنی جس کام میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو اس میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے"۔

(ب) اور جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی پر دوزخ کی سزا سنائی گئی ہے تو پھر حضور سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی (معصیت) کا صدور کیونکر ممکن ہوسکتا ہے جس پر عذاب خداوندی کا اندیشہ ہے۔

آیت اولی الامر منکم:

آیت (۲۱) یآ ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر

منکم ج فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ
والیوم الآخر، ذلک خیر واحسن تاویلا O (پ۵ سورۃ النساء ع ۸)

ترجمہ: (ا) اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور جو اختیار والے ہیں تم میں سے پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور پچھلے دن پر۔ یہ خوب ہے اور بہتر تحقیق کرنا ہے۔'' (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) ''اے ایمان والو تم اللہ کا کہا مانو اور رسول کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کا بھی۔ پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور اس کے رسول کے حوالے کر دیا کرو۔ اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ امور سب بہتر ہیں اور ان کا انجام خوشتر ہے۔'' (حضرت تھانویؒ)

علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: حاکم اسلام بادشاہ یا اس کا صوبہ دار یا قاضی یا سردار لشکر اور جو کوئی کسی کام پر مقرر ہو ان کے حکم کا ماننا ضروری ہے جب تک کہ وہ خدا اور رسول کے خلاف حکم نہ دیں۔ اگر خدا اور رسول کے حکم کے صریح خلاف کرے تو اس حکم کو ہرگز نہ مان ___ اگر تم میں اور اولی الامر میں باہم اختلاف ہو جائے کہ حاکم کا یہ حکم اللہ اور رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف تو اس کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کر کے طے کر لیا کرو کہ وہ حکم فی الحقیقت اللہ اور رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف اور جو بات محقق ہو جائے اسی کو باتفاق مسلم اور معمول بہ سمجھنا چاہئے اور اختلاف کو دور کر دینا چاہئے''۔

اس آیت میں بھی اطیعوا اللہ کے بعد اطیعوا الرسول سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقل اور مطلق طور پر اطاعت کا اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے اور بالفرض اگر حضور سے معصیت کا صدور ممکن ہو تو اس طرح مستقل اطاعت کا حکم صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور رسول اور غیر رسول کی اطاعت میں فرق بتلانے کے

لئے بعد میں اولی الامر کی اطاعت کا مستقل حکم اطیعوا کے لفظ سے نہیں دیا بلکہ واولی الامر منکم فرما کر ان کی اطاعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے تابع بنا دیا۔ یعنی اگر اولی الامر، اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کر کے کوئی حکم دیں تو اس کی پیروی کرو۔ اور اگر ان کا حکم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہو تو پھر اس میں ان سے اختلاف کر سکتے ہو اور اس نزاع و اختلاف میں فیصلہ کی یہ صورت اختیار کرو کہ اس معاملہ کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیرو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں تو دربار رسالت میں اپنے معاملات کو پیش کیا جا سکتا تھا اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کی یہ صورت ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اپنے نزاعات حل کئے جائیں، اس سے ثابت ہوا کہ معصوم صرف اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں جن سے گناہ (اور نافرمانی) کا صدور ہو ہی نہیں سکتا اور پیغمبروں کے علاوہ چونکہ دوسروں سے معصیت کا صدور ہو سکتا ہے اس لئے وہ معصوم اور مطاع مطلق نہیں ہوں گے، البتہ یہ جدا بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو محفوظ بنا دے اور ان کو اپنی اور اپنے رسول کی محبت و اطاعت میں مکمل طور پر فنا کر دے جس کی وجہ سے وہ باوجود معصوم نہ ہونے کے معیار حق بن جائیں۔ جیسا کہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی جماعت مقدسہ ہے اور اسی وجہ سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین (یعنی تم پر میری سنت لازم ہے اور میرے خلفاء راشدین مہدیین کی سنت بھی لازم ہے)

اور یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اختلاف و نزاع اصول دین میں بالکل نہیں تھا بلکہ ان کا اختلاف فروعات میں تھا اور وہ بھی اجتہادی اختلاف تھا اور نہ ہی وہ اختلاف نفسانیت پر مبنی تھا کیونکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان تربیت سے ان کے نفوس پاک ہو گئے تھے ویزکیھم اس لئے صحابہ کرام کا باہمی اختلاف و نزاع حق و باطل کا

اختلاف نہیں تھا بلکہ راجح ومرجوح وغیرہ کا اختلاف تھا۔ مسئلہ معیارِ حق کی مکمل تحقیق شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کی کتاب ''مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت'' اور آپ کے مکتوبات میں موجود ہے جو بہت زیادہ مفید اور مؤثر ہے۔

شیعہ مذہب میں اولی الامر منکم کا مطلب:

شیعہ مذہب میں یہاں اولی الامر منکم سے مراد حضرت علی المرتضیٰؓ سے لے کر امام غائب حضرت مہدی تک بارہ امام ہیں جو سب معصوم[1] ہیں اور العیاذ باللہ تمام انبیاء سابقین سے افضل[2] ہیں۔ چنانچہ شیخ طبرسی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

---

(۱) شیعوں کے نزدیک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی معصومہ ہیں اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمیت چہاردہ معصومین مانتے ہیں۔

(۲) شیعہ مذہب میں اصول دین پانچ ہیں۔ توحید۔ عدل۔ نبوت۔ امامت۔ قیامت (ملاحظہ ہو اسلامیات لازمی، جماعت نہم ودہم برائے شیعہ طلبہ) شیعہ مذہب میں امامت نبوت سے افضل ہے (اصول کافی)

حضرت علیؓ حضورؐ کے بعد تمام انبیائے کرام سے افضل ہیں (اصول کافی) ایک شیعہ مجتہد مولوی حسین بخش (جاڑا) لکھتے ہیں: جس طرح یہ قرآن کتب سابقہ اور صحف گزشتہ پر حاکم ہے اسی طرح اس کے مبلغین (اوصیائے رسالت) (یعنی بارہ امام) ان کتابوں اور صحیفوں کے مبلغین پر حاکم ہوں گے بلکہ اس قاعدہ سے اوصیائے جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم گزشتہ صاحبان شریعت انبیاء سے بھی افضل ہوں گے (مقدمہ تفسیر انوار النجف)۔ ایک اور ماتمی مجتہد مولوی محمد حسین ڈھکو نے لکھا ہے: خداوند عالم نے انبیاء کو اس وقت تک مرتبہ نبوت ورسالت پر فائز نہیں فرمایا جب تک ان سے اپنی توحید اور سرکار ختمی مرتبت کی رسالت اور ائمہ اہل بیت کی خلافت وامامت کا اقرار نہیں لے لیا (احسن الفوائد فی شرح العقائد) اور شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ امامت افضل ہے نبوت سے اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بارہ امام انبیائے کرام سے افضل ہیں۔ یہ عقیدہ ختم نبوت کے منافی ہے۔ چنانچہ امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مذہب شیعہ کے تصنیف کرنے والوں کا اصلی مقصد دین اسلام کو خراب کرنا تھا۔ صحابہ کرام کو جو مطعون ومجروح قرار دیا وہ محض اس لئے کہ جب یہ جماعت ناقابل اعتبار ہو جائے گی تو قرآن اور معجزات نبویہ اور دین اسلام کی ہر چیز مشکوک ہو جائے گی کیونکہ ان سب چیزوں کے ناقل اور راوی اور چشم دید گواہ یہی صحابہ کرام ہیں اور حضرت علی المرتضیٰ اور بقیہ ائمہ اثنا عشر کی محبت وعقیدت کا دعویٰ اس لئے ہے کہ اس پردہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا انکار منظور ہے۔ چنانچہ امامت کی بحث کتب شیعہ میں جس شخص نے دیکھی ہے وہ اس کو خوب جانتا ہے۔ امام کو مثل انبیاء علیہم السلام کے معصوم ومفترض الطاعت کہنا اور یہ کہنا کہ امام کو اختیار ہے جس چیز کو چاہے حلال کردے اور جس چیز کو چاہے حرام کردے اور ہر امام پر سال بہ سال خدا کی طرف سے کتاب کا نازل ہونا ختم نبوت کا انکار نہیں تو کیا ہے (ماہنامہ النجم لکھنو۔ ۲۱ شوال ۱۳۴۹ھ ص ۱۲۰)

واما اصحابنا فانهم رووه عن الباقر والصادق ان اولی الامرهم الائمة من آل محمد اوجب الله طاعتهم بالاطلاق كما اوجب طاعته وطاعة رسوله ولا يجوز ان يوجب الله طاعة احد على الاطلاق الا من ثبتت عصمته (تفسیر مجمع البیان) اور ہمارے اصحاب نے امام باقر اور امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ اولی الامر سے مراد آل محمد کے ائمہ ہیں جن کی اطاعت اللہ نے بالاطلاق واجب کی ہے جیسا کہ اس نے اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت مطلقاً واجب کی اور یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی مطلقاً اطاعت واجب کرے جس کی عصمت ثابت نہ ہو''

لیکن یہ استدلال شیعہ مجتہدین کا بالکل غلط ہے کیونکہ آیت میں اولی الامر کی مستقل اطاعت کا حکم دیا ہی نہیں گیا بلکہ اس کی اطاعت کو اطیعوا الرسول کے تابع کردیا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اولی الامر سے مراد شیعوں کے بارہ معصوم امام ہوتے تو پھر فان تنازعتم في شيء فردوه الى الله والرسول کی طرح ردوه الى اولى الامر کا حکم دیا جاتا۔ بہرحال اس آیت سے تو اولی الامر کی مستقل اطاعت کا حکم ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے خلاف ہی ثابت ہوتا ہے اس لئے شیعہ علماء نے ائمہ کی اطاعت وعصمتِ مطلقہ کا بے بنیاد عقیدہ ثابت کرنے کے لئے یہ مان لیا کہ آیت میں تحریف وتبدیلی کردی گئی ہے چنانچہ اصل میں آیت یوں تھی:

عن يزيد بن معاوية قال تلا ابو جعفر عليه السلام اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم فان خفتم تنازعاً فى الامر فارجعوه الى الله والى الرسول والى اولى الامر منكم (فروع کافی جلد ۳ کتاب الروضہ ص ۸۹)

''یزید بن معاویہؓ سے روایت ہے کہ ابوجعفر یعنی امام محمد باقر نے آیت اس طرح پڑھی .... اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولی الامر کی اطاعت کرو۔ پس اگر تم کو خطرہ ہو کسی معاملہ میں نزاع کا تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول کی طرف اور اولی الامر منکم کی طرف لوٹاؤ''۔

تو یہاں شیعوں نے اولی الامر سے پہلے لفظ الی بڑھا کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح بارہ اماموں کی اطاعت مطلقہ ثابت کرنے کے لئے قرآن عظیم کی آیت میں تبدیلی کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا، ماشاء اللہ خوب مذہب ہے۔

جوبات کی خدا کی قسم لاجواب کی عبرت عبرت عبرت

آیت نمبر ۲۲:

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم ط واللہ غفور رحیم O (پ۳ آل عمران ع ۴)

ترجمہ: (ا) تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو کہ اللہ تم کو چاہے اور بخشے گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

(حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) "آپ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑی عنایت فرمانے والے ہیں۔ (مولانا تھانویؒ)

علامہ شبیر احمد صاحبؒ عثمانی تحریر فرماتے ہیں: دشمنان خدا کی موالات و محبت سے منع کرنے کے بعد خدا سے محبت کرنے کا معیار بتلاتے ہیں یعنی اگر دنیا میں آج کسی شخص کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعویٰ یا خیال ہو تو لازم ہے کہ اس کو اتباع محمدی کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لے بس کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا۔ جو شخص جس قدر حبیب خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ چلتا اور آپ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعل راہ بناتا ہے اسی قدر سمجھنا چاہیئے کہ خدا کی محبت کے دعویٰ میں سچا اور کھرا ہے اور جتنا اس دعویٰ میں سچا ہوگا اتنا ہی حضور ﷺ کی پیروی میں مضبوط و مستعد پایا جائے گا جس کا پھل یہ ملے گا کہ حق

تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگے گا۔ اور اللہ کی محبت اور حضور ﷺ کے اتباع کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے اور آئندہ طرح طرح کی ظاہری و باطنی مہربانیاں مبذول ہوں گی"۔

اس آیت میں بھی فاتبعونی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مطلقاً اتباع کا حکم دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معصیت کا صدور محال ہے۔ ورنہ اگر معصیت سرزد ہونے کا احتمال ہوتا تو مطلقاً اتباع کا حکم نہ دیا جاتا کیونکہ معصیت کا اتباع تو غضب خداوندی کا موجب بنتی ہے نہ کہ محبت خداوندی کا۔

آیت نمبر ۲۳:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیرا O (پ۲۱ سورۃ الاحزاب ع ۳)

ترجمہ (ا) "تم کو بھلی تھی سیکھنی رسول کی چال اس کے لئے جو کوئی امید رکھتا ہے اللہ کی اور پچھلے دن کی اور یاد کرتا ہے اللہ کو بہت سارا۔" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ سے اور روز آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا۔"

(مولانا تھانویؒ)

علامہ عثمانیؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"جو لوگ اللہ سے ملنے اور آخرت کا ثواب حاصل کرنے کی امید رکھتے ہیں اور کثرت سے خدا کو یاد کرتے ہیں ان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات منبع البرکات کا بہترین نمونہ ہے۔ چاہیئے کہ ہر معاملہ، ہر ایک حرکت و سکون اور نشست و برخاست میں ان کے نقش قدم پر چلیں اور ہمت و استقلال وغیرہ میں ان کی چال سیکھیں"۔

اس سے بھی ثابت ہوا کہ حضور ﷺ کی مقدس زندگی میں گناہ اور معصیت

کا احتمال نہیں ورنہ اگر معصیت کا صدور بھی ہو جائے تو پھر اسوۂ حسنہ اس کو کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

(۴) حافظ ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

ھذہ الآیۃ الکریمۃ اصل کبیر فی التاسی برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اقوالہ وافعالہ واحوالہ

(یہ آیت کریمہ ایک بہت بڑی اصل اور بنیاد ہے اس بارے میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال، افعال اور احوال کی پیروی کی جائے۔

انبیاء کا خواب بھی حجت ہوتا ہے:

بیداری میں انبیاء کرام علیہم السلام کے اقوال و افعال اور احوال کا حجت ہونا اور ان میں معصیت اور شیطانی مداخلت کا ممتنع اور محال ہونا تو ظاہر ہے، انبیاء کرام کا مقام تو اتنا بلند ہے کہ ان کا خواب بھی شرعی حجت ہے اور حالتِ نوم میں بھی وہ قلبی غفلت اور وساوس شیطانی سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض اپنے خواب کی بنا پر ہی اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کر دیا تھا، گو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت حضرت اسماعیل ذبح ہو نہیں سکے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فلما بلغ معہ السعی قال یبنی انی اریٰ فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تریٰ قال یٓابت افعل ماتؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین ○ فلما اسلما وتلہ للجبین ○ ونادینہ ان یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا انا کذلک نجزی المحسنین (پ۲۳ والصفت ع ۳)

ترجمہ: ''پھر جب پہنچا (یعنی حضرت اسماعیل) اس کے ساتھ دوڑنے کو۔ کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں خواب میں کہ تجھ کو ذبح کرتا ہوں۔ پھر دیکھ تو تو کیا دیکھتا ہے۔ بولا اے باپ کر ڈال جو تجھ کو حکم ہوتا ہے، تو پائے گا مجھ کو اگر اللہ نے چاہا سہارنے والا پھر جب دونوں نے حکم مانا اور پچھاڑا اس کو ماتھے کے بل اور ہم نے پکارا اس کو یوں کہ اے ابراہیم تو نے سچ کر دیا خواب، ہم یوں

دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو۔'' (حضرت شاہ صاحبؒ)

تفسیر ابن کثیر میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنھما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" رؤیا الانبیاء فی المنام وحی۔

''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیند میں انبیاء کا دیکھنا وحی کے حکم میں ہے۔''

اور تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ لکھتے ہیں:

''عن قتادۃ ان رؤیا الانبیاء وحی۔''

''حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے۔''

تفسیر خازن میں ہے: ورؤیا الانبیاء حق اذا رأوا شیئا فعلوہ (انبیاء کا خواب حق ہوتا ہے جب وہ خواب میں کوئی چیز دیکھتے ہیں تو اس پر عمل کرتے ہیں)

امام رازیؒ نے بھی اسی طرح فرمایا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیداری میں وحی کے حکم کا انتظار نہ کیا اور محض خواب کو ہی اللہ کی وحی سمجھ کر بچہ کو ذبح کرنے کی کوشش کی۔ البتہ انبیاء کے خواب بھی باوجود سچا ہونے کے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ خواب جو بالکل ظاہر ہے جیسا کہ یہ خواب اور دوسرا وہ جو قابل تعبیر ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب۔ بہرحال جب انبیاء کرام علیہم السلام کا خواب حق اور حجت ہے تو ان کی بیداری کے اقوال و افعال تو بطریق اولیٰ حق، حجت اور معصیت سے پاک ہوں گے۔

انبیاء کی تقریر بھی سنت ہوتی ہے:

تقریر کا معنی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اگر کوئی شخص عمل کرے اور حضور ﷺ اس پر گرفت (روک ٹوک) نہ فرمائیں تو وہ عمل حدیث اور سنت میں شمار ہوگا اس کو حدیث تقریری کہتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۴:

فلا و ربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیماO

ترجمہ (ا) سوقسم ہے تیرے رب کی ان کو ایمان نہ ہوگا جب تک تجھی کو منصف نہ جانیں جو جھگڑا آئے آپس میں ۔ پھر نہ پاویں اپنے جی میں خفگی تیری چکوتی سے اور قبول رکھیں مان کر" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) "پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کراویں پھر آپ کے اس تصفیہ سے اپنے دل میں تنگی نہ پاویں اور پورے طور پر تسلیم کرلیں۔" (مولانا تھانویؒ)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں: "کہ یعنی منافق لوگ کس بے ہودہ خیال میں ہیں اور کیسے بے ہودہ حیلوں سے کام نکالنا چاہتے ہیں، ان کو خوب سمجھ لینا چاہئے۔ ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جب تک یہ لوگ تم کو اے رسول اپنے تمام چھوٹے بڑے مالی جانی تنازعات میں منصف اور حاکم نہ جان لیں گے کہ تمہارے فیصلے اور حکم سے ان کے جی میں کچھ تنگی اور ناخوشی نہ آنے پائے اور تمہارے ہر ایک حکم کو خوشی کے ساتھ دل سے قبول نہ کرلیں گے اس وقت تک ہرگز ان کو ایمان نصیب نہیں ہوسکتا، اب جو کرنا ہو سوچ سمجھ کر کریں۔"

اس آیت میں تو بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ فرمادیا ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ قبول نہ کرے یا بظاہر زبان سے تو مان لے لیکن اس کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلہ سے تنگی اور ناراضگی ہو تو وہ مؤمن ہی نہیں رہتا۔ خواہ وہ زبان سے اسلام اور رسالت محمد یہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کا اقرار ہی کرتا رہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول و فعل میں گناہ اور معصیت سے بالکل پاک ہیں ورنہ اگر حضور ﷺ سے بالفرض معصیت اور نافرمانی سرزد

ہونے کا احتمال باقی رہتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فیصلہ کو دل سے ماننے کا اس طرح حکم نہ دیا جاتا اور نہ ہی حضور ﷺ کے فیصلہ پر ناخوشی اور تنگی پانے کو ایمان کے منافی قرار دیا جاتا۔

خلاصہ آیات عصمت:

عصمت انبیاء کرام علیہم السلام کے دلائل میں یہاں بطور اختصار ۲۴ آیات مبارکہ پیش کردی ہیں۔ آیات کے دو ترجمے لکھدئے ہیں: (۱) حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ کا، یہ ترجمہ علمائے اہل السنّت والجماعت کے ہاں الہامی ترجمہ مانا جاتا ہے جو حضرت شاہ صاحبؒ نے غالباً دس سال دہلی کی مسجد میں اعتکاف کے دوران لکھا۔

(۲) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ جو بامحاورہ ہے اور جس میں قوسین کے اندر مضمون کی ضروری توضیح کردی گئی ہے اور حسب ضرورت آیات کی تفسیر وتشریح یعنی شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے حواشی درج کردئے ہیں جو آپ نے مقتدائے زماں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب محدث اسیر مالٹا قدس سرہٗ کے ترجمہ قرآن پر لکھے ہیں۔ حضرت شیخ الہند نے یہ ترجمہ اسارت مالٹا کے دوران لکھا تھا اور یہ ترجمہ کوئی مستقل ترجمہ نہیں بلکہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی کے ترجمہ میں ہی بعض الفاظ میں تبدیلی کی ہے جو عرصہ دراز کے بعد موجودہ زمانہ میں اردو محاورات والفاظ میں تبدیلی کی وجہ سے عام اردوخوان طبقہ کے لئے قابل فہم نہیں رہے تھے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ کا مقام علم وتحقیق مسلم ہے۔ اس لئے میں نے مضمون آیات کے سمجھنے کے لئے آپ کے حواشی عموماً پیش کئے ہیں اور طوالت سے بچنے کے لئے تائیدی طور پر دوسرے مفسرین کی عبارتیں نہیں پیش کیں۔ الا ماشاء اللہ۔ بہرحال مسئلہ عصمت انبیاء کے سلسلہ میں آیات بالا سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں تک اپنے پیغامات واحکامات پہنچانے کے لئے خود ہی فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول منتخب فرمائے ہیں۔

۲۔ نبوت و رسالت وہبی نعمت ہے نہ کہ کسبی۔ یعنی یہ عظیم الشان منصب انبیائے

کرام کو ان کی کسی سابقہ محنت و ریاضت کی وجہ سے نہیں ملتا بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہیں اپنے علم وحکمت کی بنا پر نبوت و رسالت سے مشرف فرمادیں۔

۳۔ فرشتوں کی خاص نگرانی میں اللہ تعالیٰ اپنی وحی انبیائے کرام علیہم السلام تک پہنچاتا ہے جس میں کسی شیطانی مداخلت کا احتمال نہیں رہتا۔

۴۔ انبیائے کرام کی بعثت (یعنی لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجنے) کا مقصد لوگوں پر اتمام حجت کرنا ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اپنی اپنی امت پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری کردیا کرتے ہیں تاکہ قیامت میں منکرین کسی قسم کا کوئی عذر نہ پیش کرسکیں۔

۵۔ انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے پیغامات واحکامات ٹھیک ٹھیک بلا کم و کاست لوگوں تک پہنچادیتے ہیں اور اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں ان سے کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ خود بھی اس حقیقت کا اعلان فرمادیتے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغامات واحکامات لوگوں تک صحیح صحیح پہنچادیئے ہیں۔

۶۔ اگر بالفرض کوئی پیغمبر کسی حکم خداوندی کی ٹھیک طور تبلیغ نہ کرسکے تو اس وجہ سے اس کی رسالت ہی کالعدم قرار پاتی ہے اور اس کا الزام نہ صرف پیغمبر معصوم پر بلکہ قادر مطلق خدا تعالیٰ پر بھی عائد ہوتا ہے کہ اس نے العیاذ باللہ پیغمبر کے انتخاب میں غلطی کی ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق بھی ہے اور حکیم بھی اس لئے اس کے انتخاب میں تو غلطی نہیں ہوسکتی۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے پیغمبروں کے دل اتنے پاک صاف اور نورانی ہوتے ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی (معصیت) اور گناہ کی طرف ادنی سے ادنی میلان بھی نہیں پیدا ہوسکتا۔

۸۔ انبیاء کرام ہر وقت اللہ تعالیٰ کی خاص نگرانی میں ہوتے ہیں، ان کے قلوب پاک میں معجزانہ طور پر اللہ تعالیٰ اپنی وحی اور اپنا کلام محفوظ رکھتا ہے، ان کی زبان سے وحی کی تبلیغ کرانا اس کا خوب کھول کر لوگوں کو سمجھانا وغیرہ فرائض رسالت کی (انبیائے کرام کی طرف سے) ادائیگی کا ذمہ دار خود اللہ تعالیٰ بن جاتا ہے۔ اور یہ سب معجزانہ انتظامات اسی لئے کئے جاتے ہیں کہ انبیاء کرام سے فرائض رسالت کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوئی

کوتاہی سرزد نہ ہوسکے ورنہ ان سب انتظامات و اعلانات خداوندی کے باوجود انبیائے کرام من جانب اللہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کرجائیں تو اس سے یہ لازم ہوتا ہے کہ العیاذ باللہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ علی کل شیئ قدیر، بکل شیئ علیم اور فعال لما یرید ہے۔ اس کے ارادہ اور قدرت میں عجز و درماندگی بالکل محال ہے۔

۱۰۔ انبیاء کرام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔

۱۱۔ انبیاء کرام کی تقریر بھی شرعی حجت ہوتی ہے جو حدیث وسنت کا حکم رکھتی ہے۔

۱۲۔ اللہ تعالیٰ کے معصوم نمائندے ہونے کی وجہ سے باذن الٰہی انبیاء کرام مطاع مطلق ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے بعد مستقل طور پر انبیاء کرام کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے، انبیاء کرام کی تشریف آوری کا مقصد ہی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ان کی اطاعت کریں۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کا حصول خود ان کی اطاعت پر مبنی ہے وہ خالق اور مخلوق کے مابین ایک قوی اور مؤثر واسطہ فیض ہوتے ہیں، ان کی محبت اور اطاعت کے بغیر کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول نہیں ہوسکتا ان کی پیروی میں جنت اور ان کی مخالفت میں جہنم ملتی ہے۔ اس لئے انبیاء کرام اپنے افعال و اعمال میں بھی مطلقاً معصوم ہوتے ہیں، نہ کبیرہ گناہ سرزد ہوتا ہے نہ صغیرہ۔ ان سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی (معصیت) سرزد نہیں ہوسکتی اور ان کا مطاع مطلق ہونا ہی ان کی عصمت کی دلیل ہے کیونکہ بالفرض اگر ان سے گناہ اور نافرمانی کا صدور ہوجائے تو پھر اس سے یہ لازم آئے گا کہ دوسرے انسان اس گناہ اور نافرمانی میں بھی ان کی اطاعت کریں (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بہرحال ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ ان کی زندگی کو دوسروں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے) لیکن معصیت اور گناہ کی پیروی کا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں ہوسکتا کیونکہ جنوں اور انسانوں کی پیدائش سے مقصود اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور معصیت تو اس کی ضد ہے اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انبیاء کرام

علیہم السلام ہر گناہ اور ہر معصیت سے بالکل معصوم ہوتے ہیں، معصیت کا کوئی داغ ان کے دامن عصمت کو چھو بھی نہیں سکتا۔

حضرت یوسف علیہ السلام:

خود اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں عصمت کی حقیقت ان معجزانہ کلمات میں واضح فرمادی ہے:

کذلک لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصین

(سورۃ یوسف ع ۳) ترجمہ (ا) یونہی ہوا اس واسطے کہ ہٹادیں اس سے برائی اور بے حیائی۔ البتہ وہ ہے ہمارے برگزیدہ بندوں میں۔" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) اسی طرح (ہم نے ان کو علم دیا) تاکہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کو دور رکھیں کیونکہ وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔" (مولانا تھانویؒ)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں: یعنی یہ برہان دکھانا اور اسی طرح ثابت قدم رکھنا اس لئے تھا کہ یوسف ہمارے برگزیدہ بندوں میں ہیں۔ لہٰذا کوئی چھوٹی بڑی برائی خواہ ارادہ کے درجہ میں ہو یا عمل کے ان تک نہ پہنچ سکے۔" آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:

لنصرف عنه السوء والفحشاء (کہ پھیریں ہم حضرت یوسف کو برائی سے اور بے حیائی سے) جس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام تو پیغمبرانہ عصمت کے ساتھ اپنی جگہ ثابت قدم تھے اور آپ کا میلان کسی طرح بھی برائی کی طرف نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو برائی سے ہٹانے کی ضرورت پڑتی بلکہ برائی اور بے حیائی حملہ آور ہو کر آپ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ سے دور ہٹا دیا۔ اور برائی آپ کے دامن عصمت کو داغدار نہ بنا سکی۔

بعض سوالات وشبہات:

سوال (۱) قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حضرت

میں ایک درخت کے قریب جانے سے منع فرمایا تھا لیکن باوجود اس کے حضرت آدم علیہ السلام نے اس درخت کا پھل کھالیا جو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی (معصیت) ہے۔
چنانچہ قرآن مجید میں یہاں تک فرمایا **و عصی آدم ربه فغوی** (پ۱۶۔ سورہ طہٰ ع ۷)
ترجمہ: (ا) اور بے حکمی کی آدم نے اپنے رب کی پھر راہ سے بہکا۔ (حضرت شاہ صاحبؒ)
(ب) اور آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو غلطی میں پڑ گئے" (مولانا تھانویؒ)

تو اس آیت کے باوجود انبیائے کرام کو مطلقاً معصوم کیونکر مان سکتے ہیں۔

الجواب (۱) جب اصولاً قرآن مجید میں محکم آیات سے ثابت ہو گیا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے اقوال و افعال پر اللہ تعالیٰ کی خاص نگرانی ہوتی ہے۔ وہ مطاعِ مطلق ہوتے ہیں، ان کی اطاعت خدا کی اطاعت کا ذریعہ ہے، ان سے گناہ اور معصیت کا صدور نہیں ہوسکتا۔ تو جو آیات بظاہر عصمت انبیاء کے خلاف نظر آتی ہیں ان کی صحیح توجیہ کر کے ان کو محکمات کے تحت رکھا جائے گا۔

(۲) قرآن مجید میں سوائے حضرت آدم علیہ السلام کے اور کسی پیغمبر کی طرف عصیان کی نسبت نہیں کی گئی اور حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں بھی علماء و مفسرین اہل سنت نے متعدد جوابات دے کر ان کی عصمت ثابت کردی ہے لیکن یہاں تفصیلی جوابات عرض کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اور ان سب توجیہات میں سب سے بہتر اور بے غبار توجیہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے درخت ممنوعہ کا پھل نافرمانی کے قصد و ارادہ کی بنا پر نہیں کھایا بلکہ آپ کو اس معاملہ میں بعض امور کے متعلق نسیان ہو گیا تھا اور جو کام نسیان یعنی بھولنے کی وجہ سے کیا جائے وہ گناہ اور معصیت نہیں قرار دیا جاتا مثلاً روزہ دار شخص اگر بھول جانے کی وجہ سے کھا پی لے تو نہ اس کا روزہ ٹوٹتا ہے اور نہ اس پر کفارہ لازم آتا ہے حالانکہ دیکھنے والے کی نظر میں وہ روزہ توڑنے کا گناہ کر رہا ہے لیکن وہ چونکہ بھول کر کھا پی رہا ہے اور اس کو اس وقت روزہ یاد ہی نہیں ہے اس لئے گو وہ صورتاً گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے لیکن حقیقتاً وہ بالکل اس بارے میں گناہ گار نہیں ہے کیونکہ اس نے جان

بوجھ کر روزہ نہیں توڑا۔ اسی طرح آدم علیہ السلام نے بھی درخت کا پھل ضرور کھایا ہے جو صورۃً نافرمانی اور معصیت ہے لیکن آپ نے چونکہ بھول کر ایسا کیا ہے اس لئے انہوں نے حقیقی معصیت و نافرمانی کا ارتکاب نہیں کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی حضرت آدم علیہ السلام کے نسیان کا ذکر فرما کر آپ کے فعل کی حقیقت حسب ذیل آیات میں بیان فرمادی ہے:

ولقد عهدنا الى آدم من قبل فنسى ولم نجد له عزما (پ ۱۶ سورہ طہ ع ۷) ترجمہ (ا) اور ہم نے مقید کر دیا تھا آدم کو اس سے پہلے پھر بھول گیا اور نہ پائی ہم نے اس میں کچھ ہمت۔" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) "اور اس سے (بہت عرصہ) پہلے ہم آدم کو ایک حکم دے چکے تھے سو ان سے غفلت (اور بے احتیاطی) ہوگئی ہم نے (اس حکم کے اہتمام میں) ان میں پختگی (اور ثابت قدمی) نہ پائی۔ (مولانا تھانویؒ)

جب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرمادیا کہ حضرت آدمؑ کا یہ فعل بھول جانے کی بنا پر تھا تو پھر اس کو گناہ اور معصیت کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے۔

امام رازیؒ نے بھی ایک وجہ یہی بیان کی ہے:

وهو انه فعل ناسيا فهو قول طائفة من المتكلمين واحتجوا عليه بقوله تعالى فنسى آدم ولم نجد له عزما و مثلوه بالصائم فيشتغل بامر يستغرقه ويغلب له فيصير ساهياً عن الصوم و ياكل فى اثناء ذلك السهو عن قصده (تفسیر کبیر)

اور ایک جواب یہ ہے کہ حضرت آدمؑ نے یہ فعل بھول کر کیا تھا اور یہ قول متکلمین کی ایک جماعت کا ہے اور انہوں نے اس پر آیت فنسى آدم ولم نجد له عزما سے استدلال کیا ہے اور انہوں نے اس پر روزے دار کی مثال دی ہے کہ وہ کسی کام کی وجہ سے اتنا مشغول اور مغلوب ہوجاتا ہے کہ اس کو روزہ یاد ہی نہیں رہتا اور وہ اس

نسیان (بھولنے) کی حالت میں کوئی چیز کھالیتا ہے۔

(ب) بعض مفسرین نے آیت میں عزما سے مراد قصد وارادہ لیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ میں درخت کا پھل کھانے کا ارادہ نہیں پایا۔ یعنی انہوں نے قصد وارادہ سے حکم خداوندی کی مخالفت نہیں کی اور قاضی عیاض محدثؒ نے بھی اس معنی کو ترجیح دی ہے واللہ اعلم۔

مودودی تفسیر:

ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے آیت عصى آدم ربه فغوى کا ترجمہ یہ لکھا ہے:

"آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا۔"

اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

بس ایک فوری جذبے نے جو شیطانی تحریض کے زیر اثر ابھر آیا تھا ان پر ذہول طاری کر دیا اور ضبط نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مقامِ بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرے۔" (تفسیر تفہیم القرآن جلد ۳ سورہ طہ ص ۱۳۳ طبع ہشتم ناشر مکتبہ تعمیر انسانیت موچی دروازہ لاہور)

مودودی صاحب کے یہ الفاظ کہ: "وہ طاعت کے مقامِ بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرے" بالکل نامناسب ہیں کیونکہ یہ فعل حضرت آدم علیہ السلام کا نسیان (بھول) پر مبنی ہے اور بھول کر جو کام کیا جائے اس کو معصیت کی پستی میں گرنے سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔

(۲) حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کے سلسلے میں لکھا ہے:

"زمین کی اصل خلافت وہی تھی جو آدم علیہ السلام کو ابتداءً جنت میں دی گئی تھی۔ وہ جنت ممکن ہے کہ آسمانوں میں ہو اور ممکن ہے کہ اسی زمین پر بنائی گئی ہو بہر حال وہاں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اس شان سے رکھا گیا تھا کہ اس کے کھانے پینے اور لباس و مکان کا سارا انتظام سرکار کے ذمہ تھا اور خدمتگار

(فرشتے) اس کے حکم کے تابع تھے۔ اس کو اپنی ذاتی ضروریات کے لئے قطعاً کوئی فکر نہ کرنی پڑتی تھی تاکہ وہ خلافت کے بزرگ تر اور بلند تر وظائف ادا کرنے کے لئے مستعد ہو سکے۔ مگر اس عہدے پر مستقل تقرر ہونے سے پہلے امتحان لینا ضروری سمجھا گیا تاکہ امیدوار کی صلاحیتوں کا حال کھل جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی کمزوریاں کیا ہیں اور خوبیاں کیا۔ چنانچہ امتحان لیا گیا اور جو بات کھلی وہ یہ تھی کہ یہ امیدوار تحریص و اطماع کے اثر میں آکر پھسل جاتا ہے۔ اطاعت کے عزم پر مضبوطی سے قائم نہیں رہتا اور اس کے علم پر نسیان غالب آجاتا ہے اس امتحان کے بعد آدمؑ اور ان کی اولاد کو مستقل خلافت پر مامور کرنے کے بجائے آزمائشی خلافت دی گئی اور آزمائش کے لئے ایک مدت (اجلِ مسمیٰ جس کا اختتام قیامت پر ہوگا) مقرر کر دی گئی الخ (ایضاً تفہیم القرآن ص ۱۳۵) یہاں اس بحث کی گنجائش نہیں کہ حضرت آدم جس جنت میں رکھے گئے تھے وہ آسمان پر تھی یا زمین پر البتہ راجح یہی ہے کہ وہ جنت آسمانوں ہی کی تھی۔

(ب) مودودی صاحب پر مروجہ سیاست اتنی غالب آچکی ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو بجائے نامزد نبی اور خلیفہ الٰہی ہونے کے خلافت و نبوت کا امیدوار قرار دیکر نکتہ سنجی کر رہے ہیں کہ:

"جو بات کھلی وہ یہ تھی کہ یہ امیدوار تحریص واطماع کے اثر میں" الخ

حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام خود امیدوار نہ تھے بلکہ آپ کو پیدا ہی نبی اور خلیفہ کی حیثیت سے کیا گیا تھا۔ اور ملائکہ سے آپ کی خلافت تسلیم کرائی تھی۔ تو اس نامزدگی کے بعد امیدوار کے امتحانِ خلافت و نبوت کا کیا معنیٰ؟ اور مودودی صاحب اسکے ساتھ ہی یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ: بہرحال وہاں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اس شان سے رکھا گیا تھا الخ

تو جب آپ جنت میں بحیثیت خلیفہ ہی رکھے گئے تھے تو پھر امیدواری کیسی

اور خلافت کا امتحان کیسا؟

(ج) لکھتے ہیں: مگر اس عہدے پر مستقل تقرر ہونے سے پہلے امتحان لینا ضروری سمجھا گیا تاکہ امیدوار کی صلاحیتوں کا حال کھل جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی کمزوریاں کیا ہیں اور خوبیاں کیا۔ چنانچہ امتحان لیا گیا اور جو بات کھلی وہ یہ تھی کہ یہ امیدوار تحریص و اطماع کے اثر میں آکر پھسل جاتا ہے۔ اطاعت کے عزم پر مضبوطی سے قائم نہیں رہتا اور اس کے علم پر نسیان غالب آجاتا ہے الخ۔

یہ تعریفات بھی خاص مودودی ذہن کی پیداوار ہیں کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام ارشاد خداوندی انی جاعل فی الارض خلیفة کے تحت نامزد خلیفہ ہیں نہ کہ امیدوار۔ اور تمام انبیائے کرام علیہم السلام بلا امتحان حق تعالیٰ کے منتخب شدہ نبی ہوتے ہیں جیسا کہ فرمایا اللہ یصطفی من الملئکة رسلا ومن الناس (اسی قسم کی آیات ابتداءً پیش کی جا چکی ہیں) اور یہ کہنا بھی غلطی ہے کہ جو بات کھلی وہ یہ تھی الخ کیونکہ یہ واقعہ شجر ممنوعہ کا پھل کھانے کا ایک ہی دفعہ ہوا ہے اور جنت میں نسیان بھی ایک ہی بار ہوا ہے نہ کہ بار بار تاکہ یہ کہا جائے کہ اس کے علم پر نسیان غالب آجاتا ہے۔" اور حضرت آدم کی یہ زلت (پھسلنا) بھی جنت میں ایک بار ہی ہوئی اور شیطان کی تحریص واطماع کا تعلق بھی کسی برائی سے نہیں تھا۔ بلکہ جنت میں ہمیشہ رہنے اور فرشتوں کی طرح ہو جانے کے متعلق تھا۔ علاوہ ازیں مودودی صاحب کی اس تفسیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبوت کو وہبی نہیں سمجھتے اسی لئے نبوت ملنے سے پہلے انہوں نے امتحان لینے کا ایک مفروضہ وضع کرلیا۔ جو قرآنی نصوص کے بالکل خلاف ہے۔ منصب نبوت کے متعلق اس قسم کے سیاسی تصورات کے بعد تعجب اس تعلیم یافتہ طبقے پر ہے جو مودودی صاحب کو مفکر اسلام اور امام زماں قرار دیتے ہیں

گر ہمیں مکتب ہمیں ملا کار طفلاں تمام خواہد شد

سوال نمبر (۲) اگر آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی تو قرآن مجید میں آپ کے اس فعل کو معصیت سے کیوں تعبیر کیا ہے (وعصى آدم ربه فغوى)

الجواب (۱) عربی زبان میں لغزش اور بھول چوک پر بھی مجازاً معصیت کا لفظ بول دیا جاتا ہے۔ چنانچہ کتب لغت لسان العرب اور اقرب الموارد وغیرہ میں ہے: المعصية مصدر و قد تطلق على الزلة مجازا (معصیت مصدر ہے اور کبھی اس کا اطلاق مجازاً لغزش پر بھی ہوتا ہے)

(۲) انبیائے کرام علیہم السلام کی بلند شان کے پیش نظر ان کی بھول چوک، لغزش اور ترک اولیٰ پر بھی مؤاخذہ ہوتا ہے جو غیر نبی کے لئے معاف ہے۔ چنانچہ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

فهوا ان العتاب انما حصل على ترك التحفظ من اسباب النسيان و هذا الضرب من السهو موضوع من المسلمين وقد كان يجوز ان يؤاخذوا به و ليس بموضوع من الانبياء لعظم خطرهم. (تفسیر کبیر)

"اور حضرت آدمؑ کو عتاب اس لئے ہوا کہ آپ نے ان اسباب کا تحفظ چھوڑ دیا جن کی وجہ سے نسیان ہوسکتا تھا اور یہ سہو ونسیان عام مسلمانوں سے معاف ہے۔ اگرچہ یہ جائز تھا کہ ان سے بھی مؤاخذہ کیا جاتا۔ لیکن انبیائے کرام علیہم السلام سے بوجہ ان کی بلند شان کے معاف نہیں ہے"۔

(۳) فسمى الله تعالى و قوعهم فى خلاف الاولى معصية و خطيئة.

(الیواقیت والجواہر ج۲ ص ۵۹)

امام شعرانی فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بلند شان کے پیش نظر ان کے ترک اولی کو بھی معصیت اور خطا سے تعبیر کیا ہے۔

۴۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب مفسر پانی پتی فرماتے ہیں: و ترك الاولى يعد ذنبا بالنسبة الى الانبياء لعظمة شانهم و ان لم يكن ذنبا

(تفسیر مظہری سورۃ القلم)

"اور ترک اولیٰ اگرچہ گناہ نہیں ہوتا لیکن وہ بوجہ انبیائے کرام کی عظمت شان کے گناہ شمار کیا جاتا ہے۔"

۵۔ علامہ علی قاری حنفیؒ محدث فرماتے ہیں:

فعوتبوا بان الحق سبحانه وتعالى سمى ترك الافضل منهم كترك الواجب من الغير (شرح فقہ اکبر)

"پس انبیاء کو عتاب اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ترک افضل کو دوسروں کے ترک واجب کی طرح قرار دیا ہے۔

۶۔ اجيب بان الحق سبحانه و تعالى سمى ترك الافضل لهم معصية لعلو شانهم و عظم رتبهم (نبراس شرح شرح العقائد للنسفی) "اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے ان کے ترک افضل کو ان کی بلند شان اور عظیم مرتبت کی وجہ سے معصیت کا نام دیا ہے"

۷۔ حضرت مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں: جس قدر فہم و خصوصیت زیادہ ہوتی ہے اس پر ملامت زیادہ ہوتی ہے اور اسی وجہ سے کہا گیا حسنات الابرار سيئات المقربين. اور ماحصل اس کا یہ ہوتا ہے کہ تم نے زیادہ غور سے کیوں نہیں کام لیا تو یہ دار و گیر عین دلیل کمال آدمؑ اور ان کی مقبولیت کی ہے (تفسیر بیان القرآن سورۃ البقرہ)

۸۔ امام راغب اصفہانی "المعصیت" کے تحت لکھتے ہیں: هو الخروج عن الطاعة عمداً كان او سهوًا كثيرًا كان او يسيراً (مفردات القرآن)

معصیت طاعت سے نکلنے کو کہتے ہیں خواہ عمداً ہو یا سہواً زیادہ ہو یا تھوڑی)

۹۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا ارشاد ہے: "ترک اولی کا بھی انبیاء کے حق میں حکم معصیت اور ظلم کا رکھتا ہے نہ عوام الناس کے حق میں"۔

(تحفہ اثنا عشریہ مترجم اردو ص ۳۱۵)

۱۰۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں: "یعنی جب حکم الٰہی کے امتثال میں

غفلت وکوتاہی ہوئی تو اپنی شان کے موافق عزم واستقامت کی راہ پر ثابت قدم نہ رہے۔اسی کو غوایت اور عصیان سے تغلیظاً تعبیر فرمایا بقاعدہ حسنات الابرار سیات المقربین (یعنی ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے لئے ان کے بلند مقام قرب خداوندی کی وجہ سے برائیاں قرار دی جاتی ہیں) یہی وجہ ہے کہ گو انبیائے کرام علیہم السلام سے حقیقتاً گناہ اور معصیت کا صدور نہیں ہوتا لیکن وہ عظمت خداوندی کے پیش نظر اپنی لغزش اور بھول چوک کو بھی بہت محسوس کرتے ہیں اور اس سے توبہ واستغفار کرتے رہتے ہیں اور حضور رحمۃ للعالمین خاتم النبیین امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں کہ میں دن میں ستر بار سے زیادہ استغفار کرتا ہوں اور بعض روایات میں ہے کہ میں دن میں سومرتبہ استغفار کرتا ہوں۔تو حضور ﷺ کا یہ استغفار بھی اپنے بلند مرتبہ مقام کے پیش نظر ہے۔اور محققین عارفین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ حضور ہر آن مقام قرب میں ترقی فرما رہے ہیں۔تو حضور ﷺ جب اپنے حالیہ مقام پر نظر فرماتے تو احساس ہوتا کہ کاش میں کل گزشتہ اس مقام پر ہوتا اور آج اس سے آگے مقام پر۔تو اس بنا پر حضور استغفار فرماتے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

جب یہ کہا جاتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام سے تبلیغ وحی اور فریضۂ رسالت میں کوتاہی اور لغزش سرزد نہیں ہوتی تو بعض ناواقف لوگ علمائے اہلسنت کی وہ عبارات پیش کردیتے ہیں جن میں انبیائے کرام کی طرف لغزش اور کوتاہی کی نسبت کی گئی ہے اور جس کو شرعی اصطلاح میں زلت کہتے ہیں اور حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق جو ابوالاعلی مودودی نے لکھا ہے کہ آپ سے فریضۂ رسالت کی ادئیگی میں کوتاہیاں ہوگئی تھیں اور مفتی محمد یوسف صاحب نے بھی ان کی حمایت میں کئی اوراق سیاہ کئے ہیں اس کی تائید میں بھی مودودی صاحبان یہی عبارتیں پیش کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک فریضۂ رسالت کے دائرہ میں انبیائے کرام لغزش اور کوتاہی سے بھی معصوم ہوتے ہیں

جیسا کہ قرآن کی محکم آیات سے اس کا ثبوت پیش کردیا گیا ہے۔علاوہ ازیں انبیائے کرام سے جس قسم کی لغزش وکوتاہی کا صدور علمائے اہل سنت مانتے ہیں ان کا تعلق فریضۂ رسالت کی ادائیگی سے نہیں ہوتا اور عموماً ایسی لغزش کا تعلق اللہ تعالیٰ اور انبیائے کرام کے مابین کسی معاملہ اور جزوی واقعات سے ہوتا ہے مثلاً حضرت آدم علیہ السلام سے جو لغزش ہوئی اس کا تعلق فریضۂ رسالت سے بالکل نہیں تھا کیونکہ اس وقت تک آپ پر فرائض رسالت نازل ہی نہیں ہوئے تھے اور امت کی ہدایت کا آپ کو حکم ہی نہیں دیا گیا تھا بلکہ اس وقت تک آپ کی امت کا وجود ہی نہیں تھا۔''

زَلّت کا مفہوم:

چونکہ مسئلہ عصمت انبیائے کرام کے سلسلہ میں عموماً زلت اور ترک اولی کے الفاظ آتے ہیں اس لئے ان کا مطلب سمجھنا بھی ضروری ہے۔زَلت کا لغوی معنی لغزش ہے یعنی پھسلنا اور شرعی اصطلاح میں زَلت اس غلطی کو کہتے ہیں جو بلاقصد وارادہ سرزد ہوجائے چنانچہ (ا) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

''اور یہ ایسا ہے جیسے کوئی راہ گیر راہ چلا جاتا ہے اور اس راہ کے ساتھ پتھر یا کیچڑ لگی ہو اور اس سے ٹھوکر کھائی یا پاؤں پھسل گیا اسی سبب سے اس کو زَلت کہتے ہیں۔ (تحفہ اثنا عشریہ مترجم اردو ص ۳۰۸)

(ب) نیز حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرماتے ہیں: ''اس واسطے اکثر محققین اس طرف گئے ہیں کہ کوئی شخص امر مباح یا بندگی کا ارادہ کرے اور بسبب غفلت اور بے احتیاطی کے اس امر مباح یا مستحب میں اس سے خلاف شرع کوئی امر ظہور میں آوے۔پس صورت اس عمل کی صورت گناہ کی ہے اور حقیقت میں طاعت یا مباح ہے۔'' (تفسیر عزیزی مترجم اردو۔سورۂ بقرہ ص ۱۱۹)

طاعت یا مستحب وہ فعل ہے جس پر ثواب ملتا ہے اور مباح وہ فعل ہے جس کا کرنا جائز ہے لیکن اس پر ثواب ضروری نہیں اور نہ ہی اس کے ترک کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔

(۲) حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں ---- ''کبھی بھولے چوکے یا بتقاضائے محبت بھی انبیاء سے مخالفت ہوجاتی ہے البتہ عمداً نہیں ہوتی، الحاصل گناہ وہ مخالفت ہے جو عمداً ہو اور باعث مخالفت اس کی محبت وعظمت نہ ہوئی ہو جس کی مخالفت کرتا ہے، اگر بوجہ نسیان یا بوجہ تقاضائے محبت وعظمت مخالفت سرزد ہوجائے تو پھر اس کو گناہ نہیں کہتے بلکہ زلت کہتے ہیں جس کا ترجمہ لغزش ہے۔'' اس کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ لغزش اس حرکت کو کہتے ہیں جو بے اختیارانہ صادر ہو۔ کسی اور کے دھکے اور صدمہ سے وقوع میں آئے مگر ایسی حرکت کو کوئی عاقل جرم اور بغاوت اور سرکشی کے اقسام میں شمار نہیں کرتا۔'' (مباحثہ شاہجہان پور ص ۳۶)

۳۔ علامہ تفتازانی لکھتے ہیں: قال شمس الائمۃ السرخسی اما الزلۃ فلا یوجد فیھا القصد الی عینھا ولکن یوجد القصد الی اصل الفعل لانھا اخذت من قولھم زل الرجل فی الطین اذلم یوجد القصد الی الوقوع ولا الی الثبات بعد الوقوع ولکن وجد القصد الی المشی فی الطریق و انما یواخذ علیھا لانھا لا تخلو عن نوع تقصیر یمکن للمکلف الاحتراز عنہ عند التثبیت واما المعصیۃ فھو فعل حرام یقصد الی نفسہ مع العلم بحرمتہ (تلویح)

''شمس الائمہ سرخسی نے فرمایا کہ زلت میں اصل فعل کا قصد تو پایا جاتا ہے مگر اس کی ذات کا قصد نہیں پایا جاتا کیونکہ زلت ماخوذ ہے زل الرجل فی الطین سے جس کا معنی یہ ہے کہ آدمی گارے میں پھسل گیا، یہ اس وقت کہا جاتا ہے کہ جبکہ قصد تو راستہ پر چلنے کا ہو لیکن بلا قصد کے گارے میں گر جائے اور گرتے ہی سنبھل جائے، لیکن گارے میں گرنا اور پھر سنبھل جانا پہلے اس کے ارادہ میں نہ تھا اور زلت پر مواخذہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ اس قسم کی تقصیر

سے خالی نہیں ہوتا کہ اگر مکلف (انسان) زیادہ مضبوطی سے کام لیتا تو اس سے بچنا ممکن تھا۔ اور جو (حقیقتاً) معصیت ہے تو اس میں باوجود اس کی حرمت کا علم ہونے کے فعل حرام کی ذات کا قصد ہوتا ہے) زلت اور معصیت کی بحث علمی محاسبہ میں دوبارہ مطالعہ فرمالیں۔

ترک اولیٰ:

اولیٰ بمعنی بہتر اور افضل ہے۔ ترک کا معنی چھوڑنا ہے اور شرعی اصطلاح میں ترک اولی اور ترک افضل کا یہ مطلب ہے کہ کسی کام کے دو پہلو ہوں اور وہ دونوں جائز اور صحیح ہوں لیکن ان میں سے ایک پہلو دوسرے سے بہتر اور افضل ہو جس کو چھوڑ کر اس سے کم درجے کا پہلو اختیار کیا گیا ہو تو اس کو ترک اولی اور ترک افضل کہا جاتا ہے یعنی بہتر پہلو کو چھوڑ دینا اور یہ گناہ اور معصیت نہیں ہوتا لیکن انبیاء کرام علیہم السلام کی عظمت شان کے تحت اس پر مواخذہ ہوتا ہے۔

سوال نمبر۳:

(ا) قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں ہے ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین اور حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین ان آیات سے حضرت آدم اور حضرت یونس علیہما السلام کا ظالم ہونا ثابت ہوتا ہے جو عصمت انبیاء کے خلاف ہے۔

(ب) ووجدک ضالا فھدی (سورۃ الضحیٰ) اور واستغفر لذنبک وللمؤمنین والمؤمنات (سورۃ محمد) میں اور سورہ الفتح کی آیت لیغفرلک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر میں ذنب کی نسبت حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے جو بظاہر عصمت انبیاء کے منافی ہے۔

الجواب (۱) ان آیات کے متعلق اصولی جواب تو وہی ہے جو سوال نمبر (۱) کے جواب نمبر (۱) میں عرض کر دیا گیا ہے۔

(۲) ظلم، ضلالت اور ذنب عربی زبان میں مشترک الفاظ ہیں جن کے مختلف معانی آتے ہیں چنانچہ عربی لغت میں (أ) ظلم کا معنی ہے وضع الشیئ فی غیر محله (کسی چیز کو بے موقع رکھ دینا) (ملاحظہ ہو مفردات امام راغبؒ)

(ب) ظلم بمعنی کم ہونے کے بھی آتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

کلتا الجنتین اتت اکلها ولم تظلم منه شیئاً (سورۃ الکھف)

ترجمہ (أ) دونوں باغ لاتے ہیں اپنا میوہ اور نہ گھٹاتے اس میں سے کچھ"

(حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) اور دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے اور کسی کے پھل میں ذرا بھی کمی نہ رہتی تھی۔ (مولانا تھانویؒ)

اس آیت میں ظلم کا لفظ پھلوں کی کمی پر بولا گیا ہے۔

(ج) اور قرآن مجید میں ظلم بمعنی شرک بھی مستعمل ہے، چنانچہ پ ۷، سورۃ الانعام ع ۱۰ میں ہے:

الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانهم بظلم اولئک لهم الامن وهم مهتدون.

ترجمہ (أ) جو لوگ یقین لائے اور ملائی نہیں اپنے یقین میں کچھ تقصیر، انہی کو ہے خاطر جمع اور وہی ہیں راہ پائے۔" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کرتے ایسوں ہی کے لئے امن ہے اور وہی راہ پر (چل رہے) ہیں۔

(حضرت تھانویؒ)

تو جب قرآن مجید میں لفظ ظلم مختلف معانی میں آتا ہے جس میں مراد پھلوں کا کم ہونا بھی ہے۔ تو اگر یہ لفظ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام کے

بارے میں استعمال ہوا ہے تو اس کا مطلب گناہ ہی کیوں ہوگا؟ اور جب دلائل سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت یونسؑ سے صرف ان کی شان کے مطابق لغزش کا صدور ہوا ہے تو ان آیات بالا میں بھی ظلم بمعنی لغزش ہے نہ کہ گناہ اور معصیت۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ سورۃ الاعراف ع ۲ کی زیر بحث آیت ربنا ظلمنا انفسنا کے تحت لکھتے ہیں چونکہ انبیاء علیہم السلام کی چھوٹی سی لغزش بھی ان کے مرتبہ قرب کے لحاظ سے عظیم و ثقیل بن جاتی ہے اس لئے اپنی غلطی کا ظاہری نقصان اٹھانے کے علاوہ مدت دراز تک توبہ استغفار میں مشغول گریہ و بکا رہے، آخر کار ثم اجتباه ربه فتاب علیه و هدی کے نتیجہ پر پہنچ گئے۔

بود آدم دیدۂ نور قدیم　　موئے در دیدہ بود کوہ عظیم

(یعنی حضرت آدم علیہ السلام نور قدیم کی ایک آنکھ تھے اور آنکھ میں بال کا پڑ جانا بھی ایک بڑا پہاڑ بن جاتا ہے) اور پ ۱۷ سورۃ الانبیاء ع ۶ میں حضرت یونس علیہ السلام کے قول لا اله الا انت سبحانک انی کنت من الظّٰلمین کے تحت علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں۔ "اپنی خطا کا اعتراف کیا کہ بے شک جلدی کی تیرے حکم کا انتظار کئے بدوں بستی والوں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ گو یونس علیہ السلام کی یہ غلطی اجتہادی تھی جو امت کے حق میں معاف ہے مگر انبیاء کی تربیت و تہذیب دوسرے لوگوں سے ممتاز ہوتی ہے الخ"

حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں "علمی محاسبہ" میں مفصل بحث گزر چکی ہے دوبارہ مطالعہ کر لی جائے۔

امام المعصومین کے لئے ذنب اور ضلال کے استعمال کا جواب:

حضور رحمۃ للعالمین امام المعصومین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو فرمایا ہے:

ووجدک ضالا فهدی (پ ۳۰ سورۃ الضحیٰ)

ترجمہ (أ): اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سمجھائی" (حضرت شاہ صاحب)

(ب) اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو (شریعت سے) بے خبر پایا سو (آپ کو شریعت کا)

راستہ بتلا دیا'' (مولانا تھانویؒ)

علامہ آلوسیؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: ووجدک غافلا عن الشرائع التی لا تھتدی الیھا العقول کما فی قولہ تعالی ما کنت تدری ما الکتاب و قولہ تعالی و ان کنت من قبلہ لمن الغافلین (اور آپ کو ناواقف پایا ان شرعی تفصیلات سے جن کی طرف عقلیں راہ نہیں پاسکتیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے کہ آپ نہیں جانتے تھے کہ الکتاب کیا ہے اور بے شک اس سے پہلے آپ ان (واقعات) کی خبر نہیں رکھتے تھے (روح المعانی)

عربی زبان میں لفظ ضلال (ضل یضل) مختلف معانی میں مستعمل ہوتا ہے، چنانچہ (۱) سورۃ فاتحہ میں ولا الضالین میں الضالین سے مراد نصاریٰ ہیں جن کی گمراہی کفر اور شرک کے درجہ میں ہے۔

(۲) قرآن مجید میں ہے: ان تضل احداھما فتذکر احداھما الاخریٰ. (پ۳ سورۃ البقرہ ع ۳۹)

ترجمہ (ا) کہ بھول جاوے ایک عورت تو یاد دلاوے اس کو وہ دوسری۔

(حضرت شاہ صاحب)

(ب) تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی بھول جائے تو ان میں کی ایک دوسری کو یاد دلا دے (مولانا تھانویؒ) اس آیت میں ضلال سے مراد گمراہی میں عورت کا بھولنا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے جواب میں فرمایا:

فعلتھا اذا و انا من الضالین (پ۱۹۔ سورہ الشعراء ع ۲)

ترجمہ (ا): کیا تو ہے میں نے وہ اور میں تھا چوکنے والا'' (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) (واقعی) اس وقت وہ حرکت میں کر بیٹھا تھا اور مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔

(مولانا تھانویؒ)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: یعنی قبطی کا خون میں نے دانستہ نہیں کیا تھا۔ غلطی سے ایسا ہوگیا، مجھے کیا خبر تھی کہ ایک مکا مارنے میں جو تادیب کے لئے تھا اس کا دم نکل جائے گا فوکزہ موسیٰ فقضیٰ علیہ (قصص ع ۲) قاضی عیاض محدث فرماتے ہیں: ای من المخطئین الفاعلین شیئا بغیر قصد قالہ ابن عرفۃ و قال الازھری معناہ من الناسین (الشفاء عربی جلد دوم ص ۲۶۵) یعنی میں بھی ان خطا کرنے والوں میں سے ہوں جو بلا ارادہ کوئی کام کر لیتے ہیں ابن عرفہ کا یہی قول ہے اور ازہری فرماتے ہیں: ''میں بھولنے والوں میں سے ہوں۔'' یعنی یہاں ضال کا معنی بھولنے والا ہے۔ کتب لغت میں سے لسان العرب میں ہے۔ ضل، خفی و غاب یعنی ضل کا معنی ہے پوشیدہ ہوگیا غائب ہوگیا۔ عربی محاورہ ہے ضل الماء فی اللبن (پانی دودھ میں غائب ہوگیا) مجمع البحار میں ہے الضلال. الضیاع (ضلال کا معنی ہے ضائع ہونا) تو جب عربی محاورات اور قرآنی آیات میں لفظ ضلال کا اطلاق مختلف معانی پر ہوتا ہے جن میں غائب ہوجانا اور بھول جانا بھی آتا ہے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اگر قرآن مجید میں لفظ ضال مذکور ہے تو اس کا معنی لازماً گمراہ اور گناہگار ہی کیوں لیا جائے گا؟ حالانکہ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ضلالت اور غوایت دونوں کی صراحتاً نفی فرمادی ہے۔ چنانچہ پ ۲۷ سورۃ النجم میں ہے ما ضل صاحبکم و ماغوی.

(ترجمہ) (ا) بہکا نہیں تمہارا رفیق اور بے راہ نہیں چلا۔ (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) یہ تمہارے ہمہ وقت ساتھ رہنے والے نہ راہ (حق) سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ ہوئے۔

(مولانا تھانویؒ)

حضرت تھانویؒ ضلالت اور غوایت میں فرق کرتے ہوئے لکھتے ہیں

کہ: ضلال یہ کہ رستہ بھول کر کھڑا رہ جائے اور غوایت یہ کہ غیر راہ کو راہ سمجھ کر چلتا رہے۔ (بیان القرآن)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں: رفیق سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یعنی نہ آپ غلط فہمی کی بنا پر راستے سے بہکے اور نہ اپنے قصد و اختیار سے جان بوجھ کر بے راہ چلے بلکہ جس طرح آسمان کے ستارے طلوع سے لے کر غروب تک ایک مقررہ رفتار سے متعین راہ پر چلے جاتے ہیں، کبھی ادھر کبھی ادھر ہٹنے کا نام نہیں لیتے۔ آفتاب نبوت بھی اللہ کے مقرر کئے ہوئے راستہ پر برابر چلا جاتا ہے ممکن نہیں ایک قدم ادھر ادھر پڑ جائے، ایسا ہو تو ان کی بعثت سے جو غرض متعلق ہے وہ حاصل نہ ہو۔"

حافظ ابن کثیر محدثؒ فرماتے ہیں:۔ وهو الشهادة للرسول صلى الله عليه وسلم بانه راشد تابع للحق ليس بضال وهو الجاهل الذى يسلك على غير طريق بغير علم و الغاوى هو العالم بالحق العادل عنه قصدا الى غيره فنزه الله رسوله و شرعه عن مشابهة اهل الضلال كالنصارى و طرائق اليهود و هى علم الشئى و كتمانه والعمل بخلافه. بل هو صلاة الله وسلامه عليه وما بعثه الله به الشرع العظيم فى غاية الاستقامة والاعتدال والسداد ولهذا قال تعالى (وما ينطق عن الهوى) اى ما يقول قولا عن هوى وغرض ان هو الا وحى يوحى انما يقول ما امر به يبلغه الى الناس كاملا موفورا من غير زيادة ولا نقصان الخ (تفسیر ابن کثیر جلد۴)

"اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ شہادت ہے کہ بے شک آپ سیدھے راستے پر چلنے والے، حق کے تابع ہیں اور ضال نہیں ہیں اور ضال وہ ناواقف شخص ہے جو نہ جاننے کی وجہ سے اپنے راستہ کے

خلاف کسی راستہ پر چل پڑتا ہے اور غاوی وہ آدمی ہے جو حق کو جاننے والا ہے لیکن جان بوجھ کر اس کو چھوڑ کر اس کے خلاف راستے پر چلتا ہے پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شرع کو اہل ضلال یعنی نصاریٰ اور یہود کے طریقوں سے منزہ (پاک) فرمایا ہے اور یہود کا طریقہ یہ ہے کہ علم کے باوجود کسی چیز کو چھپایا جائے اور اس کے خلاف عمل کیا جائے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی وہ عظیم شریعت جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھیجا ہے انتہائی استقامت، اعتدال اور سیدھی راہ پر ہیں اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وما ينطق عن الهوى آپ کوئی بات اپنی خواہش اور غرض کی بنا پر نہیں فرماتے ان هو الا وحى يوحى یعنی آپ وہی فرماتے ہیں جس کا آپ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ اور اس کو لوگوں تک بغیر کسی کمی و بیشی کے کامل اور پورا پورا پہنچا دیتے ہیں۔"

تو جب تک اللہ تعالیٰ نے سورۃ النجم کی آیت بالا میں ستارے کی قسم کھا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر قسم کی ضلالت اور غوایت کی قطعی نفی فرما دی ہے تو پھر آیت زیر بحث یعنی ووجدک ضالا میں ضال کا وہ معنی لیا جائے گا جو سورۃ النجم کی محکم آیت کے خلاف نہ ہو۔ اس لئے ضال کا معنی سورۃ الضحیٰ میں "ناواقف" ہوتا ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحی آنے سے پہلے شریعت کی تفصیلات سے واقف نہ تھے پھر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ قرآن آپ کو شریعت کی تفصیلات سے مطلع فرمایا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

"اور وحی سے پہلے شریعت کی تفصیل معلوم نہ ہونا کوئی منقصت نہیں" (تفسیر بیان القرآن) اور مشہور محدث قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ آپ اپنی شریعت سے بے خبر تھے سو آپ کو اس کی جانب ہدایت کی اور ضلال اس جگہ تحیر کے معنی میں ہے" (نسیم الریاض شفاء قاضی عیاضؒ، ص۱۲۲)

آیت دوم:

واستغفر لذنبک و للمؤمنین والمؤمنت (پ۲۶ سورۃ محمد ع۲)

ترجمہ (ا) اور معافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے اور ایماندار مردوں اور عورتوں کے لئے (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) اور اپنی خطا کی معافی مانگتے رہئے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں کے لئے بھی'' (مولانا تھانویؒ)

یہاں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب مفسر دہلوی قدس سرہٗ نے ذنب کا ترجمہ جو گناہ لکھا ہے تو وہ مجازاً اور صورتاً نہ کہ حقیقتاً۔ کیونکہ محکم آیات سے امام المعصومین صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلقاً معصوم ہونا ثابت ہے اور اس دور میں چونکہ اہل سنت والجماعت کے عقائد سے تعلیم یافتہ لوگ واقف تھے اور علمی طور پر ایسے مسائل حل کئے جاتے تھے اس لئے ذنب کا ترجمہ گناہ لکھنے سے غلط فہمی کا موقع کم ہوتا تھا لیکن موجودہ دور میں چونکہ اہل سنتؒ کے بنیادی عقائد کی تبلیغ کم ہے اور بجائے حق پسندی کے حجت بازی کا زور ہے اس لئے اب ذنب کا ترجمہ ایسے لفظ سے کرنا چاہئے جو اس کی حقیقی مراد ہے چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ذنب کا ترجمہ خطا لکھا ہے اور خطا سے مراد بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ و ارفع مرتبہ کے مناسب اجتہادی خطا اور لغزش ہے اور حضورؐ کے استغفار کی نوعیت بھی وہ نہیں جو دوسروں کی ہے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں حضورؐ کے استغفار کی توجیہ بیان کردی گئی ہے۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ آیت بالا کے تحت لکھتے ہیں:

''ہر ایک کا ذنب (گناہ) اس کے مرتبہ کے موافق ہوتا ہے، کسی کام کا بہت اچھا پہلو چھوڑ کر کم اچھا پہلو اختیار کرنا گو وہ حدود جواز و استحسان میں ہو بعض اوقات مقربین میں ذنب (گناہ) سمجھا جاتا ہے حسنات الابرار سیأت المقربین کے یہی معنی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دن میں سو بار استغفار فرماتے تھے۔''

آیت لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وماتاخر (سورۃ الفتح)

ترجمہ (ا): تاکہ معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہوئے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے۔ (حضرت شاہ صاحب)

(ب) تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کردے۔ (مولانا تھانویؒ)

(۱) اس آیت کے تحت علامہ عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

خداوند قدوس نے اس فتح مبین کے صلہ میں آپ کو چار چیزوں سے سرفراز فرمایا جن میں پہلی چیز غفران ذنوب ہے (ہمیشہ سے ہمیشہ تک کی سب کوتاہیاں جو آپ کے مرتبہ رفیع کے اعتبار سے کوتاہی سمجھی جائیں بالکلیہ معاف ہیں) یہ بات اللہ تعالیٰ نے اور کسی بندہ کے لئے نہیں فرمائی الخ

(۲) حضرت علامہ محدث کبیر مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ نے ایک حدیث کی شرح میں فرمایا کہ:

حدیث میں ذنب کا ذکر ہے جو سب سے کم درجہ ہے جس کے معنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات معظم اور شان رفیع کے لحاظ سے غیر مناسب امر ہے اس کے اوپر معصیت کا درجہ ہے جو عدول حکمی یا نافرمانی ہے اور صغائر و کبائر کی تقسیم بھی اسی میں جاری ہوتا ہے، ذنب و خطا میں نہیں (انوار الباری اردو شرح صحیح بخاری جلد اول ص ۱۶۹)

۳۔ تفسیر خازن میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: فیکون المعنی ماوقع لک من ذنب وما لم یقع فهو مغفور لک و قیل المراد منه ما کان من سهو و غفلة و تاول لان النبی صلی الله علیه وسلم لم یکن له ذنب کذنوب غیره فالمراد بذکر الذنب هنا ماعسی ان یکون وقع من هذا القبیل و غیره فهو مغفور له فاعلمه الله عز وجل بذلک و انه مغفور له (پس مطلب یہ ہوگا کہ آپ سے جو ذنب صادر

ہو چکا ہے یا جو ابھی تک صادر نہیں ہوا وہ سب آپ کے لئے بخش دیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ فعل ہے جو سہو، غفلت اور تاویل کی بنا پر صادر ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ کا کوئی ذنب دوسروں کے ذنوب (گناہوں) کی طرح نہیں تھا۔ پس یہاں ذنب کے ذکر کرنے کی مراد یہ ہے کہ اگر اس قسم کا کوئی ذنب وغیرہ (جو حضور کی شان رفیع کی نسبت سے ذنب (لغزش) ہے) آئندہ صادر بھی ہو تو وہ پہلے ہی بخش دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے حضور کو (پہلے ہی) بتلا دیا کہ آپ کے لئے ہر طرح سے بخشش ہوگئی ہے۔

۴- امام رازی متعدد معانی بیان کرتے ہوئے تیسرا مفہوم آیت واستغفر لذنبک (سورۃ محمد) کا یہ لکھتے ہیں (وثالثها) وجه حسن مستنبط وهو ان المراد توفيق العمل الحسن و اجتناب العمل السيئ و وجهه ان الاستغفار طلب الغفران و الغفران هو الستر على القبيح ومن عصم فقد ستر عليه قبائح الهوى و بمعنى طلب الغفران ان لا تفضحنا و ذلك قد يكون بالعصمة منه فلا يقع فيه كما كان للنبي صلى الله عليه وسلم وقد يكون بالستر عليه بعد الوجود كما هو في المؤمنين والمؤمنات وفي هذه الآية لطيفة وهي ان النبي صلى الله عليه وسلم له احوال ثلاثة حال مع الله تعالى وحال مع نفسه و حال مع غيره فاما مع الله فوحده واما مع نفسك فاستغفر لذنبك واطلب العصمة من الله واما مع المؤمنين فاستغفرلهم واطلب الغفران لهم من الله. (تفسیر کبیر سورۃ محمد) اور آیت کا تیسرا معنی جو بہت عمدہ طریق سے اس سے مستنبط ہوتا ہے یہ ہے کہ مراد اس استغفار سے اچھے عمل کی توفیق اور برے عمل سے اجتناب ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ استغفار کا معنی غفران طلب کرنا اور غفران کا معنی ہے برائی کی

پردہ پوشی اور جس کو گناہوں سے بچالیا گیا اس کی نفسانی خواہشات کی برائیوں پر پردہ ڈال دیا گیا اور غفران طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں رسوا نہ کر اور یہ کبھی تو عصمت کی وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ معصوم اس گناہ میں ملوث ہی نہیں ہوتا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھا اور کبھی گناہ ہو جانے کے بعد اس پر پردہ ڈالنے سے ہوتا ہے جیسا کہ وہ مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کے حق میں ہے اور اس آیت میں ایک لطیفہ ہے اور وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین حال ہیں ایک حال اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ ایک حال اپنی ذات کے ساتھ ہے اور ایک حال دوسرے لوگوں کے ساتھ ہے۔ اور جو حال اللہ کیساتھ ہے تو استغفار کا مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی توحید پر قائم رہیں اور جو آپ کے ساتھ ہے تو اپنے ذنب کے لئے استغفار کریں اور جو مؤمنین اور مؤمنات کے ساتھ آپ کا حال ہے تو اس میں آپ ان کے لئے اللہ سے بخشش طلب کرتے رہیں۔

(ب) سورہ الفتح کی آیت لیغفر لک الله ما تقدم من ذنبک وما تاخر کے متعدد معانی میں سے امام رازیؒ ایک معنی وہی طلب عصمت کا لکھتے ہیں۔ یعنی اے اللہ تو مجھ کو عصمت پر قائم رکھ اور چوتھے معنی میں یہ لکھتے ہیں کہ ما تقدم سے مراد قبل نبوت ہے اور ما تاخر سے مراد مابعد النبوت تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قبل نبوت کی لغزش معاف فرمادی ہیں اور نبوت کے بعد کی لغزشوں سے اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے گا۔ (تفسیر کبیر سورۃ الفتح)

سوال نمبر ۵، آیت تحریم:

يا ايها النبي لم تحرم ما احل الله لک تبتغي مرضات ازواجک والله غفور رحيم. قد فرض الله لكم تحلة ايمانكم والله مولكم وهو العليم الحكيم. و اذ اسر النبي الى بعض ازواجه حديثا

فلما نبأت به و اظهره الله عليه عرف بعضه و اعرض عن بعض فلما نبأها به قالت من انبأک هذا قال نبانی العليم الخبير. ان تتوبا الی الله فقد صغت قلوبكما و ان تظهرا عليه فان الله هو موله و جبريل و صالح المؤمنين والملئكة بعد ذلک ظهير. (سورۃ التحریم ع ۱)

ترجمہ (ا): ''اے نبی تو کیوں حرام کرے جو حلال کیا اللہ نے تجھ پر۔ چاہتا ہے تو رضامندی اپنی عورتوں کی اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان۔ ٹھہرا دیا اللہ نے تم کو کھول ڈالنا اپنی قسموں کا اور اللہ صاحب ہے تمہارا اور وہی ہے سب جانتا حکمت والا اور جب چھپا کر کہی نبی نے اپنی کسی عورت سے ایک بات پھر جب اس نے خبر کر دی اس کی اور اللہ نے جتا دیا نبی کو یہ جتائی، نبی نے اس میں سے کچھ اور ٹلا دی کچھ پھر جب وہ جتایا عورت کو بولی تجھ کو کس نے بتایا۔ کہا مجھ کو بتایا اس خبر والے واقف نے۔ اگر تم توبہ کرلیتی ہو تو جھک پڑے ہیں تمہارے دل اگر تم دونوں چڑھائی کرو گے اس پر تو اللہ ہے اس کا رفیق اور جبرئیل اور نیک ایمان والے اور فرشتے اس کے پیچھے مددگار ہیں'' (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) اے نبی جس چیز کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے آپ (قسم کھا کر) اس کو (اپنے اوپر) کیوں حرام فرماتے ہیں (پھر وہی) اپنی بیبیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ بخشش والا مہربان ہے، اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کھولنا (یعنی قسم توڑنے کے بعد اس کے کفارہ کا طریقہ) مقرر فرمادیا ہے اور اللہ تمہارا کارساز ہے اور وہ بڑا جاننے والا بڑی حکمت والا ہے اور جبکہ پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے (بذریعہ وحی) اس کی خبر کردی تو پیغمبر نے (اس ظاہر کردینے والی بی بی کو) تھوڑی سی بات تو جتلادی اور تھوڑی سی بات کو ٹال گئے۔ سو جب پیغمبر نے اس بی بی کو وہ بات جتلائی وہ کہنے لگی کہ آپ کو اس کی کس نے خبر کردی۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو بڑے

جاننے والے خبر رکھنے والے (یعنی خدا) نے خبر کردی۔ اے (پیغمبر کی) دونوں بیبیو! اگر تم اللہ کے سامنے توبہ کرلو تو تمہارے دل مائل ہو رہے ہیں اور اگر (اسی طرح) پیغمبر کے مقابلہ میں تم دونوں کاروائیاں کرتی رہیں تو یاد رکھو پیغمبر کا رفیق اللہ ہے اور جبرئیل ہے اور نیک مسلمان ہیں اور ان کے علاوہ فرشتے (آپ کے) مددگار ہیں۔ (مولانا تھانویؒ)

اس آیت کے تحت اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جب قرآن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دے دیا تھا اور وہ بھی اپنی بیبیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے۔ اور حلال کو حرام قرار دینا تو بہت بڑا گناہ ہے۔ بلکہ اس سے کفر کا اندیشہ ہے العیاذ باللہ تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معنی میں معصوم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ آپ سے نہ کبیرہ گناہ کبھی سرزد ہوتا ہے اور نہ صغیرہ۔

الجواب: اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیز کو اعتقاداً حرام قرار دینا نہ صرف بڑا گناہ ہے بلکہ کفر ہے اور عصمت انبیاء کے اثبات کے لئے جو آیات پہلے پیش کی گئی ہیں ان کی روشنی میں کوئی مسلمان یہ گمان نہیں کرسکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امام المعصومین ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دیں۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ تحریم حقیقتاً نہیں بلکہ صورتاً ہے۔ جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند ترین مقام کے پیش نظر ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

۲۔ ان آیات کے شان نزول سے تحریم حلال کی حقیقت معلوم ہوسکتی ہے چنانچہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''آپ کی عادت تھی کہ عصر کے بعد سب ازواج کے ہاں تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے جاتے، ایک روز حضرت زینبؓ کے ہاں کچھ دیر لگی معلوم ہوا کہ انہوں نے شہد پیش کیا تھا، اس کے نوش فرمانے میں وقفہ ہوا پھر کئی روز یہ معمول رہا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے مل کر تدبیر کی کہ آپ وہاں شہد پینا چھوڑ دیں، آپ نے چھوڑ دیا اور

حفصہؓ سے فرمایا کہ میں نے زینبؓ کے ہاں شہد پیا تھا مگر اب قسم کھاتا ہوں کہ پھر نہیں پیوں گا۔ نیز یہ خیال فرما کر زینبؓ کو اس کی اطلاع ہوگی تو خواہ مخواہ دلگیر ہوں گی حفصہؓ کو منع کردیا کہ اس کی اطلاع کسی کو نہ کرنا۔ اسی طرح ایک قصہ ماریہ قبطیہؓ کے متعلق (جو آپ کے حرم سے تھیں جن کے بطن سے صاحبزادے ابراہیم تولد ہوئے) پیش آیا۔ اس میں آپ نے ازواج کی خاطر قسم کھالی کہ ماریہ کے پاس نہ جاؤں گا۔ یہ بات آپ نے حضرت حفصہؓ کے سامنے کہی تھی اور تاکید کردی تھی کہ دوسروں کے سامنے اظہار نہ ہو۔ حضرت حفصہؓ نے ان واقعات کی اطلاع چپکے سے حضرت عائشہؓ کو کردی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اور کسی سے نہ کہنا حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مطلع فرمادیا، آپ نے حفصہؓ کو جتلایا کہ تم نے فلاں بات کی اطلاع عائشہؓ کو کردی حالانکہ منع کیا تھا، وہ متعجب ہوکر کہنے لگیں کہ آپ سے کس نے کہا، شاید عائشہؓ کی طرف خیال گیا ہوگا، حضورؐ نے فرمایا "نبأني العليم الخبير" یعنی حق تعالیٰ نے مجھے خبردی۔ ان ہی واقعات کے سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ حلال کو اپنے اوپر حرام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز کو عقیدۃً حلال ومباح سمجھتے ہوئے عہد کرلیا تھا کہ آئندہ اس کو استعمال نہ کروں گا، ایسا کرنا اگر کسی مصلحت صحیحہ کی بنا پر ہو تو شرعاً جائز ہے۔ مگر حضورؐ کی شان رفیع کے مناسب نہ تھا کہ بعض ازواج کی خوشنودی کے لئے اس طرح کا اسوہ قائم کریں جو آئندہ امت کے حق میں تنگی کا موجب ہو اس لئے حق تعالیٰ نے متنبہ فرمادیا کہ ازواج کے ساتھ بے شک خوش اخلاقی برتنے کی ضرورت ہے مگر اس حد تک ضرورت نہیں کہ ان کی وجہ سے ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کرکے تکلیف اٹھائیں۔"

علامہ عثمانیؒ کی اس تقریر سے سارے شبہات دور ہوجاتے ہیں اور حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور شرعی مسئلہ کے شہد کو حرام نہیں فرمایا تھا بلکہ آپ نے اپنے لئے قسم کھائی کہ آئندہ میں شہد نہیں پیوں گا اور روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغافیر کی وجہ سے شہد نہ استعمال

کرنے کی قسم کھائی تھی چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ لکھتے ہیں: "صحیح بخاری وغیرہ میں اس طرح منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شریف تھا کہ بعد عصر کھڑے کھڑے بیبیوں کے پاس تشریف لاتے۔ ایک بار حضرت زینبؓ کے پاس معمول سے زیادہ ٹھہرے اور شہد پیا تو مجھ کو رشک آیا۔ میں نے حفصہؓ سے مشورہ کیا کہ ہم میں سے جن کے پاس تشریف لاویں تو وہ یوں کہے کہ آپ نے مغافیر نوش فرمایا ہے یہ ایک گوند ہے جو کریہۃ الرائحہ ہے (یعنی جس کی بو اچھی نہیں ہوتی) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے شہد پیا ہے، ان بی بی نے کہا کہ شاید کوئی مکھی اس کے درخت پر بیٹھ گئی ہوگی اور اس کا عرق چوس لیا ہوگا، آپ نے بقسم فرمایا کہ میں پھر شہد نہ پیوں گا الخ"۔ (تفسیر بیان القرآن)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل ترک اولی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو تحریم حلال سے تعبیر فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں قرآن مجید میں جو الفاظ معصیت، ظلم، ذنب، ضلال وغیرہ استعمال ہوئے ہیں ان کی بھی حقیقت مراد نہیں بلکہ صورت مراد ہے، وہ نہ صغیرہ گناہ نہ کبیرہ بلکہ انبیائے کرام کی عظمت شان کے پیش نظر وہ ایک زلت اور ترک اولی ہے اور اسی لئے محققین فرماتے ہیں حسنات الابرار سیئات المقربین (ابرار کی نیکیاں مقربین کے حق میں برائیاں متصور ہوتی ہیں) اب اگر کوئی شخص مذکورہ الفاظ لم تحرم ما احل الله لک وغیرہ کو عصمت انبیاء کے خلاف استدلال میں پیش کرے تو وہ جاہل ہے یا متعصب۔

امہات المؤمنین کا شرعی مقام:

آیات زیر بحث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جن ازواج مطہرات کا تذکرہ ہے۔ روافض انہی آیات کا سہارا لے کر حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کی بدگوئی کرتے ہیں اور ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمن قرار دے کر منافق اور بے ایمان مانتے ہیں چنانچہ ایک شیعہ مجتہد مولوی محمد حسین ڈھکو نے اپنی کتاب "تجلیات

صداقت'' ص ۴۷۸ پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

''باقی رہا مؤلف کا یہ کہنا کہ عائشہ مؤمنوں کی ماں ہیں۔ ہم نے ان کے ماں ہونے کا انکار کب کیا ہے مگر اس سے ان کا مؤمنہ ہونا تو ثابت نہیں ہوتا۔ ماں ہونا اور ہے اور مؤمنہ ہونا اور۔''

یہاں روافض کو تو ہمارا مختصر جواب یہ ہے کہ اگر ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما۔ الآیہ کے الفاظ سے ان کو العیاذ باللہ غیر مؤمن۔ منافق اور دشمن رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) قرار دیا جائے تو پھر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا عقیدہ ہوگا جبکہ آپ نے اس قسم کی ازواج کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ ایک نعمت (شہد) کو حرام قرار دے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کے پیش نظر اس بات پر گرفت کی گئی۔ اسی طرح حضور کی ازواج مطہرات اور مؤمنین کی امہات ہونے کی بنا پر ان کی بلند شان کے تحت مذکورہ الفاظ میں تنبیہ کی گئی ورنہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ نے جو بھی تدبیر کی۔ اس کا منشا محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی تھا نہ کہ بغض وعناد چنانچہ علامہ عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ ازواج مطہرات کو جو محبت اور تعلق حضور سے تھا اس نے قدرتی طور پر آپس میں ایک طرح کی کش مکش پیدا کردی تھی۔ ہر ایک زوجہ کی تمنا اور کوشش تھی کہ وہ زائد از زائد حضور کی توجہات کا مرکز بن کر دارین کی برکات وفیوض سے متمتع ہو۔ مرد کے لئے یہ موقع تحمل اور تدبیر اور خوش اخلاقی کے امتحان کا نازک ترین موقع ہوتا ہے مگر اس نازک موقع پر بھی حضور ﷺ کی ثابت قدمی ویسی ہی غیر متزلزل ثابت ہوئی جس کی توقع سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت سے ہوسکتی تھی۔''

مودودی تفسیر:

ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مذکورہ آیات کے تحت لکھتے ہیں:

''اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے تحریم کا یہ فعل خود اپنی کسی خواہش

کی بنا پر نہیں کیا تھا بلکہ آپ کی بیویوں نے یہ چاہا تھا کہ آپ ایسا کریں اور آپ نے محض ان کو خوش کرنے کے لئے ایک حلال چیز اپنے لئے حرام کرلی تھی۔''

(تفسیر تفہیم القرآن جلد ششم سورۃ التحریم ص ۱۵ ناشر ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور)

یہ بھی مودودی کی کج فہمی ہے کہ حضور ﷺ نے صرف اپنی بیویوں کی خواہش کے تحت شہد نہ استعمال کرنے کی قسم کھالی تھی کیونکہ حضور نے اس احتمال سے کہ شہد میں مغافیر کے پھولوں کی بھی رس ہوتی ہے اپنی طبعی انتہائی نفاست پسندی کی وجہ سے قسم کھائی تھی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ یہ تدبیر ان ازواج مطہرات کی ہی بنائی ہوئی تھی۔ چنانچہ خود مودودی صاحب نے یہ تسلیم بھی کیا کہ:

مغافیر ایک قسم کا پھول ہوتا ہے جس میں کچھ بساند ہوتی ہے اور اگر شہد کی مکھی اس سے شہد حاصل کرے تو اس کے اندر بھی بساند کا اثر آ جاتا ہے، یہ بات سب کو معلوم تھی کہ حضور ﷺ نہایت نفاست پسند ہیں اور آپ کو اس سے سخت نفرت ہے کہ آپ کے اندر کسی قسم کی بدبو پائی جائے اس لئے آپ کو حضرت زینب کے ہاں ٹھہرنے سے روکنے کی خاطر یہ تدبیر کی گئی اور یہ کارگر ہوئی الخ (ص ۱۷)

مودودی صاحب کے اپنے الفاظ کہ:

''اور یہ (یعنی تدبیر) کارگر ہوئی'' یہی بات ثابت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغافیر کے پھولوں کی رس کا اثر ہونے کی وجہ سے شہد نہ کھانے کی قسم کھائی تھی نہ کہ صرف اس لئے کہ چونکہ ازواج مطہرات یہ چاہتی تھیں اس لئے آپ نے شہد چھوڑ دیا۔ باقی رہا یہ کہ پھر اللہ تعالیٰ نے تبتغی مرضات ازواجک کیوں فرمایا تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ اس میں ازواج مطہرات کی تدبیر کا دخل تھا اس لئے ان الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ اگر نسیان کی وجہ سے جنت کا پھل کھانے پر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے لئے عصی آدم ربہ فغوی کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں تو اس واقعہ کے پیش نظر اگر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تبتغی

مرضات ازواجک اورازواج مطہرات کے لئے فقد صغت قلوبکما الخ فرمادیا تو یہ از روئے صورت ہوگا۔ نہ از روئے حقیقت۔"

مودودی صاحب کی زبان درازی:

مودودی صاحب نے حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے بارے میں چند سال پہلے یہ بیان کیا تھا کہ: "نبی کریم کے مقابلہ میں کچھ زیادہ جری ہوگئی تھیں۔ اور حضور سے زبان درازی کرنے لگیں تھیں الخ (ہفت روزہ ایشیا لاہور مورخہ ۱۹ نومبر ۶۷ء) اس پر علماء نے گرفت کی کہ امہات المؤمنین کو زبان دراز کہنا گستاخی اور توہین ہے اور بندہ نے بھی "مودودی مذہب" میں مودودی صاحب کے مندرجہ الفاظ کے متعلق یہ لکھا تھا کہ:

"فرمایئے! اللہ تعالیٰ تو بحیثیت پروردگار ہونے کے سخت الفاظ میں تنبیہ کا حق رکھتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت نبی اور بحیثیت خاوند ہونے کے اپنی مقدس بیویوں پر گرفت کرسکتے ہیں۔ لیکن ابوالاعلیٰ صاحب کا کیا حق ہے کہ وہ محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیویوں اور تمام مؤمن امت کی ماؤں کے بارے میں جری ہونے اور زبان دراز ہونے کے الفاظ استعمال کریں۔ اگر مودودی صاحبان ایسے الفاظ کو ازواج مطہرات کے لئے توہین کا سبب نہیں سمجھتے تو ان کو سمجھانے کے لئے یہ بات پیش کرتا ہوں کہ مودودی صاحب کے والد مرحوم اگر اپنی زوجہ کو اس قسم کے الفاظ سے یاد کریں تو ان کے لئے تو مناسب ہوسکتا ہے لیکن اگر خدانخواستہ مودودی صاحب ہی یہ کہیں کہ میری والدہ ماجدہ میرے والد صاحب مرحوم کے سامنے زیادہ جری ہوجاتی تھیں اور زبان درازی کرلیا کرتی تھیں تو کیا اس کو بھی ان کے معتقدین برداشت کرلیں گے۔ اگر نہیں تو اپنی اور ساری امت کی ماؤں کے متعلق ان الفاظ میں ان کو کیوں توہین نظر نہیں آتی۔"

چاہئے تو یہ تھا کہ مودودی صاحب متنبہ ہوکر امہات المؤمنین کے بارے میں اس گستاخی اور زبان درازی سے توبہ کرلیتے لیکن بجائے اس کے انہوں نے تفہیم القرآن میں مذکورہ آیت کے تحت پھر انہی الفاظ کو دہرایا ہے اور اس پر بضد ہیں چنانچہ بخاری کے حوالے سے

لا تراجعی کے تحت لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی حفصہؓ سے فرمایا کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کبھی زبان درازی نہ کر۔"

اس کے بعد اپنے اس ترجمہ کی تصویب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس میں حضرت عمرؓ نے مراجعت کا لفظ جو استعمال کیا ہے اسے لغوی معنی میں نہیں لیا جاسکتا بلکہ سیاق وسباق خود بتارہا ہے کہ یہ لفظ دوبدو جواب دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور حضرت عمر کا اپنی بیٹی سے یہ کہنا کہ لا تراجعی رسول اللہ صاف طور پر اس معنی میں ہے کہ حضور ﷺ سے زبان درازی نہ کیا کر، اس ترجمے کو بعض لوگ غلط کہتے ہیں اور ان کا اعتراض یہ ہے کہ مراجعت کا ترجمہ پلٹ کر جواب دینا یا دوبدو جواب دینا تو صحیح ہے مگر اس کا ترجمہ "زبان درازی" صحیح نہیں ہے۔ لیکن معترض حضرات اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اگر کم مرتبت کا آدمی اپنے سے بڑے مرتبے کے آدمی کو پلٹ کر جواب دے دے یا دوبدو جواب دے تو اس کا نام زبان درازی ہے۔ مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی بات پر ڈانٹے یا اس کے کسی فعل پر ناراضی کا اظہار کرے اور بیٹا اس پر ادب سے خاموش رہنے یا معذرت کرنے کے بجائے پلٹ کر جواب دینے پر اتر آئے تو اس کو زبان درازی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا پھر جب یہ معاملہ باپ اور بیٹے کے درمیان نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور امت کے درمیان ہو تو صرف ایک غبی آدمی ہی کہہ سکتا ہے کہ اس کا نام زبان درازی نہیں ہے۔" (تفہیم القرآن ص ۲۵)

الجواب: مودودی صاحب کی یہ توجیہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے کیونکہ:

(۱) زبان درازی کرنا ایک اردو محاورہ ہے جس کا معنی بدزبانی کرنا اور گستاخی کرنا ہے چنانچہ (۱) فیروز اللغات مؤلفہ الحاج مولوی فیروز الدین صاحب مرحوم میں لکھا ہے:۔ زبان دراز۔ گالیاں دینے والا بدزبان (۲) گستاخ۔ منہ

پھٹ اور زبان دراز (۱) بدزبان (۲) گستاخ

(۲) نسیم اللغات مؤلفہ مولوی مرتضی فاضل لکھنوی شیعی وغیرہ میں ہے۔

زبان دراز: زیادہ گو۔ گستاخ۔ بے باک، دلیر، منہ پھٹ، بدلگام، زبان درازی، بیہودہ گوئی، گستاخی، بدلگامی فحش بیانی بدزبانی

(۳) اور امین اللغات مؤلفہ ایم اے بھٹی میں ہے زبان دراز۔ گستاخ۔ منہ پھٹ۔ بے ہودہ بکنے والا۔ زبان درازی: گستاخی، بے ہودہ گوئی۔

(۴) حدیث بخاری کے الفاظ یہ ہیں: فقالت لی عجبا لک یا ابن الخطاب ما ترید ان تراجع انت وان ابنتک لتراجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی یظل یومہ غضبان فقام عمرؓ فاخذ رداءہ مکانہ حتی دخل علی حفصۃ فقال لھا یا بنیۃ انک لتراجعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی یظل یومہ غضبان فقالت حفصۃ واللہ انا لنراجعہ الخ (صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۃ التحریم)

ترجمہ: حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ (ان کی بیوی نے) آپ سے کہا کہ اے ابن الخطاب مجھے تم پر تعجب ہے تم نہیں چاہتے کہ تمہاری باتوں کا جواب دیا جائے، حالانکہ تمہاری بیٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا جواب دیتی ہے یہاں تک کہ ایک دن تو حضورؐ دن بھر غصہ میں رہے۔ پس حضرت عمرؓ اپنی چادر اوڑھ کر کھڑے ہوئے اور حفصہؓ کے پاس آئے اور حفصہؓ سے فرمایا کہ اے بیٹی! کیا تم حضورؐ کی باتوں کا جواب دیتی ہو؟ یہاں تک کہ تم نے حضورؐ کو دن بھر غصہ میں رکھا۔ حفصہؓ نے کہا خدا کی قسم ہم آپ کی باتوں کا جواب دیتی ہیں الخ (بخاری مترجم اردو جلد دوم ناشران محمد سعید اینڈ سنز قرآن محل کراچی)

یہاں زیر بحث روایت کے الفاظ ہی سے مودودی ترجمہ کی تردید ہوجاتی ہے کیونکہ حضرت عمر فاروقؓ کو ان کی زوجہ محترمہ یہ جواب دیتی ہیں:۔ ما ترید

ان تراجع انت و ان ابنتک لتراجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم . اگر مراجعت کا ترجمہ بقول مودودی زبان درازی کرنا ہے اور اردو محاورہ میں زبان درازی کرنے کا معنی، گستاخی بدزبانی فحش کلامی اور بے ہودہ گوئی کے ہیں تو اس محاورہ کے تحت بخاری شریف کے الفاظ کا یہ ترجمہ ہوگا کہ حضرت عمر سے ان کی بیوی نے کہا کہ:۔ آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے ساتھ بدزبانی، بے ہودہ گوئی اور فحش کلامی کی جائے حالانکہ آپ کی بیٹی (یعنی حضرت حفصہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بے ہودہ گوئی اور فحش کلامی وغیرہ کرتی ہیں۔'' اور پھر حضرت حفصہ نے اپنے والد ماجد حضرت عمر فاروق کے جواب میں یہ کہا: واللہ انا لنراجعہ تو مودودی ترجمہ تو اس کا یہ ہوگا: ''اللہ کی قسم ہم حضور سے زبان درازی یعنی بدزبانی، بے ہودہ گوئی اور فحش کلامی کرتی ہیں'' اور پھر بخاری شریف کی اسی حدیث میں ہے کہ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ام سلمہؓ کے پاس یہی بات کہی تو آپ نے فرمایا:

فقالت ام سلمۃ عجبا لک یا ابن الخطاب دخلت فی کل شیئ حتی تبتغی ان تدخل بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ازواجہ فاخذتنی واللہ اخذا کسرتنی عن بعض ما کنت اجد فخرجت من عندھا. ترجمہ: تو انہوں نے (یعنی حضرت ام سلمہ نے) کہا کہ اے ابن خطاب تم ہر چیز میں دخل دیتے ہو۔ حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی بیویوں کے معاملہ میں بھی دخل دیتے ہو۔ چنانچہ انہوں نے بخدا اس سختی سے میری گرفت کی کہ میرا غصہ جاتا رہا، پھر میں ان کے ہاں سے باہر نکلا۔'' (بخاری مترجم اردو)

مودودی صاحب نے ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے جواب کا یہ ترجمہ کیا ہے انہوں نے کہا:

''ابن خطاب تم بھی عجیب آدمی ہو۔ ہر معاملہ میں تم نے دخل دیا یہاں

تک کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی بیویوں کے معاملہ میں بھی دخل دینے چلے ہو۔ ان کی اس بات نے میری ہمت توڑ دی۔"

یہاں روایت کے ان الفاظ فاخذتنی الخ کے مودودی ترجمہ میں بھی سقم ہے۔ بہر حال اس روایت کے آخر میں یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ سارا قصہ بیان کردیا: قال عمرؓ فقصصت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم هذا الحديث فلما بلغت حديث ام سلمةؓ تبسم رسول اللہ ﷺ الخ. (ترجمہ) حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ اندر پہنچ کر میں نے آپ سے یہ قصہ بیان کیا جب ام سلمہؓ کی بات بتائی تو آپ مسکرائے۔ (بخاری مترجم)

اب ناظرین انصاف فرمائیں کہ بقول مودودی صاحب روایت میں مراجعت کا معنی زبان درازی یعنی بدزبانی اور فحش کلامی اور بدگوئی وغیرہ ہوتا تو حضرت عمرؓ کی شکایت پر حضرت ام سلمہؓ حضرت عمر فاروقؓ کی تائید کرتیں اور حضرت حفصہؓ پر رنجیدہ ہوتیں لیکن اس کے برعکس آپ نے یہ فرمایا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی بیویوں کے معاملہ میں کیوں دخل دیتے ہیں اور پھر جب حضرت عمرؓ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کیا تو حضرت ام سلمہؓ کے جواب پر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا۔ کیا کوئی صاحب عقل و دیانت مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات سن کر مسکرائے کہ حضرت حفصہؓ نے حضور کے ساتھ زبان درازی یعنی بدزبانی اور فحش کلامی کی تھی۔

مودودی صاحب کی فنکاری:

زیر بحث روایت میں مراجعت کا ترجمہ مودودی صاحب نے تین جگہ مختلف کیا ہے:

(۱) "مجھے یہ بہت ناگوار ہوا کہ وہ مجھے پلٹ کر جواب دے۔"

(۲) "خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں حضور کو دوبدو جواب دیتی ہیں۔"

(۳) (حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی حفصہؓ سے فرمایا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے کبھی زبان درازی نہ کر۔" پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں: اور حضرت عمرؓ کا اپنی بیٹی سے یہ کہنا کہ لا تراجعي رسول الله صلى الله عليه وسلم صاف طور پر اس معنی میں ہیں کہ: ۔ حضور سے زبان درازی نہ کر"

(ایضا تفہیم القرآن ص ۲۴)

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ ہمارا اعتراض زبان درازی کے اردو محاورے کی وجہ سے ہے یعنی بدزبانی اور فحش کلامی کرنا۔ اگر روایت کے الفاظ کا بھی یہ مطلب ہے تو پھر کوئی دشمن اسلام اگر یہ اعتراض کرے کہ کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کی بدزبانی اور فحش کلامی کے واقعات سن کر تبسم فرمایا کرتے تھے اور کیا یہ بھی حضور کے خلق عظیم میں شامل ہے تو مودودی صاحب اس کا کیا جواب دیں گے۔ مودودی صاحب کی فنکاری اس سلسلے میں یہ ہے کہ مودودی صاحب نے مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی کے حوالہ سے حضرت عبداللہؓ بن عباس کی اس مفصل روایت کے اکثر حصے کا ترجمہ لکھدیا ہے۔ لیکن روایت کے آخری ان الفاظ کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے جس میں حضرت ام سلمہؓ کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا۔ چنانچہ مودودی صاحب خود لکھتے ہیں کہ: ۔ اس کے آگے کا قصہ ہم نے چھوڑ دیا ہے جس میں حضرت عمرؓ نے بتایا ہے کہ دوسرے روز صبح حضور کی خدمت میں جا کر انہوں نے کس طرح حضور کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی الخ (تفہیم القرآن ص ۲۴) حالانکہ حضرت ام سلمہؓ کے جواب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پر تبسم فرمانے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کا اپنی صاحبزادیؓ سے لا تراجعي رسول الله صلى الله عليه وسلم کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضور ﷺ سے زبان درازی یعنی بدزبانی اور فحش کلامی نہ کیا کر۔ ورنہ ایسی بات سے پیغمبرانہ تبسم کا کیا ربط ہوسکتا ہے تو اگر مودودی صاحب یہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ حضرت ام سلمہؓ کے جواب اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تبسم سے ان کے وضع کردہ معنی (زبان درازی) کی تردید ہو جاتی ہے تو اس سے ان کے مبلغ علم و فہم کی قلعی کھل جاتی ہے اور اگر مودودی صاحب

نے اس نتیجہ کو سمجھ کر دانستہ حضور ﷺ کے تبسم کے حصہ کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے تو یہ ان کی فن کاری اور علمی وشرعی خیانت کی دلیل ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ جب روایت کے الفاظ میں مراجعت کا معنی بدزبانی اور فحش کلامی وغیرہ بن ہی نہیں سکتا تو آپ نے قرآنی آیات کی تفسیر میں تمام مؤمنین اور مؤمنات کی روحانی اور ایمانی ماؤں حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کو زبان درازی، بدزبانی اور فحش کلامی کرنے والیاں ثابت کرنے کی یہ کوشش کیوں کی ہے، کیا آپ ان ازواج مطہرات کو اپنی مؤمن مائیں تسلیم نہیں کرتے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کی یہ خصوصی شان بیان فرمادی ہے: النبی اولی بالمؤمنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم (پ۲۱ سورۃ احزاب ع۱)

ترجمہ(ا): نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے اور اس کی عورتیں ان کی مائیں ہیں۔" (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) نبی مؤمنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور آپ کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں۔" (مولانا تھانویؒ)

(۲) یہ وہ مقدس عورتیں ہیں جن کے بارے میں آیت تطہیر نازل ہوئی ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا۔

(پ۲۲۔الاحزاب ع۴)

ترجمہ(ا): اللہ یہی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں اے گھر والو اور ستھرا کرے تم کو ستھرائی سے۔ (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) اللہ تعالیٰ کو منظور ہے کہ اے گھر والو، تم سے آلودگی کو دور رکھے اور تم کو (ہر طرح ظاہراً وباطناً) پاک وصاف رکھے۔" (مولانا تھانویؒ)

لیکن باوجود اس کے کہ قرآن حکیم میں حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کی یہ خصوصی صفات بیان فرمائی گئی ہیں، مودودی صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"پھر جب یہ معاملہ باپ اور بیٹے کے درمیان نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور امت کے کسی فرد کے درمیان ہو تو صرف ایک غبی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا نام زبان درازی نہیں ہے۔" (تفہیم القرآن ص ۲۵)

یہ صحیح ہے کہ یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ اور امت کے افراد کے درمیان ہے لیکن حضور کی پاک بیویاں امت کے عام افراد میں تو شامل نہیں بلکہ حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو ازدواجی خصوصی شرف حاصل ہے اور میاں بیوی کے باہمی تعلقات کی نوعیت کو ہر باانصاف آدمی جانتا ہے۔ بحیثیت زوجہ ہونے کے وہ حضور ﷺ سے ایسی باتیں بھی کرلیتی تھیں جو بدزبانی اور فحش کلامی میں داخل نہیں اور ایک گونہ جواز کا پہلو رکھتی ہیں اور اسی خصوصی ازدواجی تعلقات کی بنا پر حضرت ام سلمہؓ نے حضرت عمرؓ فاروق سے فرمایا کہ:

آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی بیویوں کے معاملات میں دخل نہ دیں

لیکن باوجود اس کے اس بنا پر ازواج مطہرات کو تنبیہ کی گئی کہ ان کی عظمت شان کے پیش نظر اتنی بات بھی غیر مناسب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات کا جواب دیں۔ حسنات الابرار سیئات المقربین اور باوجود خود معصوم ہونے کے انبیاء کرام پر بھی ان کی عظمت شان کے پیش نظر جب مؤاخذہ ہوجاتا ہے تو ازواج مطہرات تو معصوم بھی نہیں ہیں۔ لیکن ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات کے مابین مخصوص ازدواجی معاملات کے متعلق بعض باتوں کو جو حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کی زبان درازی یعنی بدزبانی، بے ہودہ گوئی اور فحش کلامی سے تعبیر کیا ہے۔ یقیناً سوء ادب، علمی خیانت اور تلبیس وتخریب کی مذموم کاوش ہے ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر   گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
از خدا جوئیم توفیق ادب   بے ادب محروم گشت از فضل رب

ازواج مطہرات کے بارے میں علامہ سلیمان ندویؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

اس قسم کے واقعات جو احادیث میں مذکور ہیں لوگ ان کو قابل تقلید سمجھتے

ہیں، وہ ان کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ ایک امتی کا اپنے پیغمبر کے ساتھ یہ خطاب ہے اور اس کو بھول جاتے ہیں کہ ایک بیوی اپنے شوہر سے باتیں کررہی ہے۔ (سیرت عائشہ صدیقہؓ ص ۴۵)

سوال نمبر ۶:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا:

(ا) الحق من ربک فلا تکونن من الممترین (پ۲ سورۃ البقرہ ع ۱۷)

ترجمہ (ا): حق وہی جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک کرنے والا" (حضرت شاہ صاحب) (ب): (حالانکہ) یہ امر واقعی من جانب اللہ (ثابت ہوچکا) ہے سو ہرگز شک وشبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا (مولانا تھانوی) (ب) سورۃ یونس ع ۱۰ میں بھی ہے الحق من ربک فلا تکونن من الممترین نیز فرمایا لا تکونن من المشرکین (یونس ع ۱۱) ترجمہ (ا): اور مت ہو شریک کرنے والوں میں (حضرت شاہ صاحب) (ب) اور (مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ) کبھی مشرک مت بننا۔ (مولانا تھانویؒ)

ان آیات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شک اور شرک کا احتمال ہے ورنہ نہی کیوں فرمائی جاتی لہٰذا مطلقاً حضور علیہ ﷺ کا معصوم ہونا ثابت نہ ہوا۔

الجواب: (۱) مفسرین نے اس قسم کی آیات کے مختلف جواب دئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ خطاب بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن مراد امت ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: فلا تقل لهما اف و لا تنهر هما وقل لهما قولا کریما. (پ۱۵ سورۃ بنی اسرائیل ع ۳)

ترجمہ: (ا) نہ کہہ ان کو ہوں اور نہ جھڑک ان کو اور کہہ ان سے بات ادب کی۔ (حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) ان کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی مت کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا۔" (مولانا تھانویؒ)

اس آیت میں ماں باپ سے متعلق نصیحت فرمائی ہے حالانکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین قبل ازیں وفات پاچکے تھے اس لئے ان کے متعلق حضور ﷺ کو نصیحت کرنے کا احتمال ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت دوسری آیات محکمات سے ثابت ہوچکی ہے اور حضورؐ سے شک وریب اور شرک کے صدور کا احتمال ہی نہیں رہا تو ان آیات میں مخاطب دوسرے لوگ ہوں گے چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سورۃ یونس کی مندرجہ آیات کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

"بظاہر یہ خطاب پیغمبر علیہ السلام کو ہے لیکن حقیقت میں آپ کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے جو ایک امی کی زبان سے ایسے عظیم الشان حقائق وواقعات سن کر حیرت زدہ ہوجاتے تھے اور جہل وتعصب کی وجہ سے ان کی واقعیت میں شک وتردد کا اظہار کرنے لگتے تھے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ آپ خود اپنی لائی ہوئی چیزوں میں کیسے شک وشبہ کرسکتے تھے اور جس کی طرف تمام دنیا کو دعوت دیتے اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط یقین سننے والوں کے قلوب میں پیدا کردیتے تھے اس کو خود اپنی زبان سے کیسے جھٹلاتے۔ چند آیات کے بعد صاف فرمادیا۔ قل یایها الناس ان کنتم فی شک من دینی یہ آیت صاف بتلارہی ہے کہ شک کرنے والے دوسرے لوگ تھے جن کے مقابلہ میں آپ غیر متزلزل اور اٹل عقیدہ کا اعلان کررہے ہیں۔ الخ

۲۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے سورۃ بقرہ کی آیت فلا تکونن من الممترین کے تحت یہ سوال وجواب تحریر فرمایا ہے:۔

(سوال سوم) پیغمبر معصوم ہے محل شک نہیں ہے۔ نہی کرنا ان کو کیا معنی

(جواب) پیغمبر مطلق احکام کرنے اور نہ کرنے کا مکلف مثل اور بنی آدم کے

ہوتا ہے مخالف عصمت ذاتی کے نہیں۔" (تفسیر عزیزی مترجم اردو)

یہاں حضرت شاہ صاحبؒ نے خوب محققانہ جواب دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام بے شک معصوم ہوتے ہیں اور کسی کو کسی بات کا حکم دینا یا کسی بات سے روکنا اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ وہ معصیت (نافرمانی) کرسکتا ہے۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون اور ضابطہ ہے کہ امر اور نہی سے ہر ایک مکلّف کو (جس پر شریعت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے) خطاب کرتا ہے خواہ وہ پیغمبر معصوم ہوں یا دوسرے لوگ۔ اس ضابطہ کے تحت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن کریم میں امر و نہی سے خطاب فرمایا گیا ہے خواہ حضور ﷺ معصیت اور نافرمانی سے بالکل پاک اور معصوم ہیں۔

سوال نمبر ۷: جو آیات بظاہر عصمتِ انبیاء علیہم السلام کے خلاف نظر آتی ہیں ان کا ہم نے مختصر اور تحقیقی جواب عرض کردیا ہے جس کے بعد کسی اہل فہم و انصاف کے لئے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور عقیدہ عصمتِ انبیاء بالکل صاف اور بے غبار ہوجاتا ہے لیکن پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ جب قرآن مجید کی محکم آیات سے مسئلہ عصمتِ انبیاء ثابت ہے تو پھر اس کے خلاف علماء کے اس قسم کے اقوال علم کلام، عقائد کی کتابوں میں کیوں پائے جاتے ہیں جن میں یہ بھی ہے کہ انبیاء کرام کبیرہ گناہوں سے بھی معصوم نہیں ہیں جیسا کہ مفتی محمد یوسف صاحب علامہ آلوسیؒ کی تفسیر روح المعانی ج ۱۶ ص ۲۷۴ کی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

کہ "یہاں مواقف کے حوالے سے علامہ موصوف نے اکثر علماء کا مذہب یہ بیان کیا ہے کہ ان کے نزدیک کفر اور کذب کے ماسوا دوسرے کبائر انبیاء علیہم السلام سے سہواً وخطأً سرزد ہوسکتے ہیں۔ اگرچہ میر سید سند کے حوالے سے مذہبِ مختار یعنی قابل ترجیح یہ قرار دیدیا ہے کہ اس طرح کا صدور بھی ان کے نزدیک جائز نہیں ہے۔" (علمی جائزہ ص ۴۹)

الجواب (۱) ہر قول شرعاً حجت نہیں ہوتا اور متعدد اقوال میں محققین کے نزدیک جو

قول راجح ہوتا ہے اس کو اختیار کرلیا جاتا ہے چنانچہ آپ نے خود روح المعانی کے حوالہ سے ایک یہ قول پیش کیا ہے کہ: "کفر اور کذب کے ماسوا دوسرے کبائر انبیاء علیہم السلام سے سہواً وخطأً سرزد ہوسکتے ہیں۔" پھر اس کے بعد دوسرا قول پیش کردیا ہے کہ: "اگرچہ میر سید سند کے حوالے سے مختار یعنی قابل ترجیح یہ قرار دیا ہے کہ اس طرح کا صدور بھی ان سے جائز نہیں ہے۔" لیکن اس تحقیقی قول کے باوجود آپ کے امام مودودی صاحب نے یہ لکھ دیا ہے کہ:۔ نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہوگیا تھا۔ کہ انہوں نے ایک انسان کو قتل کردیا۔"

(رسائل ومسائل ج ۱ ص ۳۱ مطبوعہ باردوم ۱۹۵۴ء و ترجمان القرآن مئی۔ جون جولائی تا اکتوبر ۱۹۴۴ء)

حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی کافر کو ظلم سے ہٹانے کے لئے صرف ایک مکا مارا تھا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی اور چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نیت قتل کی نہ تھی اور نہ ہی کوئی آلہ قتل استعمال کیا تھا اس لئے یہ لغزش تو ہے لیکن اس کو گناہ نہیں قرار دیا جاسکتا چہ جائیکہ ایک بہت بڑا گناہ۔ اور تعجب ہے کہ مودودی صاحب نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن سورۃ القصص میں یہ بھی تسلیم کرلیا ہے کہ آپ نے عمداً قتل نہیں کیا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"حضرت موسیٰ کی دعا کا مطلب یہ تھا کہ میرے اس گناہ کو (جسے تو جانتا ہے کہ میں نے عمداً نہیں کیا ہے) معاف بھی فرمادے اور اس کا پردہ ڈھانک دے تاکہ دشمنوں کو اس کا پتہ نہ چلے۔"

لیکن باوجود اس کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل کو بہت بڑے گناہ سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ لغزش اور بہت بڑے گناہ میں بڑا فرق ہے۔

۲۔ شرح عقائد نسفی میں لکھا ہے:۔ **و اما سهواً فجوزه الاكثرون** (اور انبیاء سے سہواً صدورِ کبائر کو اکثر نے جائز قرار دیا ہے) لیکن اس میں علامہ تفتازانی سے تسامح ہوا ہے۔ چنانچہ شرح العقائد کی شرح نبراس میں لکھتے ہیں:۔ **وفي شرح المواقف**

والمقاصد المختار خلافه وحكى القاضي عياض الاجماع على العصمة عن الكبائر بلا قيد عمداً او سهواً. اور شرح مواقف اور شرح مقاصد میں ہے کہ مختار (اور راجح) قول اس کے خلاف ہے اور قاضی عیاض[1] نے اس پر اجماع بیان کیا ہے کہ انبیاء کرام عمداً اور سہواً کبائر کے صدور سے ہر طرح معصوم ہوتے ہیں‘‘ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ شرح المقاصد علامہ تفتازانی[2] ہی کی تصنیف ہے جس میں خود انہوں نے شرح العقائد میں مندرجہ اپنے قول کی تردید کردی ہے۔

۳۔ جب دوسری قوموں کے اختلاط سے مسلمانوں میں فلسفہ کا رواج ہوا اور اسلامی عقائد پر مخالفین نے عقلاً اعتراضات وارد کئے تو حسب ضرورت متکلمینِ اسلام نے علم کلام و عقائد کی کتابوں میں عقلی مباحث بھی داخل کردئے اور اس طرح علمائے اسلام میں امکان و جواز کی بحثوں کا سلسلہ جاری ہوگیا اور جو اقوال اس قسم کے منقول ہیں کہ انبیائے کرام سے کبائر کا صدور جائز ہے تو اس سے مراد عقلی جواز و امکان ہوتا ہے نہ کہ شرعی اور اگر کسی نے اس سے شرعی جواز مراد لیا ہے تو اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ گو شرعاً یہ ممتنع نہیں ہے (یعنی ممکن ہے) لیکن عادۃً یہ ممتنع ہے۔ یعنی شرعی جواز کو شرعی وقوع لازم نہیں ہے۔

عقلاً ممکن اور عادۃً ناممکن:

(۱) تفسیر روح المعانی سورۃ طٰہٰ میں ہے: نعم لا اشكال فيه على ماقاله القاضي ابوبكر من انه لا يمتنع عقلاً و لا سمعاً ان يصدر من

---

(۱) قاضی عیاض مالکی بمقام سبتہ ۴۷۶ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ عربی الاصل ہیں۔ آپ سبتہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ پھر ۵۳۱ھ میں غرناطہ منتقل ہوگئے۔ پھر واپس سبتہ آئے اور آپ کی وفات مراکش میں بروز جمعہ جمادی الآخر ۵۴۴ھ میں ہوئی۔ آپ فقہ، تفسیر اور حدیث میں امام تھے قاضی عیاضؒ کی تصنیف الشفاء فی تعریف حقوق المصطفیٰ بہت مشہور و مقبول ہے۔

(۲) علم کلام کی مشہور کتاب عقائد نسفی کے مصنف علامہ ابوالبرکات نسفی متوفی ۷۱۰ھ ہیں اور عقائد نسفی کی شرح عقائد نسفی کے مصنف علامہ تفتازانی متوفی ۷۹۱ھ ہیں۔ شرح المقاصد اور تہذیب بھی آپ کی تصانیف میں سے ہیں۔

النبي عليه السلام قبل النبوة معصية مطلقا بل لا يمتنع عقلاً ارسال من اسلم بعد كفره وافقه على ذلك كما قال الآمدي في "ابكار الافكار" اكثر الاصحاب و كثيرون من المعتزلة"

’’البتہ اس میں قاضی ابوبکر (الباقلانی) کے اس قول کی بنا پر کوئی اشکال نہیں رہتا کہ یہ بات نہ عقلاً ممتنع (ناممکن) ہے اور نہ سمعاً (یعنی شرعاً) کہ کسی پیغمبر علیہ السلام سے نبوت سے قبل مطلقاً معصیت سرزد ہوجائے (خواہ صغیرہ یا کبیرہ) اور یہ بھی عقلاً ممتنع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو پیغمبر بنادے جو کفر کے بعد اسلام لایا ہے اور جیسا کہ علامہ آمدی نے کتاب ’’ابکار الافکار‘‘ میں کہا ہے کہ اس قول کی موافقت اکثر اپنے حضرات نے کی ہے اور بہت سے معتزلہ نے بھی‘‘

اس عبارت سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ بعض متکلمین نے عقلاً اور شرعاً یہ بھی مان لیا ہے کہ انبیاء کرام سے قبل از نبوت صغیرہ اور کبیرہ ہر قسم کے گناہوں کا صدور ممکن ہے حتیٰ کہ کفر کا صدور بھی ہوسکتا ہے العیاذ باللہ۔ لیکن یہ قول صرف امکان و جواز کی حد تک ہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حضرات انبیاء کرام سے کبیرہ گناہوں حتیٰ کہ کفر کا وقوع بھی مانتے ہیں کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ انبیاء کرام کفر سے بالکل معصوم ہوتے ہیں۔

۲۔ معجزہ انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت کے لئے قطعی دلیل ہوتا ہے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدھا بن جانا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ آپ اپنے دعوٰی رسالت میں سچے ہیں کیونکہ لکڑی کا سانپ بن جانا سوائے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نہیں ہوسکتا اور حضرت موسیٰ کا عصا باذن اللہ ہی سانپ بنا ہے اور اسی لئے انبیاء کرام سے جھوٹ کا سرزد ہونا محال ہے۔ کیونکہ حسی اور فعلی معجزہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی جابجا ہوتا ہے کہ یہ میرا بندہ میرا ہی سچا پیغمبر ہے اور اس کی سچائی کے ثبوت کے لئے ہی میں اس کے

ہاتھ پر اپنی خاص قدرت ظاہر کررہا ہوں اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ انبیاء کرام سے جھوٹ سرزد نہیں ہوتا لیکن از روئے عقل ممکن ہے اور جھوٹے نبی سے معجزہ بھی ظاہر نہیں ہوسکتا۔ لیکن باوجود اس کے متکلمین کا یہ قول بھی ہے کہ گو جھوٹے نبی سے معجزے کا صدور عادتاً ممتنع ہے لیکن عقلاً ممکن ہے، چنانچہ شرح عقائد نسفی میں لکھتے ہیں:

یحصل للجماعة علم ضروری عادی یصدقه فی مقالته و ان کان الکذب ممکناً فی نفسه فان الامکان الزاتی بمعنی التجویز العقلی لاینا فی حصول العلم القطعی کعلمنا بان جبل احد لم ینقلب ذهبا مع امکانه فی نفسه“

”اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کا معجزہ دیکھ کر لوگوں کو عادتاً یہ ضروری اور یقینی علم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی بات میں سچے ہیں اگرچہ فی نفسہ یہ ممکن ہے کہ پیغمبر نے جھوٹ بولا ہو۔ اور یہ اس لئے ہے کہ کسی بات کا بالذات ممکن ہونا (یعنی جس کو عقل جائز قرار دیتی ہے) اس قطعی علم کے حاصل ہونے کے منافی نہیں ہے (کہ وہ پیغمبر علیہ السلام سچے ہیں) مثلاً ہم یہ یقیناً جانتے ہیں کہ احد کا پہاڑ سونے میں تبدیل نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود یہ بات ممکن ہے کہ وہ سونے کا بن جائے۔

۳۔ شرح عقائد نسفی کی شرح نبراس مصنفہ حضرت مولانا عبدالعزیز فرہارویؒ میں ہے:

ان المعجزة انما تنافی وقوع الکذب لاجوازہ فان العلم الحاصل بها عادی والعلم العادی لاینافی امکان النقیض فان جزمنابان اسطوانة البیت لم ینقلب الآن یاقوتا لاینافی امکانه.

”بیشک معجزہ اس بات کے منافی ہے کہ کسی پیغمبر سے جھوٹ واقع ہو لیکن اس کے باوجود جھوٹ سرزد ہونے کا جواز ہے۔ کیونکہ معجزہ سے جو یقینی علم حاصل ہوتا ہے یہ عادی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ وہ معجزہ کے بعد لوگوں کے دِلوں میں صاحب معجزہ پیغمبر علیہ السلام کے سچا ہونے کا یقین پیدا کردیتے ہیں) اور یہ عادی علم اس بات کے منافی نہیں ہے کہ اس کی نقیض ممکن ہو (یعنی

یہ ہوسکتا ہے کہ پیغمبر سے جھوٹ صادر ہوجائے گو ایسا ہوتا نہیں) مثلاً ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ گھر کا ستون ابھی تک یاقوت میں تبدیل نہیں ہوا۔ لیکن اس سے اس کے امکان کی نفی نہیں ہوتی (یعنی فی نفسہ وہ یاقوت بن سکتا ہے گو ایسا کبھی بھی واقعہ نہ ہو۔)“

۴۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: معجزات فی حد ذاتها امور ممکنہ ہیں نہ ممتنعہ ذاتیہ عقلیہ“ یعنی جھوٹے نبی سے معجزات کا ظاہر ہونا بالذات (یعنی فی نفسہ ممتنع اور محال نہیں ہیں بلکہ عقلاً ممکن ہیں)

(ب) نیز فرماتے ہیں: ”مدعی نبوت میں احتمال صدور عقلاً ممتنع نہیں ہاں نفس صدور خوارق چونکہ خلاف عادت الٰہیہ ہے نہ ہوگا۔ جو امتیاز کے لئے کافی ہے۔ (امداد الفتاویٰ جلد ششم کتاب العقائد و الکلام) یعنی جھوٹے نبی سے عقلاً تو یہ ہوسکتا ہے کہ معجزہ ظاہر ہوجائے لیکن اللہ تعالیٰ کی عادت یہی ہے کہ اس سے معجزہ صادر نہیں ہوتا اور یہ بات سچے اور جھوٹے مدعی نبوت میں فرق کے لئے کافی ہے۔

۵۔ امام رازیؒ آیت ووجدک ضالا فهدی کے تحت فرماتے ہیں:

و اما الجمهور من العلماء فقد اتفقوا علی انه علیه السلام ما کفر بالله لحظة ثم قالت المعتزلة هذا غیر جائز عقلا لما فیه من التنفیر و عنداصحابنا هذا غیر ممتنع عقلاً لانه جائز فی العقول ان یکون الشخص کافرا فیرزقه الله الایمان و یکرمه بالنبوة الا ان الدلیل السمعی قام علی ان هذا الجائز لم یقع وهو قوله تعالی ماضل صاحبکم وما غوی (تفسیر کبیر) اور جمہور علماء کا متفقہ قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لحظہ بھی کفر سرزد نہیں ہوا پھر معتزلہ کہتے ہیں

کہ یہ عقلاً جائز نہیں ہے کیونکہ یہ بات لوگوں کے لئے باعث نفرت ہے (کہ کسی وقت پیغمبر علیہ السلام سے کفر صادر ہوجائے) اور ہمارے علماء کے نزدیک یہ عقلاً ممتنع نہیں ہے (یعنی از روئے عقل یہ بات ہوسکتی ہے) کیونکہ عقلیں اس بات کو جائز قرار دیتی ہیں کہ ایک شخص پہلے کافر ہو پھر اس کو اللہ تعالیٰ ایمان نصیب کرے اور اس کو نبوت عطا کردے۔ البتہ سمعی[1] یعنی شرعی اور نقلی دلیل اس پر قائم ہے کہ یہ امر جو عقلاً جائز ہے کبھی واقع نہیں ہوا (یعنی کسی پیغمبر سے کبھی کفر سرزد نہیں ہوا) اور اللہ تعالیٰ کا یہی ارشاد ہے کہ ما ضل صاحبکم وما غوی "یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بھول کر راہ سے ہٹے ہیں اور نہ جان بوجھ کر۔"

۶۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں: انہ یجوز علی اللہ سبحانہ، ان یکلف الخلق مالا یطیقونہ خلافاً للمعتزلۃ ولو لم یجز ذلک لاستحال سوال دفعہ فقد سألوا ذلک فقالوا ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنابہ

(احیاء العلوم جلد اول)

"یعنی اللہ تعالیٰ پر یہ جائز ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو ایسے کام کی تکلیف دے جس کی وہ طاقت نہ رکھتے ہوں اور معتزلہ اس کے خلاف ہیں (یعنی وہ اس کو جائز نہیں مانتے) اور اگر یہ بات جائز ہی نہ ہوتی تو اس کے دفع کرنے کے متعلق سوال کرنا ہی محال ہوتا حالانکہ قرآن مجید میں ہے کہ اس کے متعلق سوال کیا گیا اور مؤمنین نے یہ دعا کی کہ اے ہمارے رب جس کام کی ہم طاقت نہیں رکھتے وہ ہم سے نہ اٹھوا۔ اور اللہ تعالیٰ واقع میں طاقت سے زیادہ بندوں کو تکلیف دیتا بھی نہیں۔ چنانچہ فرمایا لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا (اللہ تعالیٰ کسی

---

(۱) سمعی دلیل وہ ہے جس کا تعلق سننے سے ہے یعنی جو قرآن وسنت سے منقول ہے چنانچہ شفاء قاضی عیاض کے حاشیہ میں ہے۔ السمعیات ای ما ھو مسموع من القرآن او السنۃ (جلد۲، صفحہ ۲۹۸)

انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا) تو اس سے ثابت ہوا کہ ایک بات عقلاً گو جائز ہوتی ہے لیکن شرعاً وہ ناجائز اور ممتنع ہوتی ہے حتیٰ کہ محققین اہل سنت کی مندرجہ بالا عبارات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ:

(۱) عقلاً یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نبی سے کفر سرزد ہوجائے۔

(۲) اور یہ بھی ممکن اور جائز ہے کہ کسی جھوٹے نبی سے معجزات ظاہر ہوجائیں لیکن یہ باتیں گو عقلاً ممکن ہیں۔ لیکن ان مثالوں سے ہر صاحب عقل وانصاف شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ علم کلام کی کتابوں میں اگر اس قسم کے اقوال موجود ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے کبیرہ گناہوں کا یا معصیت کا صدور ہوسکتا ہے تو یہ بات عقلاً تجویز کی گئی ہے جس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انبیاء علیہم السلام سے کبیرہ یا العیاذ باللہ کفر کا صدور واقع بھی ہوا ہے، اگر جواز وامکان اور عقلی اور سمعی دلائل کا علمی فرق ملحوظ رکھا جائے تو پھر عصمت انبیاء کے بارے میں علمائے اہل السنّت والجماعت کے مختلف اقوال میں تطبیق بہت آسان ہوجاتی ہے اور اختلاف تقریباً لفظی ہی باقی رہ جاتا ہے۔

بحث صغائر:

صغائر کے متعلق مفتی محمد یوسف صاحب نے یہ لکھا ہے:

"رہا عمداً صغائر کا صدور تو اس کے بارے میں اگرچہ اختلاف ضرور ہے مگر جمہور کہتے ہیں کہ ان سے عمداً بھی صغائر سرزد ہوسکتے ہیں بشرطیکہ وہ خسیس افعال نہ ہوں علامہ آلوسیؒ اس بارے میں اپنی تحقیق اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ:

الجواب: یہ بات صحیح نہیں ہے کہ جمہور، انبیاء کرام سے عمداً صدور صغائر کے قائل ہیں بلکہ محققین جمہور اہل سنت کا راجح ...... مسلک یہ ہے کہ انبیاء کرام عمداً صدور صغائر سے بھی مثل کبائر کے معصوم ہیں۔ چنانچہ (۱) مسامرہ میں ہے: (المختار) لجمھور اھل السنۃ (العصمۃ) ای وجوب

عصمتهم (عنهما) ای عن الکبائر مطلقًا وعن الصغائر (الا الصغائر غیر المنفرة) حال کون اتیان غیر المنفرة (خطأ) فی التاویل او (سهواً) مع التنبیه علیه. واما الصغائر المنفرة کسرقة لقمة او حبة و تسمی صغائر الخسة فهم معصومون عنها مطلقا."

"اور جمہور اہل سنت کے نزدیک مختار اور راجح قول یہ ہے کہ انبیاء کرام دونوں سے معصوم ہیں یعنی کبائر سے مطلقاً (خواہ عمداً ہو یا سہواً) اور صغائر سے عمداً۔ مگر وہ صغائر جو نفرت دلانے والے نہیں ہیں۔ تاویل میں خطا ہونے یا سہو ہو جانے کی وجہ سے صادر ہو سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ان پر بھی جلدی من جانب اللہ تنبیہ ہو جاتی ہے اور جو صغائر نفرت دلانے والے ہیں مثلاً ایک لقمہ یا دانے کا چرا لینا جن کو خسیس افعال کہا جاتا ہے ان سے عمداً اور سہواً دونوں طرح معصوم ہیں)

۲۔ تفسیر خازن جلد۴ میں آیت ووجدک ضالا فهدی کے تحت لکھا ہے:
قال الزمخشری ومن قال کان علی امر قومه اربعین سنة فان اراد انه علی خلوهم من العلوم السمعیة فنعم وان اراد انه کان علی دین قومه فمعاذ الله والانبیاء یجب ان یکونوا معصومین قبل النبوة و بعدها من الکبائر و الصغائر الشائنة فما بال الکفر و الجهل بالصانع. علامہ زمخشری نے کہا ہے کہ جس شخص نے یہ کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال تک اپنی قوم کے طریقہ پر تھے تو اگر اس کی مراد یہ ہے کہ آپ ان کی طرح ان شرعی علوم سے واقف نہ تھے (جن سے بعد از نزول وحی واقف ہوئے) تو یہ قابل تسلیم ہے اور اگر اس کی مراد یہ ہے کہ آپ اپنی قوم کے دین پر تھے تو معاذ اللہ (خدا کی پناہ) یہ بات غلط ہے کیونکہ یہ امر واجب ہے کہ انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد (دونوں حالتوں

میں) کبائر سے بھی معصوم ہوں اور ایسے صغائر سے بھی جو معیوب ہیں چہ جائیکہ وہ کفر یا خالق کائنات سے ناواقف ہونے کی حالت میں رہیں۔

۳۔ علامہ سید شریف شرح مواقف میں لکھتے ہیں:۔ المختار عندنا وهو ان الانبیاء فی زمان نبوتهم معصومون عن الکبائر مطلقا وعن الصغائر عمداً اور ہمارے نزدیک مختار مذہب یہ ہے کہ انبیاء زمانہ نبوت میں کبائر سے مطلقاً معصوم ہوتے ہیں۔ یعنی نہ عمداً ان سے کبائر سرزد ہوتے ہیں اور نہ سہواً اور عمداً صغائر سے بھی معصوم ہیں۔

۴۔ علامہ تفتازانی شرح المقاصد میں لکھتے ہیں: المذهب عندنا منع الکبائر بعد البعث مطلقاً و الصغائر عمداً (اور ہمارے نزدیک مذہب مختار یہ ہے کہ انبیاء بعثت کے بعد کبائر سے مطلقاً (عمداً اور سہواً) معصوم ہوتے ہیں اور صغائر سے عمداً۔ اس سے معلوم ہوا کہ علامہ تفتازانی نے شرح عقائد میں جو جمہور کا قول لکھا ہے وہ مرجوح ہے اور ان سے اس میں تسامح ہوا ہے:

۵۔ نبراس میں ہے: وقد تبع الشارح ههنا صاحب المواقف وفیه قصور لان منع الصغیرة عمداً مختار مذهب الا شاعرة کما فی شرح المواقف وهو مختار الشارح فی التهذیب و شرح المقاصد. "اور یہاں شارح یعنی علامہ تفتازانی نے صاحب مواقف (یعنی قاضی عضد) کی پیروی میں یہ لکھا ہے اور اس میں غلطی کی ہے کیونکہ انبیاء سے عمداً صغیرہ کا ممتنع اور محال ہونا اشاعرہ کا مختار مذہب ہے جیسا کہ شرح المواقف میں ہے اور یہی مذہب مختار قرار دیا ہے شارح یعنی علامہ تفتازانی نے اپنی کتاب التهذیب اور شرح المقاصد میں"

۶۔ علامہ سید شریف شرح مواقف میں لکھتے ہیں:۔ لنا علی ماهو المختار عندنا و هو ان الانبیاء فی زمان نبوتهم معصومون عن

الکبائر مطلقاً و عن الصغائر عمداً (اور ہمارے نزدیک مذہب مختار یہ ہے کہ انبیاء اپنے زمانہ نبوت میں کبائر سے مطلقاً (عمداً ہو یا سہواً) معصوم ہوتے ہیں اور صغائر سے عمداً)

۷۔ حضرت مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں: ثم انتفاء الکبائر و تعهد الصغائر متفق علیه بین اهل الحق (حاشیہ تفسیر بیان القرآن) (پھر کبائر کا مطلقاً اور صغائر کا عمداً منتفی ہونا اہل حق کے درمیان متفق علیہ ہے)

ہمارا سوال:

مفتی محمد یوسف صاحب سے یہاں ہمارا سوال یہ ہے کہ آپ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں مرجوح اقوال تو پیش کردئے ہیں لیکن محققین اہل سنت کے مندرجہ بالا راجح اور مختار اقوال نقل نہیں کئے جن سے عصمت انبیاء کا مسئلہ زیادہ صاف ہوجاتا ہے حالانکہ آپ ان اقوال سے واقف تھے۔ کیا آپ کے نزدیک مقام عصمت انبیاء علیہم السلام کے تحفظ سے اپنے مرشد مودودی کے مقامِ امامت کا تحفظ زیادہ ضروری اور محبوب ہے۔

ع بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

صغیرہ اور کبیرہ کی تعریف:

صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کی تعریف میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے جس کی بنا پر کوئی واضح جامع تعریف نہیں پیش کی جاسکتی حتی کہ علامہ آلوسی مصریؒ نے روح المعانی جلد ۵ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ: وانکر جماعة من الائمة ان فی الذنوب صغیرة وقالوا بل سائر المعاصی کبائر منهم الاستاذ ابو اسحاق الاسفرائینی و القاضی ابوبکر الباقلانی و امام الحرمین فی الارشاد و ابن القشیری فی المرشد بل فکان ابن الفورک عن الاشاعرة واختاره فی تفسیر وقال

معاصی اللہ کلها عندنا کبائر و انما یقال لبعض صغیرة و کبیرة بالاضافة.

"اور ائمہ متکلمین کی ایک جماعت نے اس بات سے انکار کردیا ہے کہ گناہوں میں صغیرہ بھی ہوتے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ تمام معاصی (یعنی گناہ) کبیرہ ہیں۔ ان ائمہ میں سے ابو اسحٰق اسفرائینیؒ(۱) قاضی ابوبکر باقلانیؒ(۲) اور امام الحرمین(۳) نے الارشاد میں اور ابن القشیری(۴) نے المرشد میں یہ لکھا ہے بلکہ اس بات کو نقل کیا ہے ابن الفورک(۵) نے اشاعرہ کی طرف سے اور اسی کو اپنی تفسیر میں اختیار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک تمام معاصی (گناہ) کبائر ہیں (جن میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جاتی ہے) اور ان میں سے بعض کو صغیرہ اور بعض کو کبیرہ ان کی باہمی نسبت کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

حضرت نانوتوی کی تحقیق:

اپنے دور کے امام المتکلمین حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کا ایک مفصل مکتوب "عصمت انبیاء" کے موضوع پر آپ کے مجموعہ مکاتیب "قاسم العلوم" مرتبہ پروفیسر مولانا محمد انوار الحسن صاحب شیرکوٹی میں شائع ہوچکا ہے اور یہی مکتوب حضرت مولانا بدر عالم صاحب محدث میرٹھی نے بھی ترجمان السنۃ جلد سوم میں درج کردیا ہے۔ جس کے زیر بحث حصہ کا ترجمہ یہ ہے:

"اب رہا یہ سوال کہ جب مصدر گناہ خواہ کبیرہ ہو یا صغیرہ ایک ہی ٹھہرا

---

(۱) امام ابو اسحٰق اسفرائینی، قاضی ابوبکر باقلانی اور ابوبکر بن فورک حضرت امام اشعریؒ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں جن کو علم کلام میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ امام اسفرائینی کا نام ابراہیم بن محمد ہے۔ خراسان کے ایک شہر اسفرائن کے رہنے والے ہیں۔ آپ کی وفات بمقام نیشاپور ۴۱۸ھ میں ہوئی۔

(۲) قاضی ابوبکر الباقلانی کا نام محمد بن طیب ہے۔ وفات ۴۰۳ھ۔

(۳) امام الحرمین امام غزالی کے استاذ ہیں۔

(۴) القشیری کا نام عبدالرحیم بن عبدالکریم ہے۔ کنیت ابوالقاسم ہے۔ بمقام نیشاپور ۵۱۴ھ میں وفات پائی۔

(۵) امام ابن فورک کا نام محمد بن الحسن ہے فقہ، اصول اور کلام کے امام ہیں۔ آپ زہر سے شہید ہوئے۔ وفات ۴۰۶ھ مزار نیشاپور میں ہے۔

یعنی مادۂ شیطانی تو پھر علماء نے ان دونوں کے صدور میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں تفریق کیوں کی ہے، اگر ان میں مادۂ شیطانی نہیں ہے تو پھران سے ہر دونوں کا صدور ممنوع ہونا چاہئے اور قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی کوئی تفصیل بھی نہ ہونی چاہئے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کبائر وہ گناہ ہیں جو بذات خود مقصود ہوتے ہیں اور صغائر وہ ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ کبیرہ کے لئے ذریعہ اور تمہید ہوتے ہیں اس لئے کبائر کا قبح (یعنی برائی) صغائر کی نسبت سے ذاتی اور صغائر کا عرضی ہوتا ہے کیونکہ کبائر میں نیت فاسد کے سوائے کوئی اور دوسری نیت نہیں ہوتی اور ان کے ذرائع یعنی صغائر میں مختلف نیات بھی ہوسکتی ہیں اور ان نیتوں کے اختلاف سے ان افعال کا حکم بھی مختلف ہوسکتا ہے۔ دیکھو زنا جو کبائر میں سے ہے مطلقاً حرام ہے خواہ وہ کسی کے ساتھ ہو اور بوس و کنار جو صغائر میں شمار ہے اگر اجنبی عورت کے ساتھ ہو تو حرام ہے مگر اپنی بیوی کے ساتھ حرام نہیں ہے بلکہ مطلوب و محمود ہے۔ پس جب صغائر میں قبح عارضی ہوا یعنی کہیں ہوا اور کہیں نہ ہوا تو ان کا قبح بھی کبائر کی طرح کھلا ہوا واضح اور ظاہر نہیں ہوگا۔ اس لئے یہاں وحی کی اطلاع کے بغیر یہ حکم لگانا مشکل ہوگا کہ قبح کہاں عارضی ہے اور کہاں اصلی۔ ان حدود کی تحدید صرف ایک احکم الحاکمین کا حق ہے۔ نبی کو بھی اگر اس حقیقت کی اطلاع ہوتی ہے تو بذریعہ وحی ہوتی ہے۔ غالباً ووجدک ضالا فھدی کے ایک معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں اس کے برخلاف کبائر کا معاملہ ہے۔ وہ شرائع سابقہ سے لے کر آج تک اتنا روشن چلا آیا ہے کہ ان کے قبح پر وحی الٰہی کو تنبیہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی اس لئے انبیاء علیہم السلام سے ان کا صدور نہ قبل از نبوت ہوسکتا ہے نہ بعد از نبوت۔ صغائر کا قبح اس درجہ شہرت پذیر نہیں ہوتا اس لئے ان کا معاملہ اتنا دقیق ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان کی

شناخت وحی کے بغیر ناممکن ہوتی ہے، کون نہیں جانتا کہ جس طرح زنا ہر شخص کے نزدیک معصیت ہے اسی طرح اس کے مقدمات کھلی ہوئی معصیت نہیں، اگر قرآن و حدیث ان کی ممانعت نہ فرماتے تو کسی کے ذہن میں بھی ان کی اتنی مذمت نہ آسکتی۔ ہاں بعض معاصی ایسے ہیں کہ ان کے مذموم ہونے کی شہرت بھی کبائر کی طرح ہے جیسے کذب۔ یہاں بھی اس کے قبح کے لئے وحی کی تنبیہ کی احتیاج نہیں ہے مگر یہ بھی اسی وقت ہوگا کہ اس کا صدور قصداً ہو نہ کہ زَلت کے طور پر غیر اختیاری

انسان کے کمالات کی دو قسمیں ہیں۔ کمالات علمیہ اور کمالات عملیہ، کذب انسان کے کمالات علمیہ کے فساد پر ضرور دلالت کرتا ہے اس لئے اگر کوئی شخص قصداً جھوٹ بولے تو نہ تو وہ خدا تعالیٰ کی نظر میں قابل اعتماد ہوسکتا ہے نہ انسانوں کی نظروں میں۔ کیا معلوم جب اس کی عادت کذب کی ٹھہری تو وہ وحی الٰہی کو بجنسہ پہنچائے گا یا نہیں۔ ہر بنی نوع انسان کو کیا اطمینان ہے کہ جو وحی اس پر آئی تھی وہی اس نے بعینہ پہنچائی ہے۔ اس لئے جس کی فطرت میں دروغ گوئی کی صفت ثابت ہوجائے وہ منصب نبوت کے قابل نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر کذب کا صدور غیر اختیاری طور پر ہوجائے تو اس کا امکان ہوسکتا ہے مگر کبائر میں چونکہ مصادر متعین ہوتے ہیں یعنی ان میں فاسد نیت کے سوا کوئی دوسری نیت ممکن ہی نہیں اس لئے بطور زلت بھی ان کا صدور ناممکن ہے۔"

حضرت نانوتویؒ کا اصل مکتوب فارسی میں ہے یہاں بخوف طوالت اس کا صرف ترجمہ پیش کردیا ہے۔ حضرت کی اس تقریر سے تقریباً سارے شبہات حل ہوجاتے ہیں اور کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے اور صغائر کے عمداً یا سہواً صدور میں جو اختلافات ہیں وہ لفظی ہی رہ جاتے ہیں کیونکہ جب صغائر اتنے مخفی ہوتے ہیں کہ ان کی حقیقت بغیر وحی نہیں کھلتی تو انبیاء کرام سے ان کا صدور عمداً کیونکر ہوسکے گا۔

لامحالہ اگر ان کا صدور انبیاء کرام سے ہوسکتا ہے تو سہواً اور پھر وحی سے اس پر تنبیہ ہونے کے بعد ہی معلوم ہوسکے گا کہ اس میں لغزش ہوگئی۔ تو اس حقیقت کے پیش نظر یہ گناہ صغیرہ بھی نہ ہوگا بلکہ ایک زَلت (لغزش) ہوگی تو خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ جن اقوال میں انبیاء کرام سے صدور صغیرہ کا جواز مذکور ہے اس سے مراد امکان و جواز ہے نہ وقوع یعنی ایسا ہونا ممکن تو ہے لیکن واقع نہیں ہوگا۔ یا صغیرہ سے مراد ان کے نزدیک زَلت ہے چنانچہ لسان العرب میں ہے وقد تطلق المعصية على الزلة مجازاً "یعنی اور کبھی زَلت (لغزش) پر مجازاً معصیت کا لفظ بولا جاتا ہے" اور زَلت و معصیت کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

جرم، زَلت اور خطائے اجتہادی کا فرق:

اسی مفصل اور جامع مکتوب میں حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

جس حسد کا باعث خداوندی محبت ہو وہ غیر اختیاری ہوتی ہے اس لئے قابل درگزر ہوسکتی ہے برخلاف اس حسد کے جس کی بنیاد حب دنیا ہو۔ اس تقریر سے جرم، زَلت اور خطائے اجتہادی میں فرق واضح ہوتا ہے، جرم قصداً معصیت کرنے کا نام ہے اور خطائے اجتہادی اس غلطی کو کہتے ہیں جہاں غلط فہمی کا کوئی منشا پیدا ہوسکتا ہے اس کے برخلاف زَلت وہ ہے جہاں غلط فہمی کا کوئی منشا تو نہیں ہوتا مگر اس میں احتیاط کے باوجود غیر اختیاری طور پر مبتلا ہوجاتا ہے (جیسا کہ خود زَلت کا لفظ جس کے معنی لغزش اور پھسلنے کے ہیں اس پر دلالت کرتا ہے الخ) یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ جرم، اثم اور حنث گناہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور قرآن حکیم میں کسی پیغمبر پر ان الفاظ کا اطلاق ثابت نہیں ہے۔

ان کے علاوہ ذنب، معصیت، ظلم، ضلالت کا معنی عام ہے جو لغزش اور زلت پر بھی بولے جاتے ہیں جیسا کہ گزشتہ اوراق میں اس کی بحث گزر چکی ہے۔

۲۔ امام راغب اصفہانیؒ زَلت کے تحت لکھتے ہیں: استرسال الرجل من غير

قصد (بغیر ارادے کے پاؤں پھسل جانا) اور خطا کے معنی لکھتے ہیں:۔ العدول عن الجهة المستقيم (ٹھیک اور سیدھی جہت سے ایک طرف ہوجانا)

۳۔ تفسیر طبری میں ہے: الخطيئة قد تكون من قبل العمد و غير العمد ففصل جل ثناء ه لذلک بينهما فقال و من يكسب[1] خطيئة (على غير عمد منه) او اثما (على عمد منه) اس سے معلوم ہوا کہ قصداً یا سہواً دونوں طرح کی غلطی پر خطا کا لفظ بولا جاتا ہے اور انبیاء کرام کی عصمت چونکہ محکم آیات قرآنی اور قطعی دلائل سے ثابت ہوچکی ہے اس لئے ان معصوم حضرات کے متعلق جہاں بھی لفظ خطا کا مستعمل ہوگا اس سے مراد غیر اختیاری خطا ہوگی۔ جو دوسروں کے لئے تو قابل مؤاخذہ نہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کی عظمت شان کے پیش نظر اس پر بھی ان سے مؤاخذہ ہوجاتا ہے، دوسروں کے لئے خطا پر مواخذہ نہ ہونا اس آیت سے ثابت ہوتا ہے:

ليس عليكم جناح فيما اخطأتم به و لكن ما تعمدت قلوبكم

(پ۲۱ سورۃ الاحزاب ع۱)

ترجمہ (ا): "اور گناہ نہیں تم پر جس چیز میں چوک جاؤ پھر وہ جو دل سے ارادہ کیا"

(حضرت شاہ صاحبؒ)

(ب) "اور تم کو اس میں جو بھول چوک ہوجاوے تو اس سے تو تم پر کچھ گناہ نہ ہوگا۔ لیکن ہاں جو دل سے ارادہ کرکے کرو" (مولانا تھانویؒ)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ حاشیہ میں لکھتے ہیں: "یعنی بھول کر یا دانستہ اگر غلط کہہ دیا کہ فلاں کا بیٹا فلاں وہ معاف ہے، بھول چوک کا گناہ کسی چیز میں نہیں، ہاں ارادہ کا ہے اس میں اللہ چاہے تو بخش دے" یہ آیت اس مسئلہ میں نازل ہوئی ہے کہ ہر بیٹے کی نسبت اس کے حقیقی باپ کی طرف کرنی چاہئے اور کوئی شخص

---

(۱) پ ۵ سورۃ النساء رکوع ۱۶

کسی دوسرے کے بیٹے کو اپنا بیٹا نہ کہے۔ نیز علامہ عثمانی لکھتے ہیں: یعنی ٹھیک انصاف کی بات یہ ہے کہ ہر شخص کی نسبت اس کے حقیقی باپ کی طرف کی جائے کسی نے لے پالک بنالیا تو وہ واقعی باپ نہیں بن گیا، یوں شفقت ومحبت سے کوئی کسی کو مجازاً بیٹا یا باپ کہہ کر پکارے وہ دوسری بات ہے۔ غرض یہ ہے کہ تعلقات اور ان کے احکام میں اشتباہ و التباس واقع نہ ہونے پائے"

(۲) حدیث میں ہے: رفع عن امتی الخطأ والنسیان. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت سے خطا اور بھول پر مواخذہ اٹھادیا گیا ہے۔

عصمت کی تعریف اور حقیقت:

علم کلام کی کتابوں میں عصمت کی حقیقت یہ لکھی ہے: وحقیقة العصمة ان لا یخلق اللہ تعالی فی العبد الذنب مع بقاء قدرته واختیاره وهذا معنی قولهم هی لطف من اللہ تعالی یحمله علی فعل الخیر ویزجره عن الشر مع بقاء الاختیار وتحقیقاً للابتلاء، قال الشیخ ابو منصور الماتریدی العصمة لا تزیل المحنة (شرح عقائد نسفی): اور عصمت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے میں ذنب (یعنی گناہ) پیدا نہیں کرتا۔ باوجود اس کے کہ اس کو گناہ پر قدرت اور اختیار باقی رہتا ہے اور ان کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے کہ عصمت اللہ تعالیٰ کا لطف ہے جو بندے کو نیکی کرنے پر ابھارتا ہے اور اس کو برائی سے روکتا ہے باوجود اختیار باقی رہنے کے تاکہ ابتلاء وآزمائش ثابت ہوجائے اور اسی لئے شیخ ابومنصور[1] ماتریدی نے فرمایا ہے کہ عصمت محنت (یعنی امتحان) کو زائل نہیں کرتی۔

---

(۱) امام ابومنصور ماتریدی کا نام محمد بن محمود ہے۔ سمرقند کے مضافات میں ماترید ایک قصبہ ہے جہاں آپ پیدا ہوئے۔ دو واسطہ سے قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے شاگرد تھے۔ آپ کی وفات ۳۳۳ھ میں ہوئی۔ امام ماتریدی نے امام اشعری سے علم کلام کے چند اصولوں میں اختلاف کیا ہے۔ فقہائے حنفیہ علم کلام میں عموماً ماتریدی ہیں اور اکابر دیوبند بھی مسائل کلامیہ میں امام ماتریدی کے پیروکار ہیں۔

۲۔ خیالی حاشیہ شرح العقائد میں ہے: تعریفها فهی ملکة اجتناب المعاصی مع التمکن فیها وقد یعبر تلک الملکة باللطف لحصولها بمحض لطف اللہ تعالی و فضل منه (اور عصمت کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایک ملکہ ہے جس کی وجہ سے باوجود قدرت کے انسان معاصی (گناہوں) سے اجتناب کرتا ہے اور کبھی اس ملکہ کو لطف سے تعبیر کردیتے ہیں کیونکہ عصمت کا حاصل ہونا بھی محض اللہ تعالیٰ کے لطف اور فضل پر موقوف ہے)

۳۔ مواقف میں ہے: وهی عندنا ان لا یخلق اللہ فیهم ذنبا و عند الحکماء ملکة تمنع الفجور. (اور عصمت ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام میں گناہ پیدا ہی نہیں کرتا اور حکماء کے نزدیک عصمت ایک ملکہ ہے جو گناہوں سے روکتا ہے)

۴۔ شرح فقہ اکبر میں ہے: قال القونوی واختلف الناس فی کیفیة العصمة فقال بعضهم هی محض فضل اللہ تعالی بحیث لا اختیار للعبد فیه و ذلک اما یخلقهم علی طبع یخالف غیرهم بحیث لا یمیلون الی المعصیة ولا ینفرون عن الطاعة کطبع الملائکة و اما بصرف همتهم عن السیئات وجذبهم الی الطاعات جبراً من اللہ تعالی بعد ان اودع فی طبائهم ما فی طبائع البشر وقال بعضهم العصمة فضل من اللہ و لطف منه ولکن علی وجه یبقی اختیارهم بعد العصمة فی الاقدام علی الطاعة والامتناع عن المعصیة والیه مال ابو الشیخ الماتریدی حیث قال العصمة لا تزیل المحنة ای الابتلاء و الاختیار.

"اور قونوی فرماتے ہیں کہ عصمت کی کیفیت میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے پس بعض کہتے ہیں کہ عصمت محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اس حیثیت سے کہ

بندے کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہے اور یہ یا تو اس صورت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو دوسروں کی طبیعت کے خلاف (ایک خاص) طبیعت پر پیدا فرمایا ہے اس حیثیت سے کہ وہ معصیت (نافرمانی) کی طرف کوئی میلان نہیں رکھتے اور نہ وہ نیکی اور اطاعت سے نفرت کرتے ہیں جیسا کہ ملائکہ کی طبیعت میں ہے اور یا اس صورت میں کہ ان کے ارادے اور خواہش کو گناہوں سے ہٹا لیا جاتا ہے اور نیکیوں کی طرف ان کو کھینچ لیا جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر مجبور ہوتے ہیں بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طبیعتوں میں بھی وہی بات رکھی ہے جو دوسرے انسانوں کی طبیعتوں میں رکھی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ عصمت محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور لطف ہے لیکن اس حیثیت سے کہ عصمت کے بعد بھی ان کو نیکیوں کی طرف قدم بڑھانے اور گناہوں سے رک جانے کا اختیار باقی رہتا ہے اور ابو شیخ امام ماتریدیؒ کا میلان بھی اسی قول کی طرف ہے چنانچہ آپ نے فرمایا ہے کہ عصمت امتحان اور اختیار کو زائل نہیں کرتی"

۵۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدثؒ دہلوی تحریر فرماتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ عصمت ایک ملکہ اور قوت نفسانی ہے کہ وہ گناہ اور برائیوں کو صادر نہیں ہونے دیتی اور حس میں نہیں آتی نہ عقل کسی کی اس ملکہ کو دریافت کر سکتی ہے۔ مگر افعال و آثار شخصی سے بطور استدلال کے (تحفہ اثناعشریہ مترجم ص ۴۳۷)

مندرجہ عبارات سے ثابت ہوا کہ عصمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انبیاء کرام علیہم السلام میں گناہ پیدا ہی نہیں کرتا اور وہ اس کے خاص فضل ولطف کی بنا پر معصیت سے محفوظ رہتے ہوئے نیکی و طاعت پر قائم رہتے ہیں تو عصمت کی اس تعریف و حقیقت کے بعد یہ احتمال باقی نہیں رہتا کہ انبیاء کرام سے معصیت اور گناہ کا صدور ہو جائے خواہ وہ معصیت صغیرہ کے درجہ میں ہو یا کبیرہ کے۔ جب اللہ تعالیٰ معصوم انبیاء کے اندر معصیت اور گناہ پیدا ہی نہیں

کرتا تو پھر کبیرہ ہو یا صغیرہ معصیت ان سے کیونکر صادر ہو سکتی ہے۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ انبیاء کرام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے مطلقاً معصوم ہیں۔ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام۔ علاوہ ازیں مفتی محمد یوسف صاحب نے خود علامہ تفتازانی کی تلویح سے معصیت کے تحت یہ عبارت نقل کی ہے:

"اما المعصية فهي فعل حرام يقصد الى عينه مع العلم بحرمته"

"اور معصیت ایک حرام فعل ہے جو حرام جان کر قصداً کیا جائے۔"

("علمی جائزہ" ص ۶۱)

تو معصیت کی اس تعریف سے بھی یہی لازم آتا ہے کہ انبیاء کرام ہر قسم کی معصیت سے معصوم ہیں کیونکہ معصیت اس فعلِ حرام کو کہتے ہیں جو جان بوجھ کر کیا جائے اور انبیاء کرام کی جو خصوصیات عصمتِ انبیاء کے بیان میں قرآنی دلائل سے ثابت کی گئی ہیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے نامزد پیغمبر ہوتے ہیں۔ وہ مطاع مطلق ہوتے ہیں، ان کی اطاعت عینِ خدا کی اطاعت ہوتی ہے اور ان کی معصیت عین خدا کی معصیت۔ ان کے قلب ولسان پر اللہ تعالیٰ کی خاص نگرانی ہوتی ہے، ان کی کوئی بات خواہش نفس پر مبنی نہیں ہوتی، خلاف حق کی طرف ان کے دل کا ادنیٰ سے ادنیٰ میلان اور جھکاؤ بھی نہیں ہو سکتا وغیرہ۔ تو ان خصوصیاتِ نبوت کے باوجود کیا کوئی صاحب علم وفہم شخص یہ باور کر سکتا ہے کہ انبیاء کرام جان بوجھ کر کسی فعلِ حرام کے مرتکب ہو سکتے ہیں العیاذ باللہ۔ لہٰذا معصیت سے ان کا مطلقاً پاک اور معصوم ہونا ثابت ہو گیا۔ اور اگر نسیان بھول چوک سے کام ہو جائے تو وہ معصیت کے دائرہ سے خارج ہے، وہ زلت اور لغزش تو ہے لیکن معصیت نہیں۔ اور اگر کہیں انبیاء کرام کی طرف معصیت کی نسبت ثابت ہے تو وہ صورتاً معصیت ہے نہ حقیقتاً۔

علامہ تفتازانی کا اعتراف:

امکان و امتناع کی بحث اور متکلمین کے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد علامہ

تفتازانی نے خود ہی ان روایات کا جواب پیش کر دیا ہے جو بظاہر عصمت انبیاء کے خلاف نظر آتی ہیں چنانچہ شرح العقائد میں لکھتے ہیں: اذا تقرر هذا فما نقل عن الانبياء عليهم السلام مما يشعر بكذب او معصية فما كان منقولا بطريق الآحاد فمر دود وما كان بطريق التواتر فمصروف عن ظاهره ان امكن ومالا فمحمول على ترك الاولى او كونه قبل البعثة وتفصيل ذلك فى الكتب المبسوطة. اور جب یہ ثابت ہو چکا تو انبیاء علیہم السلام کے متعلق جو روایات ایسی پائی جاتی ہیں جن سے جھوٹ یا گناہ سمجھا جاتا ہے تو ان میں سے جو بطریق آحاد منقول ہیں وہ رد کر دی جائیں گی اور جو بطریق تواتر[1] منقول ہوں گی تو جہاں تک ممکن ہو ان کا ظاہری معنی چھوڑ دیا جائے گا اور اگر یہ نہ ہو سکا تو وہ ترک اولیٰ پر محمول کی جائیں گی یا واقعہ بعثت سے پہلے ہوگا اور اس کی تفصیل مبسوط کتابوں میں پائی جاتی ہے۔

(۲) علامہ علی قاری حنفی محدثؒ فرماتے ہیں:

والحاصل ان احداً من اهل السنة لم يجوز ارتكاب المنهى عنه عن قصد ولكن بطريق السهو و النسيان ويسمى ذلك زلة (شرح فقہ اکبر)

اور حاصل یہ ہے کہ اہل سنت میں سے کسی نے یہ جائز نہیں قرار دیا کہ انبیاء کرام اپنے قصد وارادہ سے وہ کام کریں جس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممانعت ہے۔

---

(۱) حدیث کی اقسام کی تفصیل اصول حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔ ان میں سے حدیث متواترہ وہ ہے جس کے راوی ہر طبقہ اور ہر زمانے میں اتنے زیادہ ہوں کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو اور حدیث متواتر کے علاوہ جتنی احادیث ہیں وہ آحاد کہلاتی ہیں۔ اور آحاد محکم آیات کے مقابلہ میں قابل اعتماد نہیں ہو سکتیں۔ علامہ علی قاری حنفی محدث لکھتے ہیں: فان الآحاد لا تفيد الاعتماد فى الاعتقاد (شرح فقہ اکبر) یعنی اخبار آحاد اعتقادات میں مفید اعتماد نہیں ہو سکتیں۔

اور خیالی میں ہے: و اما خبر الواحد المنقول عن النبى صلى الله عليه وسلم بالآحاد فانما لم يفد العلم لعروض شبهة فى كونه خبر الرسول وهى ان الآحاد يجوز عليهم الغفلة والسهو والكذب. ''اور خبر واحد جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق آحاد منقول ہے وہ علم ویقین کا فائدہ نہیں دے سکتی۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہونے کے بارے میں اس میں شبہ ہو سکتا ہے کیونکہ آحاد پر غفلت سہو اور جھوٹ کا جواز ہو سکتا ہے''

محققین اہل سنت کے ارشادات

انبیاء کرام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے بالکل معصوم ہیں

مفتی محمد یوسف صاحب نے مودودیت کے تحفظ کے لئے صرف وہ اقوال پیش کئے جو ضعیف اور مرجوح ہیں اور ان اقوال کو ترک کر دیا جو قوی، راجح اور قرآن کی آیات کے مطابق ہیں جن سے انبیاء کرام علیہم السلام کا صغیرہ اور کبیرہ ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہونا ثابت ہوتا ہے اور عصمت انبیاء کا مسئلہ چونکہ اصولی ہے اور انبیاء کی مخصوص عظمت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ گناہ اور معصیت کے داغ سے بالکل پاک صاف ہوں تاکہ کسی مسلمان کے دل میں یہ کھٹک نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حضرات نبوت و رسالت کے لئے منتخب ہوتے ہیں، جو خالق ومخلوق کے مابین واسطہ ہدایت ہوتے ہیں، جن کی محبت اور اطاعت سے حق تعالیٰ کی محبت واطاعت نصیب ہوتی ہے، جن کے ماننے سے اخروی نجات اور جن کے انکار سے اخروی عذاب حاصل ہوتا ہے ان میں بھی العیاذ باللہ گناہوں کا شائبہ پایا جاتا ہے اس لئے یہاں ہم عصمت انبیاء کے بارے میں تحقیقی مسلک کی تائید میں محققین اہل سنت کے ارشادات پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین اور مستفیدین حضرات کے دلوں میں کسی قسم کی کوئی الجھن باقی نہ رہے۔ حق تعالیٰ ہر مسلمان کو قبول حق کی ہمیشہ توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

انبیاء کفر وشرک سے معصوم ہیں:

(۱) شرح عقائد نسفی میں ہے:۔ انهم معصومون عن الكفر قبل الوحى و بعده بالاجماع. ''اس بات پر اجماع ہے کہ انبیاء کرام وحی سے پہلے اور بعد دونوں حالتوں میں کفر سے معصوم ہوتے ہیں۔''

(۲) علامہ سید سندؒ لکھتے ہیں: اما الكفر فاجتمعت الامة على عصمتهم عنه قبل النبوة و بعدها ولاخلاف لاحدمنهم فى ذلك ''لیکن

امت کا اس پر اجماع ہے کہ انبیاء نبوت سے قبل اور بعد میں کفر سے بالکل معصوم ہیں اور اس میں ان میں سے کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے۔''

(شرح المواقف)

(۳) علامہ علی قاری حنفی محدثؒ فرماتے ہیں: انهم معصومون عن الكفر قبل الوحی و بعده بالاجماع (شرح فقہ اکبر)''اور اس بات پر اجماع ہے کہ انبیاء علیہم السلام وحی نازل ہونے سے پہلے اور بعد میں کفر سے معصوم ہوتے ہیں۔

(۴) علامہ ابن ہمامؒ کے شاگرد شیخ قاسم بن قطلو بغاؒ المتوفی ۸۵۸ھ فرماتے ہیں: اتفق جمهور المسلمين على ان الانبياء عليهم الصلوة والسلام معصومون عن الكفر قبل الوحی و بعده (جمہور مسلمان اس پر متفق ہیں کہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام وحی سے پہلے اور بعد میں کفر سے معصوم ہیں۔ (مسامرہ)

(۵) امام رازی رحمۃ اللہ علیہ آیت و وجدک ضالا فهدی کے تحت لکھتے ہیں:

اما الجمهور من العلماء فقد اتفقوا على انه عليه السلام ما كفر بالله لحظة (اور جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لحظہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر نہیں کیا)

(۶) تفسیر خازن میں ہے (و وجدک ضالا فهدی) لان نبينا صلى الله عليه وسلم و كذلك الانبياء قبله منذ ولدوا نشأوا على التوحيد والايمان قبل النبوة و بعدها و انهم معصومون قبل النبوة من الجهل بصفات الله تعالى و توحيده.

''کیونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح تمام انبیاء جب سے

پیدا ہوئے وہ توحید اور ایمان پر ہی قائم رہے نبوت سے قبل بھی اور نبوت کے بعد بھی اور وہ معصوم ہیں اس بات سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی توحید سے ناواقف ہوں۔''

(۷) قاضی عیاض محدث فرماتے ہیں: والصواب انهم معصومون قبل النبوة من الجهل بالله و صفاته والتشكيك فی شئی من ذلك و قد تعاضدت الاخبار والآثار عن الانبياء تنزيههم عن هذه النقيصة منذ ولدوا و نشأتهم عن التوحيد والايمان بل على اشراق انوار المعارف ونفحات الطاف السعادة الخ (الشفاء بتعريف حقوق المصطفى جلد۲ مطبوعہ دمشق ص ۲۵۷)

ترجمہ: اور صواب یہ ہے کہ وہ اس امر سے کہ ذات اور صفات باری تعالیٰ میں سے کسی امر سے بے خبر ہوں اور دین و آخرت کے اُمور میں سے ان کو ایسے امر میں کسی قسم کا شک وشبہ واقع ہو قطعاً معصوم اور بری ہیں اور تمام اخبار و آثار جو انبیاء کرام سے ماثور اور منقول ہوئے ہیں وہ سب اس امر کے شاہد اور مؤید ہیں کہ یہ تمام حضرات ابتداء آفرینش ہی سے ان تمام نقائص سے پاک اور بری ہوتے ہیں اور توحید الٰہی اور ایمان باللہ بلکہ اس حالت پر نشوونما پاتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً ان پر انوار و معارف اور نفحات الطاف الٰہی فائز ہوتے رہتے ہیں الخ۔

(نسیم الریاض، ترجمہ شفاء قاضی عیاض، جلد دوم، ص۱۱۸)

لیکن سہو اور نسیان سے فعل ممنوع ممکن ہے (اور اس کو زلت کہتے ہیں نہ کہ معصیت)

علامہ سید شریف کی وضاحت:

جو آیات بظاہر عصمت انبیاء کے خلاف ہیں ان کا جواب دینے کے بعد علامہ سید شریف شرح مواقف میں لکھتے ہیں:

و علی هذا یجب ان یسرح ذلک الی بقعة الامکان ولا یجتریٔ علی الانبیاء باطلاق اللسان.

''اور اس بنا پر واجب ہے کہ اس امر کو امکان کی حد تک ہی رکھا جائے اور انبیاء کرام پر زبان کھولنے کی جرأت نہ کی جائے۔'' یعنی گناہ اور معصیت کے صدور کو انبیاء کرام کے لئے ممکن کی حد تک ماننا تو جائز ہے لیکن اس سے بڑھ کر یہ جسارت نہ کی جائے کہ انبیاء کرام سے گناہ واقع بھی ہو جاتے ہیں۔

نیز علامہ سید شریف فرماتے ہیں اما ما کان منقولا بالآحاد وجب رہا لان نسبة الخطاء الی الرواة اهون من نسبة المعاصی الی الانبیاء (اور جو روایت آحاد سے منقول ہو تو اس کا رد کر دینا واجب ہے کیونکہ راویوں کی طرف غلطی کا منسوب کرنا بہ نسبت اس کے کہ انبیاء کی طرف معصیت منسوب کی جائے زیادہ آسان ہے)

انبیاء جھوٹ سے معصوم ہیں:

(١) شرح عقائد نسفی میں ہے: و کلهم کانوا مخبرین مبلغین عن الله تعالی لان هذا معنی النبوة والرسالة صادقین ناصحین للخلق لئلا تبطل فائدة البعثة والرسالة وفی هذا اشارة الی ان الانبیاء معصومون عن الکذب خصوصاً فیما یتعلق بامر الشرائع و تبلیغ الاحکام و ارشاد الامة اما عمداً فبالاجماع و اما سهواً فعند الاکثرین.

(اور تمام انبیاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینے والے اور اس کے احکام کی تبلیغ کرنے والے تھے کیونکہ نبوت اور رسالت کا یہی معنی ہے۔ وہ سچے اور مخلوق کو نصیحت کرنے والے تھے تاکہ ان کی بعثت اور رسالت کا فائدہ نہ باطل ہو جائے اور اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام جھوٹ سے پاک اور معصوم ہیں

خصوصاً ان باتوں میں جن کا تعلق شریعت اور تبلیغ احکام اور امت کی ہدایت سے ہے اور اس بات پر اجماع ہے کہ وہ عمداً جھوٹ سے معصوم ہیں اور اکثر کے نزدیک از روئے سہو بھی جھوٹ سے معصوم ہیں) یہاں یہ ملحوظ رہے کہ سہو غیر اختیاری امر ہے اور یہ قول بھی بعض کا جواز و امکان کے بارے میں ہے نہ کہ وقوع کے بارے میں جیسا کہ گزشتہ اوراق میں اس پر مفصل بحث کر دی گئی ہے۔

٢۔ شرح العقائد کی شرح نبراس میں ہے:

''(و اما سهواً فعند الاکثرین) ای ذهب الجمهور الی عصمتهم عن الکذب فی التبلیغ سهواً و منهم الاستاذ ابو اسحٰق الاسفرائینی و ینسب الخلاف الی القاضی الباقلانی بناء علی ان المعجزة تدل علی صدقه فیما یقصد تبلیغه وقال بعض العلماء ان الباقلانی لاینکر العصمة ولکنه یقول حجة العصمة هو الاجماع والنصوص لا المعجزة واختار القاضی عیاض المالکی العصمة عن الکذب مطلقاً فی التبلیغ وغیره سهواً و عمداً وادعی اجماع السلف علیه الخ)''

(یعنی جمہور کا یہ مذہب ہے کہ تبلیغ میں انبیاء کرام سہواً بھی کذب (جھوٹ) سے معصوم (پاک) ہیں اور ان میں سے استاذ ابو اسحٰق اسفرائینی بھی ہیں اور قاضی باقلانیؒ کی طرف اس میں اختلاف منسوب ہے۔ اس وجہ سے کہ معجزہ کسی پیغمبر علیہ السلام کے صدق پر اس امر میں دلالت کرتا ہے جس کا مقصد تبلیغ ہو۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ باقلانیؒ (جھوٹ سے) عصمت کے منکر نہیں ہیں۔ لیکن وہ یہ فرماتے ہیں (جھوٹ سے) عصمت کی حجت نصوص اور اجماع ہے نہ کہ معجزہ اور قاضی عیاضؒ مالکی کے نزدیک مختار یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ میں مطلقاً کذب سے معصوم ہیں خواہ عمداً ہو یا سہواً اور اس پر آپ نے سلف کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے) صاحب نبراس کی اس تشریح سے معلوم ہوا کہ

قاضی باقلانی کا یہ مذہب نہیں ہے کہ انبیاء کرام سہواً جھوٹ سے معصوم نہیں ہوتے بلکہ ان کا اختلاف اس بات میں ہے کہ انبیاء کا کذب سے معصوم ہونے کی دلیل ان کا معجزہ نہیں ہے کیونکہ معجزے کا تعلق اس امر سے ہے کہ وہ تبلیغ احکامِ خداوندی میں کذب سے معصوم ہیں اور جس امر کا تعلق تبلیغ سے نہ ہو وہاں اس کی ضرورت نہیں اور انبیاء علیہم السلام کذب (جھوٹ) سے جو معصوم ہیں تو اس بات کی دلیل شرعی نصوص اور اجماع ہے لہٰذا یہ اختلاف ان کا دلیل میں ہے نہ کہ نفس مسئلہ میں۔

۳ اجمع اهل الملل و الشرائع كلها على وجوب عصمتهم عن تعمد الكذب فيما دل المعجزة القاطع على صدقهم فيه كدعوى الرسالة وما يبلغونه من الله الى الخلائق اذ لو جاز عليهم تقول والافتراء فى ذلك عقلاً لادى الى ابطال دلالة المعجزة وهو محال وفى جواز صدور الكذب عنهم فيما ذكر على سبيل السهو والنسيان خلاف فمنعه ابو اسحق و كثير من الائمة الاعلام لدلالة المعجزة وهو ممتنع الخ

"(تمام اصحاب ملل وشرائع کا اس بات پر اجماع ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام عمداً کذب (جھوٹ) سے معصوم ہیں جس امر میں معجزہ قطعی طور پر ان کے صدق پر دلالت کرتا ہے مثلاً دعوئ رسالت اور وہ امور جو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کو پہنچاتے ہیں کیونکہ اگر عقلاً اس امر میں بات گھڑنا اور جھوٹ باندھنا جائز ہو تو اس سے معجزے کی دلیل نبوت ہونے کا باطل ہونا لازم آتا ہے حالانکہ وہ محال ہے اور سہو ونسیان سے اس امر میں ان سے جھوٹ کے صادر ہونے میں اختلاف ہے۔ امام ابو اسحٰق اسفرائینی اور بہت سے ائمہ اعلام اس کو ممتنع اور محال کہتے ہیں کیونکہ تبلیغ احکام میں ان کی سچائی پر ان کا معجزہ ہی دلالت کرتا ہے۔ اور اگر اس میں بھی خلاف واقع ہو جائے تو اس سے معجزہ کا دلیلِ نبوت ہونا باطل ٹھہرتا ہے حالانکہ یہ محال ہے۔")

۴۔ قاضی عیاض محدث فرماتے ہیں: وعصمته عن الكذب و خلف القول منذ نبأه الله وارسله قصداً او بغير قصد واستحالة ذلك عليه شرعاً و اجماعاً و نظراً و برهاناً و تنزيهه عنه قبل النبوة قطعاً و تنزيهه عن الكبائر اجماعاً وعن الصغائر تحقيقاً الخ (الشفا عربی جلد دوم ص ۲۵۴)

ترجمہ: اور نیز جب سے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی اور رسول کیا ہے آپ جھوٹ اور خلاف گوئی سے بھی پاک اور منزہ ہیں چاہے تو یہ کذب اور خلاف گوئی قصداً ہو یا سہواً اور اتفاقاً اور آپ سے اس امر کا صادر ہونا شرعاً اور اجماعاً اور عقلاً اور برہاناً ہر طرح سے محال اور ممتنع ہے اور آپ کا جھوٹ سے پاک ہونا نبوت سے پہلے ہی سے قطعاً ثابت ہے اور کبائر سے پاک ہونا اجماعاً اور صغائر سے پاک ہونا تحقیقاً ثابت ہے الخ

(نسیم الریاض ج ۲ ص ۲۰۵)

۵۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں: فقد اجمعت الامة على كونهم معصومين عن الكذب والتحريف فيما يتعلق بالتبليغ والا لارتفع الوثوق بالاداء واتفقوا على ان ذلك كما لا يجوز وقوعه منهم عمداً لا يجوز ايضاً سهواً الخ "پس تحقیق امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ انبیاء علیہم السلام کذب اور تحریف (کسی امر میں تبدیلی کرنے) سے ان امور میں بالکل معصوم ہیں جن کا تعلق تبلیغ سے ہے ورنہ اس بات سے وثوق ویقین اٹھ جاتا ہے کہ انہوں نے احکام خداوندی پہنچادئے ہیں اور اس بات پر سب کا یقین ہے کہ جس طرح عمداً انبیاء علیہم السلام سے جھوٹ واقع نہیں ہو سکتا اسی طرح سہو ونسیان سے بھی جائز نہیں ہے۔"

۶۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدثؒ دہلوی فرماتے ہیں:۔

"انبیاء جھوٹ بولنے اور بہتان کرنے سے مطلقاً معصوم ہیں خواہ عمداً خواہ سہواً۔ خواہ نبوت سے پہلے خواہ نبوت کے بعد، امامیہ (یعنی شیعہ) کہتے ہیں کہ جھوٹ انبیاء پر جائز بلکہ واجب ہے از راہ تقیہ کے۔" (تحفہ اثنا عشریہ مترجم ص ۳۰۹)

انبیاء کرام سے تبلیغ رسالت میں کوتاہی نہیں ہوتی:

(۱) شرح العقائد نسفی میں ہے: کلھم کانوا مخبرین مبلغین من اللہ تعالی لان ھذا معنی النبوۃ والرسالۃ صادقین ناصحین للخلق لئلا تبطل فائدۃ البعثۃ والرسالۃ۔" اور تمام پیغمبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینے والے اور اس کے احکام کی تبلیغ کرنے والے تھے کیونکہ نبوت اور رسالت کا یہی معنی ہے، وہ سچے تھے اور لوگوں کو نصیحت کرنے والے تھے تاکہ انبیاء کی بعثت اور رسالت کا فائدہ باطل نہ ہوجائے۔" اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کا اصلی فریضہ ہی احکام خداوندی کا لوگوں تک پہنچانا ہے اور اگر اسی میں کوتاہی ہوجائے تو ان کی نبوت و رسالت کی غرض ہی فوت ہوجاتی ہے۔

۲۔ مسامرہ میں ہے: (و اما فیما طریقۃ الابلاغ) ای ابلاغ الشرع و تقریرہ من الاقوال وما یجری مجراھا من الافعال لتعلیم الامۃ بالفعل (فھم معصومون فیہ من السھو والغلط الخ) "لیکن ان اقوال میں جن میں شریعت کی تبلیغ وتقریر پائی جاتی ہے اور بالفعل تعلیم امت کے لئے ان اقوام کے قائم مقام جو افعال ہیں تو ان میں انبیاء علیہم السلام سہو اور غلطی سے معصوم ہیں۔"

۳۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں: لکنہ بعث الرسل و اظھر صدقھم بالمعجزات الظاھرۃ فبلغوا امرہ و نھیہ ووعدہ ووعیدہ فوجب علی الخلق تصدیقھم فیما جاء وابہ والزم الخلق تصدیقہ فی جمیع ما اخبر عنہ من الامور الدنیا والآخرۃ الخ (لیکن اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا اور ان کی سچائی کو ظاہری معجزات کے ساتھ ظاہر فرمایا پس انہوں نے اس کے امر کی اور اس کی نہی کی اور اس کے وعدوں کی جن کا تعلق بشارتوں کے ساتھ ہے) اس کے وعید (عذاب کی خبروں) کی تبلیغ فرمائی پس لوگوں پر ان باتوں میں ان کی تصدیق واجب ہوگئی جو وہ اللہ

تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر ان کی تصدیق ان تمام خبروں میں لازم کردی ہے جو انہوں نے دنیا اور آخرت کے متعلق سنائی ہیں۔

۴۔ امام شعرانیؒ فرماتے ہیں: و عبارۃ الشیخ محی الدین فی الفتوحات "ویشترط فی حق الرسول العصمۃ فی جمیع ما یبلغہ عن اللہ عز و جل۔"
(الیواقیت والجواھر)

شیخ محی الدین ابن عربی نے فتوحات مکیہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام میں عصمت شرط ہے ان تمام کاموں میں جن کی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبلیغ فرماتے ہیں۔

۵۔ تفسیر خازن میں ہاروت اور ماروت کے قصہ کے تحت لکھتے ہیں: اجمع المسلمون علی ان الملائکۃ معصومون فضلا واتفق ائمۃ المسلمین علی ان حکم الرسل من الملائکۃ حکم النبیین سواء فی العصمۃ فی باب البلاغ عن اللہ عزوجل وفی کل شیئ تثبت فیہ عصمۃ الانبیاء فکذلک الملائکۃ و انھم مع الانبیاء فی التبلیغ الیھم کالانبیاء الی امھم الخ "تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ فرشتے معصوم اور بڑی فضیلت والے ہیں اور مسلمانوں کے اماموں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبلیغ کرنے میں معصوم ہونے کا حکم جس طرح انبیاء کے لئے ہے اسی طرح ان فرشتوں کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ کے پیغامات پہنچاتے ہیں۔ اور ہر اس چیز میں جس میں انبیاء کے لئے عصمت ثابت ہے ان فرشتوں کے لئے بھی عصمت ثابت ہے اور تحقیق فرشتے اسی طرح انبیاء کی طرف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے میں معصوم ہیں جس طرح انبیاء اپنی امتوں کی طرف احکام خداوندی پہنچانے میں معصوم ہیں" سبحان اللہ! اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کی عصمت تبلیغ رسالت احکام خداوندی میں مثل ملائکہ کے ہے اور جس طرح ملائکہ سے اس میں کوتاہی نہیں ہوتی اسی طرح انبیاء علیہم السلام سے بھی نہیں ہوتی۔

۶۔ حافظ ابن کثیر محدثؒ سورۃ المائدہ کی آیت تبلیغ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالته کے تحت لکھتے ہیں: یقول تعالی مخاطبا عبده و رسوله صلی الله علیه وسلم باسم الرسالة و آمرا له بابلاغ جمیع ما ارسل الله به وقد امتثل علیه افضل الصلوة والسلام ذلک و قام به اتم القیام قال البخاری عند تفسیر هذه الآیة حدثنا محمد بن یوسف حدثنا سفیان عن اسماعیل عن الشعبی عن مسروق عن عائشة رضی الله عنها قالت من حدثک ان محمدا کتم شیئا ممن انزل الله الیه فقد کذب--- وقال البخاری رضی الله عنه قال الزهری من الله الرسالة و علی الرسول البلاغ و علینا التسلیم وقد شهدت له امته بابلاغ الرسالة واداء الامانة واستنطقهم بذلک فی اعظم المحافل فی خطبة یوم حجة الوداع الخ (تفسیر ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ اپنے بندے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول کے عنوان سے خطاب کرتے ہوئے ان تمام امور کے (امت تک) پہنچا دینے کا حکم فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل فرمائے ہیں اور بلا شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم الٰہی کی تعمیل فرمائی ہے اور اس پر پوری طرح قائم رہے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں امام بخاری نے یہ روایت نقل فرمائی ہے انہوں نے محمد بن یوسف سے انہوں نے اسمٰعیل سے انہوں نے شعبی سے انہوں نے مسروق سے انہوںؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا جو شخص تجھ سے یہ بیان کرے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی ہوئی باتوں میں سے کوئی بات چھپائی ہے (جس کا تعلق تبلیغ امت سے ہے) تو اس نے جھوٹ بولا ہے۔ امام بخاری امام زہری کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسالت یعنی احکام کا بھیجنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ان کا پہنچا دینا ہے اور ہمارے ذمہ ان کا تسلیم کر لینا ہے۔ اور

تحقیق آپ کی امت نے آپ کے لئے اس امر کی شہادت دی ہے کہ آپ نے رسالت خداوندی پہنچا دی ہے اور اللہ تعالیٰ کی امانت ادا کر دی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ کے دوران ایک بڑے عظیم الشان اجتماع میں اپنے صحابہ سے اس کی تصدیق کرالی ہے)

۷۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ آیت یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک کے تحت لکھتے ہیں:

"اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ (لوگوں کو) سب پہنچا دیجئے اور اگر (بفرض محال) آپ ایسا نہ کریں گے تو (ایسا سمجھا جاوے گا جیسے) آپ نے اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام بھی نہ پہنچایا (کیونکہ یہ مجموعہ فرض ہے تو جیسا کل کے اخفاء سے یہ فرض فوت ہو جاتا ہے اسی طرح بعض کے اخفاء سے بھی وہ فرض فوت ہو جاتا ہے) (تفسیر بیان القرآن)

۸۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ آیت تبلیغ کے تحت فرماتے ہیں: اگر بفرض محال کسی ایک چیز کی تبلیغ میں بھی آپ سے کوتاہی ہوئی تو بحیثیت رسول (خدائی پیغامبر) ہونے کے رسالت و پیغام رسانی کا جو منصب جلیل آپ کو تفویض ہوا ہے، سمجھا جائے گا کہ آپ نے اس کا حق کچھ بھی ادا نہ کیا۔" (حاشیہ ترجمہ حضرت شیخ الہند)

۹۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ تحریر فرماتے ہیں: اس ادائے فرض کے لئے کسی کی جانب سے نہ مطالبہ شرط ہے اور نہ جستجو لازم بلکہ یہ نبی اور رسول کا براہ راست فرض ہے جس کے لئے خدا تعالیٰ نے اس کو منتخب اور مامور کیا ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی اگر وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو گویا اپنے فرض کی پوری عمارت کو اپنے ہاتھ سے برباد کرتا ہے یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک اگر تم نے ایسا نہ کیا تو منصب رسالت کو ادا نہ کیا۔ (قصص القرآن جلد۴)

۱۰۔ علامہ عبدالحق حقانی لکھتے ہیں: واضح ہو کہ انبیاء کے عقائد اور تبلیغ اور فتوی میں

عمداً یا سہواً خطا واقع ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں۔تمام اہل اسلام ان تینوں باتوں میں معصوم ہونے کے مقر ہیں۔ہاں ان کے افعال وعادات میں کچھ اقوال ہیں الخ

(تفسیر حقانی جلد۲ سورۃ بقرہ)

۱۱۔ علامہ سید آلوسی مصری آیت اما ینسینک الشیطان کے تحت لکھتے ہیں:

و منعت ذلک طائفة من العلماء فی الافعال البلاغیة والعبادات کما اجمعوا علی منعه واستحالته علیه صلی الله علیه وسلم فی الاقوال البلاغیة واجابوا عن الظواهر الواردة فی ذلک والیه مال الاستاذ ابو اسحق الاسفرائینی وصحح النووی الاول فان ذلک لاینا فی النبوة و اذا لم یقر علیه لم یتحصل منه مفسدة ولا ینافی لامر بالاتباع بل یحصل منه فائدة و هو بیان احکام الناس و تقرر الاحکام (تفسیر روح المعانی ج ۲۳) اور علماء کی ایک جماعت نے افعال بلاغیہ (جن سے مقصد تبلیغ احکام ہے) اور عبادات میں بھی سہو ونسیان کو ممتنع قرار دیا ہے جیسا کہ ان کا اس بات پر اجماع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اقوال بلاغیہ میں (جن سے تبلیغ احکام خداوندی مقصود ہے) سہو ونسیان ممتنع اور محال ہے اور اس بارے میں جو ظاہری روایات (اس کے خلاف) وارد ہیں ان کا انہوں نے جواب دیا ہے اور اسی طرف استاذ ابو اسحٰق اسفرائینی کا میلان ہے اور علامہ نووی (شارح صحیح مسلم شریف) نے پہلے قول کو صحیح قرار دیا ہے (یعنی افعال بلاغیہ میں سہو جائز ہے) کیونکہ یہ امر نبوت کے منافی (اور مخالف) نہیں ہے اور جب اس سہو پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم قائم نہیں رہتے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں تنبیہ ہو جاتی ہے تو اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی اور نہ یہ آپ کی اتباع کے خلاف ہے بلکہ اس سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے اس نسیان وسہو کی وجہ سے نسیان کے احکام بیان اور مقرر ہو جاتے ہیں)

(۱۲) امام قرطبیؒ فرماتے ہیں: و منعت طائفة من العلماء السهو علیه فی

الافعال البلاغیة والعبادات الشرعیة کما منعوه اتفاقاً فی الاقوال البلاغیة و اعتذروا عن الظواهر الواردة فی ذلک والیه مال الاستاذ ابو اسحق الخ

(تفسیر قرطبی)

"اور افعال بلاغیہ اور عبادات شرعیہ میں بھی علماء کی ایک جماعت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سہو ہونے کو ممتنع (محال) قرار دیا ہے جس طرح انہوں نے اقوال بلاغیہ میں سہو کے ممتنع ومحال ہونے پر اتفاق کیا ہے اور اس بارے میں جو ظاہری روایات منقول ہیں ان کے متعلق عذر پیش کر دیا ہے اور اسی قول کی طرف استاد ابو اسحٰق اسفرائینی مائل ہوئے ہیں (یعنی اقوال بلاغیہ کی طرح افعال بلاغیہ میں بھی سہو نہیں ہو سکتا)"

(۱۳) تفسیر خازن میں آیت: وما ارسلنا من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیته کے تحت لکھتے ہیں:۔ قد قامت الدلائل علی صدقه و اجمعت الامة فیما کان طریقة البلاغ انه معصوم فیه من الاخبار عن شیئ منه بخلاف ماهو به لا قصداً ولا عمداً ولا سهواً ولا غلطاً قال الله تعالیٰ وما ینطق عن الهوی الخ "بلاشک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق پر دلائل قائم ہو چکے ہیں اور امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو باتیں تبلیغ کے ذریعہ امت تک پہنچائی ہیں ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے معصوم ہیں کہ آپ واقعہ کے خلاف کوئی خبر دیں اور اس میں حضور ﷺ سے نہ قصداً اور عمداً کوتاہی ہو سکتی ہے اور نہ سہو وغلطی سے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آپ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے۔"

(۱۴) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:۔"البتہ احکام الٰہی پہنچانے میں سہو جائز نہیں ہے کہ امر کی جگہ نہی اور نہی کی جگہ امر کر دیں اور بعض محققین اہل سنت نے لکھا ہے کہ انبیاء کو سہو بہ سبب کمال استغراق حضور اور مشاہدے سے ہوتا ہے اور عوام امت کو پریشان خاطری اور امور دنیوی سے یعنی صورت سہو کی مشترک ہے اور اس کی کمیت یعنی چگونگی وسبب میں تفاوت ہے۔" اسی واسطے کہا ہے

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(تحفہ اثناعشریہ مترجم ص ۱۵۵)

(ب) کسی نبی نے رسالت سے استعفاء نہیں کیا اور کوئی ادائے حکم الٰہی میں عذر نہیں لایا یہی مذہب اہل سنت کا ہے۔ امامیہ کہتے ہیں کہ بعض اولوالعزم پیغمبروں سے ایسے ہیں جنہوں نے رسالت سے معافی چاہی اور سبب اور ٹالنے کی باتیں پیش کی ہیں اور عذر کئے ہیں (ایضاً ص ۳۱۹)

(۱۵) قاضی عیاضؒ محدث آیات بلغ ما انزل الیک من ربک وغیرہ کے تحت فرماتے ہیں:

فاعلم وفقنا الله وایاک انه صلی الله علیه وسلم لا یصح ولا یجوز علیه ان لا یبلغ ولا ان یخالف امر ربه ولا ان یشرک به ولا ان یتقول علی الله مالا یجب او یفتری علیه او یضل او یختم علی قلبه او یطیع الکافرین الخ.

(الشفاء بتعریف حقوق المصطفی عربی جلد ۲ ص ۲۵۴)

ترجمہ: پس خدا ہم کو اور تجھ کو توفیق عطا فرمائے۔ معلوم کرنا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ امر جائز نہیں ہے کہ آپ احکام الٰہی نہ پہنچائیں (یا اس میں کوئی امر پوشیدہ رکھیں) اور اپنے رب کے حکم کی مخالفت کریں اور آپ اس کا کسی کو شریک ٹھہرا دیں اور آپ اللہ پر کوئی ایسی بات کہیں جس کا کہ اس نے آپ کو حکم نہیں کیا اور یہ کہ آپ اس پر بہتان باندھیں یا آپ گمراہ ہوں یا کسی کو گمراہ کریں یا آپ کے قلب مبارک پر مہر کی جاوے یا آپ کافروں کی اطاعت کریں۔ لیکن تبلیغ مخالفین میں مکاشفہ اور بیان کے ساتھ آپ کے کام کو آسان فرمایا ہے اور یہ کہ اگر آپؐ کا احکام الٰہی کو پہنچا دینا اس طرح نہ ہو تو گویا آپؐ نے احکام الٰہی کو پہنچایا ہی نہیں الخ۔

(شمیم الریاض ترجمہ شفاء قاضی عیاض جلد دوم ص ۱۱۶)

(ب) قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں:

واما اقواله صلی الله علیه وسلم فقد قامت الدلائل الواضحة بصحة المعجزة علی صدقه واجمعت الامة فیما کان طریقة البلاغ انه معصوم فیه من الاخبار عن شیئ منها بخلاف ما هو به لا قصداً ولا عمدًا ولاسهواً ولا غلطاً. (الشفاء عربی جلد دوم ص ۲۸۵)

ترجمہ: اور رہے اقوالِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سو صحت معجزہ کے ساتھ ان کے صدق پر بھی دلائل واضح قائم ہو چکے ہیں اور تمام امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ تمام ان امور میں جو کہ از طریق بلاغ ہیں (یعنی تبلیغ رسالت کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں) آپ اس امر سے بھی معصوم اور بری ہیں کہ آپ کسی امر میں کوئی خبر خلاف واقعہ بیان کریں نہ قصداً اور عمداً اور نہ سہواً اور غلطاً۔

(شمیم الریاض ج ۲ ص ۱۳۶)

(ج) تبلیغ رسالت میں سہو نہ ہونے پر قاضی عیاض محدثؒ مفصل تحریر فرماتے ہیں۔ ہم صرف اسی پر بھروسہ کرتے ہیں جس پر کہ تمام مسلمانوں کا اجماع واقع ہے کہ تبلیغ شریعت اور اعلام (یعنی بتلانے) ان امور میں جن کی آپ نے اپنے رب کی طرف سے خبر دی ہے اور اس امر میں جو پروردگار عالم نے آپ پر وحی کی ہے یہ امر جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے خلاف خبر دیں نہ عمداً اور نہ سہواً اور نہ خطاً اور نہ حالت محبت میں اور نہ حالت مرض میں۔ اور حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ میں ہے کہ میں نے کہا کہ کیا یارسول اللہ میں آپ سے ہر بات جو سنا کروں لکھ لیا کروں تو آپؐ نے فرمایا کہ ہاں۔ میں نے عرض کیا کہ رضا میں بھی اور غصہ میں بھی۔ تو آپؐ نے فرمایا ہاں کیونکہ میں ان سب حالتوں میں وہی بات کہتا ہوں جو حق ہوتی ہے اور ہم دلیل معجزہ کو جس کی جانب ہم اول اشارہ کر آئے ہیں کچھ اور زیادہ بیان کرنا چاہتے ہیں تو ہم لکھتے ہیں کہ جب ان کے صدق پر معجزہ قائم ہو چکا اور یہ بات معلوم ہوگئی کہ آپ وہی بات فرماتے ہیں جو حق اور صدق ہے اور آپ خدا کی

جانب سے وہی بات پہنچاتے ہیں جو سچی ہے اور یہ معجزہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس قول کے قائم مقام ہے کہ میرا بندہ ان سب امور میں سچا ہے جو میری طرف سے ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمہاری طرف خدا کا رسول ہوں تاکہ میں تم کو وہ احکام پہنچاؤں جن کے ساتھ کہ میں بھیجا گیا ہوں اور میں تم سے اس امر کو بیان کروں جو مجھ پر نازل ہوا ہے اور وہ اپنی خواہش[۱] اور چاؤ سے کوئی بات نہیں کرتے جو کچھ کہتے ہیں وہ سب وحی ہے جو ان پر وحی کیا گیا ہے اور تمہارے پاس[۲] تمہارے رب کی طرف سے رسول سچ لے کر آیا ہے اور جو کچھ تم کو رسول دے[۳] سو اس کو قبول کرو اور جس سے وہ منع کرے اس سے باز رہو۔ تو اس باب میں یہ امر جائز نہیں ہے کہ ان سے کوئی امر ان کی خبر کے خلاف ظاہر ہو۔ چاہے جس وجہ سے بھی کیوں نہ ہو (نہ عمداً اور نہ سہواً) اور اگر ہم ان پر غلطی اور سہو کو جائز رکھیں گے تو ہم کو نبی اور غیر نبی کی خبروں میں امتیاز باقی نہ رہے گا۔ اور سچ اور جھوٹ باہم مخلوط ہو جائے گا اور معجزہ اس امر کو مشتمل ہے کہ نبی علیہ السلام کی کسی تخصیص کے مطلقاً تصدیق کرنا ضرور ہے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سب باتوں سے معصوم اور منزہ جاننا دلیلاً بھی جائز اور لازم ٹھہرا اور اجماعاً بھی جیسا کہ ابو اسحٰق اسفرائینی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

(شمیم الریاض اردو۔ ج ۲ ص ۱۳۷، الشفاء عربی جلد دوم ص ۲۸۵)

(د) انبیاء کرام علیہم السلام کے افعال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’پھر اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ افعال جو از طریق بلاغ اور تقریر شرع ہیں اور جن کے کرنے کے ساتھ احکام شرع اور تعلیم امت متعلق ہے اور جن کی اتباع کا امت سے مؤاخذہ کیا جاتا ہے اور دوسرے وہ افعال جو اس سے خارج اور آپ کی ذات اقدس کے ساتھ مخصوص ہیں (یعنی وہ افعال جو از

---

(۱) آیت وما ینطق عن الهوى ان هو الا وحي يوحى (سورۃ النجم)
(۲) آیت قد جاء کم الرسول بالحق من ربکم (سورۃ النساء آیت ۱۷۰)
(۳) آیت وما اتاکم الرسول فخذوه وما نهاکم عنه فانتهوا (سورۃ الحشر آیت ۷)

طریق بلاغ اور تقریر شرع نہیں ہیں بلکہ وہ افعال ہیں جو انبیاء کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں) سو علماء کی ایک جماعت کے نزدیک ان دونوں اقسام میں سے پہلی قسم کا وہی حکم ہے جو اس باب میں سہو فی القول کا حکم ہے اور اس اتفاق کو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ممتنع ہے اور آپ اس سے معصوم اور منزہ ہیں کہ آپ پر اس کا طاری ہونا قصداً یا سہواً جائز ہو۔ تو ایسا ہی انہوں نے کہا ہے کہ اس باب میں افعال میں بھی آپ پر مخالفت کا طاری ہونا جائز نہیں ہے نہ عمداً اور نہ سہواً کیونکہ وہ بھی من حیث التبلیغ قول اور ادا کے معنی ہیں اور ان حضرات کے افعال پر ایسے عوارض کا طاری ہونا تشکیک اور طعن کا موجب ہے اور ان علماء نے احادیث سہو سے بہت سی توجیہات کے ساتھ عذر کیا ہے جن کو ہم اس کے بعد ذکر کریں گے اور ابو اسحٰق اسفرائینی اسی طرف مائل ہوئے ہیں اور فقہاء اور متکلمین میں سے اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ افعال بلاغیہ اور احکام شرعیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخالفت کا صادر ہونا سہواً اور بلا قصد کے جائز ہے جیسا کہ ان احادیث سے ثابت ہوا جو سہو نماز میں وارد ہوئی ہیں اور ان حضرات نے افعال شرعیہ اور اقوال بلاغیہ کے درمیان فرق کیا ہے۔‘‘

(شمیم الریاض ج ۲ ص ۱۷۱۔ الشفاء عربی جلد ۲ ص ۳۴۰)

قاضی عیاض محدث کی مندرجہ بالا عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بارے میں تو سب کا اجماع ہے کہ تبلیغ امت کے متعلق جو اقوال ہیں ان میں انبیاء کرام علیہم السلام سے سہو کا صدور محال ہے۔ لیکن تبلیغ امت کے لئے انبیاء کرام کے جو افعال ہیں جن کا تعلق شریعت سے ہے ان میں اختلاف ہے بعض علماء اس میں سہو کو جائز قرار دیتے ہیں اور ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سہو لاحق ہوا ہے لیکن امام ابو اسحٰق اسفرائینی اور ان کے ہم مسلک علماء اس میں بھی مثل تبلیغی اقوال کے سہو

کو جائز نہیں قرار دیتے اور احادیث سہو کی تاویل کرتے ہیں۔

حدیث ذوالیدینؓ:

احادیث سہو میں سے ایک حدیث ذوالیدینؓ ہے جو حسب ذیل ہے:

قال ابوهريرة رضي الله عنه صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم صلوة العصر فسلم في الركعتين فقام ذواليدينؓ فقال يارسول الله اقصرت الصلوٰة ام نسيت. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم كل ذلك لم يكن وفي الرواية الاخرى ماقصرت الصلوة ومانسيت. (الشفاء جلد دوم عربی ص ۳۱۶)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور اس میں آپ نے دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو ذوالیدین رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ! کیا نماز قصر ہوگئی یا آپ بھول گئے ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ نماز نہ قصر ہوئی اور نہ میں بھولا''
(شمیم الریاض، ج ۲، ص ۵۵)

قاضی عیاض محدثؒ اس حدیث کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ...... ''میرے نزدیک آپ ﷺ کے قول (نماز نہ قصر ہوئی، نہ میں بھولا) میں نسیان ترک کے معنی میں ہے جو ایک وجہ ہے نسیان کی، اس کلام سے آپ نے واللہ اعلم یہ مراد لی ہے کہ میں نے دو رکعت پر سلام (اس لئے) نہیں پھیرا کہ میں کمال صلوۃ کا ترک کرنے والا ہوں اور لیکن میں بھول گیا ہوں اور یہ بھولنا میری طرف سے نہیں ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں بھولتا نہیں ہوں یا میں بھلایا جاتا ہوں تاکہ میں اس کو سنت مقرر کروں''
(شمیم الریاض جلد ۲ ص ۲۵۸ الشفاء عربی ج ۲ ص ۳۲۰)

سہو، نسیان اور کوتاہی کا فرق:

اہل لغت کے ہاں سہو اور نسیان میں بھی فرق ہے چنانچہ المنطوق لمعرفة الفروق میں ہے:

النسيان زوال الشيئ عن الحافظة والمدركة والسهو زواله عن الحافظة فقط.

نسیان یہ ہے کہ حافظہ اور قوت مدرکہ دونوں سے کوئی چیز نکل جائے اور سہو صرف حافظہ سے نکل جانے کو کہتے ہیں، اور قاضی عیاض محدث حدیث زیر بحث کے تحت سہو اور نسیان میں فرق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان النبي صلى الله عليه وسلم كان يسهو ولاينسى ولذلك نفى عن نفسه النسيان. قال لان النسيان غفلة وآفة والسهو انما هو شغل قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يسهو في صلٰوته ولا يغفل عنها وكان يشغله عن حركات الصلوٰة ما في الصلوٰة مشغلا بها لا غفلة عنها. (الشفاء عربی ج ۲ ص ۳۲۰)

ترجمہ: نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سہو تو ہوتا تھا اور نسیان نہ ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے نفس اقدس سے نسیان کی نفی فرمائی ہے۔ کہا ہے کہ نسیان غفلت اور آفت ہے اور سہو اشتغالِ حال ہے۔ کہا ہے کہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں سہو کرتے تھے اور اس سے غافل نہ ہوتے تھے اور مشغل صلوۃ کے سبب آپ حرکات نماز سے مشغول ہوجاتے تھے۔ یہ نہ تھا کہ ازراہِ غفلت اس سے مشغول ہوجاتے تھے۔ سو اگر یہ قول اس معنی پر ثابت ہوجائے تو آپ کے قول کہ ما قصرت الصلوة ولا نسيت (نہ نماز قصر ہوئی اور نہ میں بھولا) میں خلف المعقول (یعنی بات کا خلاف واقع ہونا لازم نہ

آئے گا۔الخ) (شمیم الریاض، جلد نمبر ۲، صفحہ ۱۵۸)

مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز میں بھول جانا غفلت کی بناء پر نہ تھا بلکہ آپ ﷺ نماز ہی کے کسی عمل میں اس قدر مشغول ہو گئے تھے کہ اس کی وجہ سے سہو ہو گیا اور یہ یاد نہ رہا کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔ بہر حال نسیان ہو یا سہو دونوں میں بھول جانا پایا جاتا ہے۔ جو اقوال بلاغیہ میں ممتنع اور محال ہے لیکن افعال بلاغیہ میں بعض کے نزدیک جائز ہے یعنی سہو ہو سکتا ہے۔ لیکن خطا ان دونوں کے علاوہ ہے۔ جس میں بھولنا نہیں پایا جاتا بلکہ ایک فعل جو قصد و ارادہ سے کیا جاتا ہے اس میں کوئی قصور اور نقص رہ جاتا ہے۔ چنانچہ امام راغب اصفہانیؒ خطا کی ایک قسم یہ لکھتے ہیں: ان یرید ما یحسن فعله ولكن يقع منه خلاف مايريد الخ (مفردات القرآن) یعنی ارادہ تو ٹھیک کام کرنے کا ہوتا ہے لیکن اپنے ارادہ کے خلاف اس کام میں کوئی غلطی ہو جاتی ہے اور یہ خطاء امت سے معاف ہے بلکہ مجتہد کو اس قسم کی خطا پر بھی ایک اجر ملتا ہے۔

والحاصل ان احدا من اهل السنة لم يجوز ارتكاب المنهى منهم عن قصد ولكن بطريق السهو والنسيان ويسمى ذلك زلة.

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے اگر زلت (لغزش) کا صدور ہوتا ہے تو اس کی وجہ یا خطائے اجتہادی ہوتی ہے یا نسیان (بھول جانا) یا دو مباح اور جائز صورتوں میں سے بہتر صورت کو ترک کرنا ہوتا ہے لیکن اس بات پر سب کا اجماع ہے کہ جن اقوال کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے ان میں سہو کا پایا جانا بھی محال ہے اور افعال بلاغیہ میں گو اختلاف ہے لیکن ان میں بھی محققین کی ایک جماعت کے نزدیک سہو محال[1] ہے۔ لہٰذا تبلیغ رسالت میں خطا اور کوتاہی کا پایا جانا تو بطریق اولیٰ محال ہوگا۔ کیونکہ نسیان

(۱) علاوہ ازیں اس میں بھی علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ جن اقوال و افعال کا تعلق فریضہ رسالت اور تبلیغ امت سے نہیں ہے اس میں بھی انبیاء کرام علیہم السلام کو سہو و نسیان لاحق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن یہ بحث چونکہ ہمارے اس موضوع سے خارج ہے اور طوالت کا بھی خوف ہے اس لئے یہاں اس کو ترک کر دیا گیا ہے۔

و سہو میں تو اختیار کا دخل نہیں۔ لیکن خطاء میں اختیار بھی پایا جاتا ہے تو جب تبلیغ رسالت میں بھول جانا محال ہے تو خطا و کوتاہی کیونکر محال نہ ہوگی۔ لہٰذا ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ حسب ذیل عبارت عصمت انبیاء کے بارے میں اہل السنّت والجماعت کے اجتماعی عقیدہ کے بالکل خلاف اور توہین منصب نبوت پر مبنی ہے کہ:

''حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں'' الخ (تفسیر تفہیم القرآن ج ۲ سورۃ یونس حاشیہ ص ۳۱۲)

حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق مذکورہ عبارت کی مفصل بحث علمی محاسبہ سے مطالعہ فرمائیں۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے جس لغزش اور کوتاہی کے علماء قائل ہیں اس کا تعلق فریضہ رسالت سے نہیں ہوتا۔ فریضہ رسالت میں کوتاہی ماننے والے کے متعلق تو قاضی عیاض محدث نے قتل کر دینے کا فتویٰ جاری کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

(کوئی شخص) مثلاً کہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گناہ کبیرہ صادر ہوا ہے۔ یا آپ نے تبلیغ رسالت یا تبلیغ احکام میں کوتاہی کی ہے کہ آپ نے جیسا کہ چاہیے تھا لوگوں کو احکام الٰہی نہیں پہنچائے اس وجہ کا بھی وہی حکم ہے جو پہلی وجہ کا ہے کہ یہ شخص بلا تاخیر قتل کر دیا جائے۔'' (نسیم الریاض ج ۲ ص ۲۷۸۔ الشفاء عربی جلد دوم ص ۵۰۸ فصل رابع)

اللہ تعالیٰ مفتی محمد یوسف صاحب اور ان کے امام ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو انبیاء معصومین علیہم السلام کے متعلق اس قسم کے عقائد باطلہ سے توبہ کرنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین

۱۶۔ مندرجہ بالا عنوان کے تحت سب سے آخر میں امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق پیش کی جارہی ہے جو اپنے دور میں سنی و شیعہ نزاعی مسائل میں مجتہدانہ بصیرت رکھتے ہیں اور عصمت انبیاء کے مسئلہ میں بھی آپ

نے شیعوں کے عقیدہ تقیہ وغیرہ کو پیش نظر رکھ کر حسب ذیل جامع تبصرہ تحریر فرمایا ہے:

''تبلیغ کے دو جزء ہیں۔ ان دونوں سے مل کر تبلیغ کا کام پورا ہوتا ہے پہلا جزء تبلیغ کا وحی الٰہی کا تحمل ہے یعنی وحی الٰہی کو صحیح طور پر سمجھ لینا پھر قوت حافظہ میں بے کم و کاست بے تغیر وتبدل اس کو محفوظ کرلینا۔ دوسرا جزء تبلیغ کا وحی الٰہی کو ادا کرنا ہے یعنی وحی الٰہی کو صاف صاف لوگوں کے سامنے بیان کردینا، اس کے بیان میں کسی سے نہ ڈرنا، کسی مانع اور مزاحم سے متاثر نہ ہونا، تقیہ نہ کرنا، انبیاء علیہم السلام کا گناہوں سے اور ہر قسم کی خطاؤں سے اور سہو ونسیان وغیرہ سے معصوم ہونا، زیادہ تر اسی سبب سے ضروری ہے کہ تبلیغ کے دونوں جزء امر باطنی میں جن کو کوئی انسان ادراک نہیں کرسکتا۔ ان دونوں کاموں میں سے کسی کام میں اگر نبی سے غلطی ممکن ہو تو اس غلطی کا پتہ نہیں چل سکتا، وحی الٰہی کے سمجھنے میں، یاد رکھنے میں، بیان کرنے میں، کسی قسم کی خرابی ہوجائے تو کون اس خرابی کو معلوم کرسکتا ہے، نبی اپنی کسی مصلحت یا کسی خوف سے کوئی حصہ پیغام الٰہی کا چھپا ڈالے تو کسی کو کیا خبر ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ حضرات انبیاء سے نہ تحمل (یعنی وحی لینے) میں غلطی ممکن ہو نہ ادا میں، بلکہ ان میں تمام وہ اوصاف بدرجہ کمال پائے جاتے ہوں جن سے مخلوق کو کامل اطمینان اس بات کا حاصل ہو کہ تحمل اور ادا دونوں کام ان سے باحسن وجوہ انجام پائیں گے۔ **ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔**

(ماہنامہ النجم لکھنو رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ ص ۲۲)

انبیاء کرام خواہش نفس سے پاک ہیں:

(۱) علامہ آلوسی مصریؒ آیت ومانطق عن الھوٰی کے تحت لکھتے ہیں:

والمتبادر من الخطاب ان جمیع ماینطق به علیه الصلوة والسلام من ذلک لیس عن القاء الشیطان کمانه لیس من هوی . اور اس خطاب سے فوراً یہی مفہوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بھی ارشاد فرماتے ہیں وہ جس

طرح خواہش نفس کی بنا پر نہیں ہوتا اسی طرح القائے شیطان کی وجہ سے بھی نہیں ہوتا۔

۲۔ علامہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ای مایقول قولاً عن هویً وغرض ای انما یقول ما امر به یبلغه الی الناس کاملاً موفوراً من غیر زیادة ولا نقصان (تفسیر ابن کثیر)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش نفس اور غرض کی وجہ سے نہیں فرماتے۔ یعنی وہی فرماتے ہیں جس کا آپ کو حکم دیا جاتا ہے اور اس کو لوگوں تک کامل طور پر پورا پورا پہنچا دیتے ہیں، نہ اس میں زیادتی کرتے ہیں اور نہ کمی۔

۳۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

لم یتقول القرآن من تلقاء نفسه کما یتقول الشعراء وکذا کل مایتکلم لیس منشأه الهوی النفسانیة بل مستند الی الوحی جلی اوخفی وان کان باجتهاد مامور من الله تعالی مقرر من الله علیه فهو لیس عن هوی البتة.

(تفسیر مظہری)

یعنی آپ نے قرآن اپنی طرف سے بنا کر نہیں پڑھا جیسا کہ شعراء خود اپنا کلام بناتے ہیں اور اسی طرح آپ جو کلام بھی فرماتے ہیں اس کا منشا نفسانی خواہش نہیں ہے بلکہ اس کی سند وحی جلی یا خفی ہے اور اگر آپ کی بات اجتہاد پر مبنی ہے جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے وہ بھی قطعاً خواہش نفس کی بنا پر نہیں ہوتا)

۴۔ امام شعرانیؒ فرماتے ہیں:

فان قلت فماالفرق بین العصمة والحفظ (فالجواب) الفرق بینهما ان الانبیاء معصومون من المباح لهوی انفسهم بخلاف الاولیآء فاذا فعل الانبیاء المباح لایفعلونه لهوی نفوسهم کغیرهم وانما یفعلونه علی جهة التشریع انه مباح فهو واجب

علیهم حینئذ یعنی فعل المباح اذالتبلیغ واجب علیهم. ذکره الشیخ محی الدین فی آخر باب سجود التلاوة من الفتوحات المکیة. (الیواقیت والجواھرج ۲ص ۱۵۵)

"پس اگر تو کہے کہ عصمت اور حفظ کے درمیان کیا فرق ہے (یعنی معصوم اور محفوظ کسے کہتے ہیں؟) تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے مابین فرق یہ ہے کہ انبیاء کرام مباح[1] کام کرنے میں بھی اپنے نفسوں کی خواہش سے بھی معصوم ہوتے ہیں بخلاف اولیاء کے (کہ ہوسکتا ہے کہ ان کا کوئی کام نفس کی خواہش پر مبنی ہو) پس جب انبیاء کرام کوئی مباح فعل (کام) کرتے ہیں تو دوسروں کی طرح وہ اپنی نفسانی خواہش کی بناپر نہیں کرتے (بلکہ) وہ مباح کام بھی اس کی شرعی حیثیت بتانے کے لئے کرتے ہیں (تاکہ لوگ جان لیں کہ یہ کام گو فرض و واجب نہیں لیکن مباح اور جائز ہے۔ ورنہ پیغمبر علیہ السلام یہ کام نہ کرتے) پس اس وقت مباح فعل اس کی شرعی حیثیت بتانے کے لئے ان پر واجب ہوتا ہے کیونکہ ان پر تبلیغ واجب ہوتی ہے اس کو شیخ محی الدین ابن عربی نے فتوحات مکیہ کے آخری باب سجود و تلاوت میں ذکر کیا ہے۔" (الیواقیت والجواہر جلد دوم)

۵۔ انبیاء کرام علیہم السلام کو تو مقام عصمت و نبوت حاصل ہے کہ ان میں خواہش نفس کا دخل ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ تو صدیق کے بارے میں بھی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"صدیق وہ ہے کہ قوت نظریہ اس کی مثل قوت فطری انبیاء کے کامل ہوتی ہے اور ابتدائے عمر سے جھوٹ بولنے اور دورنگی بات سے دور رہے اور بیچ امور دین کے خاص خدا کے واسطے کوشش کرے کہ ہرگز خواہش نفس کو دخل نہ ہوالخ (تفسیر عزیزی سورۃ الفاتحہ زیر آیت الذین انعمت علیہم)

---

(۱) مباح وہ فعل ہے جو صرف جائز ہوتا ہے (نیکی اور عبادت میں شمار نہیں ہوتا) اس کے کرنے پر ثواب نہیں ملتا اور نہ کرنے پر گناہ نہیں ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام ایسے مباح کام بھی خواہش نفس کی بناپر نہیں کرتے۔

انبیاء کرام علیہم السلام صغیرہ کبیرہ ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہیں:

۱۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں:

وقال جمهور من الفقهآء من اصحاب مالکؒ وابی حنیفةؒ والشافعیؒ انهم معصومون من الصغائر کلها کعصمتهم من الکبائر اجمعها لانا امرنا باتباعهم فی افعالهم وآثارهم وسیرتهم امراً مطلقاً من غیر التزام قرینة فلوجوزنا علیهم الصغائر لم یکن الاقتداء بهم اذ لیس کل فعل من افعالهم یتمیز مقصده من القربة والاباحة اوالحظر اوالمعصیة ولایصح ان یؤمر المرء بامتثال امر لعله معصیة لاسیما علی من یری تقدیم الفعل علی القول اذا تعارضا من الاصولیین. قال الاستاذ ابواسحق الاسفرائینی واختلفوا فی الصغائر والذی علیه الاکثرون ان ذلک غیرجائز علیهم وصار بعضهم ای تجویزها ولااصل لهذه المقالة" (تفسیر قرطبی)

"امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اصحاب میں سے جمہور فقہاء کا یہ قول ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام صغائر سے بھی بالکلیہ اس طرح معصوم ہیں جس طرح تمام کبائر سے ہیں (یعنی عمداً اور سہواً کسی طرح بھی ان سے کبیرہ، صغیرہ سرزد نہیں ہوسکتا) اس لئے کہ ہمیں ان کے افعال، آثار اور سیرتوں کی اتباع کا بغیر کسی قرینہ کے التزام کے مطلقاً حکم دیا گیا ہے۔ پس اگر ہم ان سے صغائر کا صدور جائز قرار دیں گے تو پھر ہمارے لئے ان کی اقتداء (اتباع) ممکن ہی نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں ان کے کسی فعل کا مقصد متمیز نہیں ہوسکے گا کہ ان کا یہ فعل نیکی اور اباحت کا حکم رکھتا ہے یا ممنوع اور معصیت ہونے کا اور یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا کہ آدمی کو ایسے فعل کی اتباع کا حکم دیا جائے جن کے بارے میں یہ احتمال ہو کہ وہ معصیت (اور گناہ) ہے۔

استاد ابو اسحٰق الاسفرائینی فرماتے ہیں کہ صغیرہ گناہوں کے بارے میں اختلاف ہے، اکثر علماء کے نزدیک (انبیاء کرام سے صغائر کا صدور بھی ناجائز ہے اور بعض اس کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن اس قول کی کوئی بنیاد نہیں ہے)

۲۔ امام رازیؒ عصمت انبیاء کے بارے میں متعدد اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

والمختار عندنا انه لم يصدر عنهم الذنب حال النبوة البتة لاالكبيرة ولاالصغيرة ان الرسول افضل من الملك فوجب ان لايصدر الذنب من الرسول الخ (تفسیر کبیر پارہ اول زیر آیت ولاتقربا هذه الشجرة فتكونا من الظلمين) اور ہمارے نزدیک مختار (اور راجح) مذہب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے زمانہ نبوت میں بالکل گناہ کا صدور نہیں ہوتا، خواہ کبیرہ ہو یا صغیرہ۔ (اس کے بعد امام رازی نے عصمت انبیاء پر ۱۵ دلائل قائم کئے ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ) پیغمبر فرشتہ سے افضل ہوتے ہیں اس لئے لازم ہے کہ ان سے کوئی گناہ صادر نہ ہو (جس طرح کہ فرشتوں سے کسی قسم کا گناہ صادر نہیں ہوسکتا)

۳۔ امام ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں الانبياء احق بالعصمة من الملائكة. ان الحق سبحانه وتعالى سمى ترك الافضل منهم معصية لعلو شانهم (نبراس، ص ۲۵۴)

"انبیاء کرام بہ نسبت فرشتوں کے زیادہ عصمت کے لائق ہیں (اس لئے ان سے کسی قسم کے گناہ کا صدور نہیں ہوسکتا) اور اللہ تعالیٰ نے ان کی بلند شان کے تحت ان کے ترکِ افضل کو معصیت سے تعبیر فرمایا ہے (ورنہ وہ معصیت سے پاک ہیں)

۴۔ جمع من العلماء فذهبوا الى العصمة عن الصغائر والكبائر قبل الوحى وبعده وهو مختار ابى المنتهى شارح الفقه الاكبر

والشيخ عبدالحق محدث الدهلوى الخ (ایضاً نبراس)

"علماء کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء کرام وحی سے پہلے اور وحی کے بعد صغائر اور کبائر سے بالکل معصوم ہیں اور ابوالمنتہیٰؒ شارح فقہ اکبر اور شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔"

۵۔ علامہ علی قاری حنفیؒ المتوفی ۱۰۱۴ھ فرماتے ہیں:

والانبياء عليهم السلام كلهم منزهون اى معصومون عن الصغائر والكبائر اى من جميع المعاصى والكفر خص لانه اكبر الكبائر ويكون سبحانه لايغفر ان يشرك به ويغفرمادون ذلك لمن يشآء والقبائح .... ثم هذه العصمة ثابتة للانبياء قبل النبوة وبعدها على الاصح الخ :

اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام صغیرہ اور کبیرہ تمام گناہوں سے پاک اور معصوم ہیں اور کفر اور برائیوں سے بھی۔ کفر کو خصوصیت سے اس لئے ذکر کیا ہے کہ یہ تمام کبائر سے بڑا ہے اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ شرک (اور کفر) کو ہرگز نہیں بخشے گا اور اس کے علاوہ گناہوں کو جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا پھر اصح قول یہ ہے کہ یہ عصمت (مطلقہ) انبیاء کے لئے نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد (ہر زمانہ میں) ثابت ہے" (شرح فقہ اکبر)

(ب) واما هو صلى الله عليه وسلم فكما قال الامام الاعظم لم يرتكب صغيرة ولاكبيرة واما قوله تعالى[1] عفا الله عنك لم اذنت لهم الأية وكذا قوله تعالى ماكان لنبى[2] ان يكون

(۱) سورۃ توبہ ع ۷ (ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو معاف تو کر دیا لیکن آپ نے ان کو ایسی جلدی اجازت کیوں دے دی تھی جب تک کہ آپ کے سامنے سچے لوگ ظاہر نہ ہو جاتے اور آپ جھوٹوں کو معلوم نہ کر لیتے (مولانا تھانویؒ)

(۲) سورۃ انفال ع ۹ (ترجمہ) نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کر دئے جائیں) جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح (کفار کی) خونریزی نہ کرلیں" (مولانا تھانویؒ)

له اسرى الآية فمحمول" على ترك الاولى (ایضاً شرح فقہ اکبر):

اورلیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے نہ صغیرہ سرزد ہوا ہے اور نہ کبیرہ اور لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ عفا الله عنك لم اذنت لهم الاية اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ ماكان لنبى ان يكون له اسرى تو یہ ترک اولی پر محمول کیا جائے گا (یعنی یہ باتیں معصیت اور گناہ نہیں ہیں بلکہ یہ ترکِ اولیٰ کی قسم کی ہیں کہ ایک معاملہ کے دونوں پہلو گو جائز تھے لیکن ان میں سے ایک بہتر اور افضل تھا جس کو چھوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا پہلو اختیار کیا جس پر بوجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ اور ارفع شان کے حق تعالیٰ کی طرف سے مؤاخذہ فرمایا گیا)

۶۔ ایضاً علامہ قاری حنفیؒ محدث فرماتے ہیں: اذالانبياء معصومون قبل النبوة وبعدها عن كبائر الذنوب وصغائرها ولوسهواً على ماهو الحق عندالمحققين وان كان الاكثرون على خلافه (مرقاۃ شرح المشکوۃ ج اول، ص ۱۲۷، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان): "انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد کبیرہ گناہوں سے اور صغیرہ گناہوں سے بھی معصوم ہیں اگرچہ سہواً ہی ہو۔ اور یہی بات محققین کے نزدیک حق ہے اگرچہ اکثر علماء اس کے خلاف ہیں (یعنی ان کے نزدیک سہواً صغیرہ کا صدور جائز ہے۔

۷۔ حضرت شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی المتوفی ۱۰۵۲ھ فرماتے ہیں:

"وعصمت ایشاں از جمیع گناہاں خرد و بزرگ پیش از نبوت و پس از وے ہمیں است قول مختار" (اللمعات شرح المشکوۃ)

اور مختار (اور راجح) قول یہی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد چھوٹے اور بڑے تمام گناہوں سے پاک ہیں)

۸۔ علامہ بحرالعلومؒ تحریر فرماتے ہیں:

ومنعه اى صدور الصغائر الغير الخسية الحنفية رضوان الله تعالى عليهم وهو الحق قال صغيرتهم كبيرتهم فى حقهم وان كانت صغيرة فى حقنا الاترى مباحات العوام سيئات الابرار وحسنات الابرار سيئات المقربين الخ (بحرالعلوم شرح مسلم الثبوت)

"اور علماء حنفیہ نے (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوں) انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے ہر قسم کے صغائر کو بھی ممتنع قرار دیا ہے اگرچہ وہ غیر خسیہ ہوں اور یہی قول حق ہے۔ کیونکہ ان کا صغیرہ بھی ان کے حق میں ان کا کبیرہ بن جاتا ہے اگرچہ وہ ہمارے حق میں صغیرہ ہی ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ عوام کے لئے جو باتیں مباح ہوتی ہیں وہ ابرار کے لئے برائیاں شمار ہوتی ہیں اور جو باتیں ابرار کے حق میں نیکیاں ہوتی ہیں وہ مقربین کے لئے برائیاں شمار ہوتی ہیں الخ

۹۔ حضرت مولانا عبدالعزیز فرہارویؒ مصنف نبراس الکلام فی عصمۃ الانبیاء کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

للمتكلمين فيها كلمات غير مرضية والمختار عندى انهم معصومون عن وساوس الشيطن وعن الكذب والكبائر والصغائر عمداً وسهواً قبل البعثة وبعدها وخلاصة الاستدلالات عليه ان البرية مامورة باتباعهم وايثار حبهم على حب الآباء والبنين وخضع الرقاب لهم والكف عن ذمهم واهانتهم والتخلق باخلاقهم الظاهرة والباطنة فهذا الكل يقتضى ان يكون غايته مايمكن فى البشر من المحاد المكارم والعفة والنزاهة حتى لايستنكف احد من التذلل لهم ولئلا يجد المتمرد المتعصب سبيلا الى الطعن فيهم۔

(مرام الکلام فی عقائد الاسلام ص ۳۲)

عصمت انبیاء کے بارے میں متکلمین کے بعض اقوال غیر پسندیدہ ہیں اور

میرے نزدیک مختار مذہب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام شیطانی وساوس سے بھی پاک ہیں اور کبائر اور صغائر سے بھی پاک ہیں خواہ عمداً ہوں یا سہواً۔ بعثت (نزول وحی) سے پہلے ہوں یا بعد میں اور اس مسلک کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ مخلوق کو انبیاء کی اتباع کا اور ان کی محبت کو اپنے آباؤ اجداد اور اپنی اولاد کی محبت پر غالب رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان باتوں کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ ان کی مذمت اور اہانت سے اپنے آپ کو بچائے، ان کے ظاہری اور باطنی اخلاق کے مطابق اپنے اخلاق سنوارے جائیں۔ پس ان سب باتوں کا یہ تقاضا ہے کہ انبیاء کرام میں بشری ممکن حد کمال تک خوبیاں اور بلند اوصاف اور عفت اور پاکیزگی پائی جائے تاکہ کوئی شخص بھی ان کے سامنے عاجزی اور جھکاؤ میں عار نہ سمجھے اور تاکہ کسی سرکش اور متعصب آدمی کو ان پر طعن کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

۱۰۔ الاستاذ الشیخ محمد عبدالرحمٰنؒ محلاوی حنفی قاضی محکمہ شرعیہ جامعہ از ہر مصر تحریر فرماتے ہیں (التحقیق) ان الانبیاء علیهم الصلوة والسلام معصومون لایصدر عنهم ذنب لاکبیرة ولاصغیرة لاعمداً ولاسهواً قبل النبوة وبعدها وماورد من ذلک یحمل علی انهم فعلوه بتاویل اوعلی ترک الاولی. والشارع اطلق اسم المعصیة علی الزلة مجازاً فی قوله تعالی وعصی آدم ربه ولیس المعنی انهم ذلّوا عن الحق بل زلوا عن الافضل الی الفاضل ویعاتبون به لجلالة قدرهم وتقترن الزلة بالتنبیه علی انها زلة. (تسهیل الوصول الی علم الاصول ص ۱۳۹)

''اور تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام معصوم ہیں، ان سے نہ کبیرہ گناہ صادر ہوتا ہے نہ صغیرہ۔ نہ عمداً اور نہ سہواً۔ نہ نبوت سے پہلے اور نہ نبوت کے بعد۔ اور جو باتیں اس طرح کی منقول ہیں تو انکا مطلب یہ لیا جائے گا کہ انہوں نے وہ فعل کسی تاویل کی بنا پر کیا ہے یا ترک اولی کا صدور ہوا ہے اور شارع یعنی اللہ تعالیٰ نے آیت وعصی آدم ربہ میں زلت پر جو معصیت کا

لفظ استعمال کیا ہے تو وہ مجازاً ہے اور زلت (لغزش) کا بھی یہ معنی نہیں ہے کہ وہ حق سے پھسلے ہیں بلکہ وہ افضل حالت سے فاضل حالت کی طرف پھسلے ہیں (یعنی دونوں صورتوں میں سے ایک بہتر تھی اور دوسری اس سے بھی زیادہ بہتر۔ لیکن انہوں نے زیادہ بہتر صورت کو چھوڑ کر اس سے کم بہتر کو اختیار کرلیا) اور اس میں ان پر مواخذہ ان کی بلند شان کے پیش نظر ہوتا ہے اور پھر اس لغزش کے صدور کے ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی ہوجاتی ہے کہ یہ لغزش ہے اور وہ اس ادنیٰ لغزش پر بھی قائم نہیں رہتے)

۱۱۔ امام شعرانیؒ فرماتے ہیں: قال ائمة الاصول الانبیاء علیهم الصلوة والسلام کلهم معصومون لایصدرعنهم ذنب ولوصغیرة سهواً ولایجوز علیهم الخطاء فی دین الله قطعاً وفاقاً للاستاذ ابی اسحق الاسفرائینی وابی الفتح الشهرستانی والقاضی عیاض والشیخ تقی الدین السبکی وغیرهم (الیواقیت والجواهر)

ائمہ اصول فرماتے ہیں کہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام معصوم ہیں ان سے کوئی گناہ بھی سرزد نہیں ہوتا اگرچہ سہواً صغیرہ ہی ہو اور اللہ کے دین میں قطعاً ان پر خطا جائز نہیں ہے اور یہ قول موافق ہے استاذ ابواسحٰق اسفرائینی، ابوالفتح شہرستانی، قاضی عیاض اور شیخ تقی الدین سبکی وغیرہ کے۔

۱۲۔ امام شعرانی شیخ ابوطاہر قزوینیؒ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقال الشیخ ابوطاهر القزوینی فی الباب الخامس والثلاثین من کتاب سراج العقول یجب تنزیه الانبیاء علیهم الصلوة والسلام عن کل یتبادر الی افهامنا من ذکر خطایاهم فان خطایاهم لاذوق لنافیها وان الله تعالی، اصطفی الانبیاء فی سابق علمه للنبوة واداء الرسالة وشمهم لذلک فی مبادی امورهم

وحماهم من مكائد الشيطان وصفى سرائرهم عن الكدورات وشرح صدورهم بنوره وزينهم بالاخلاق الجميلة وطهرهم عن الرجس والرذائل." (اليواقيت والجواهر)

شیخ ابوطاہر قزوینی نے اپنی کتاب سراج العقول کے باب ۳۵ میں یہ فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کو ہر قسم کی ان خطاؤں سے پاک سمجھنا واجب ہے جن کا ذکر کرنے سے ہمارے ذہنوں میں ان کے متعلق کوئی تصور پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی (شان کے مطابق) جو خطائیں ہیں ہمیں ان کا کوئی ذوق حاصل نہیں ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قدیم علم کے تحت ان کو نبوت اور رسالت کی ادائیگی کے لئے چن لیا ہے۔ ان کے ابتدائی کاموں میں اس کی ان کو تربیت دی ہے اور ان کو شیطان کے مکروں سے بچایا ہے اور ان کے باطنوں کو کدورتوں سے صاف کردیا ہے اور اپنے نور سے ان کے سینوں کو کھول دیا ہے اور ان کو اخلاق جمیلہ سے مزین کردیا ہے اور ناپاکی اور رذیل اخلاق سے ان کو پاک کردیا ہے" (الیواقیت والجواہر)

۱۳۔ امام شعرانی شیخ عارف باللہ عبدالعزیز الدرینیؒ کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں: وقال الشيخ العارف بالله الجامع بين الطريقين سيدى عبدالعزيز الدرينى رضى الله عنه لايجوز قطعاً نسبة الانبياء عليهم الصلوة والسلام الى الذنوب على حد ما نتعقله نحن وانما سماها الله فى حقهم معصية وخطيئة وذلك لان مقامهم الارفع لاذوق لولى فيه ولو ارتفعت درجته فضلاً عن غيره من امثالنا." (الیواقیت والجواہر)

"اور شیخ عارف باللہ جامع شریعت وطریقت سیدی عبدالعزیز درینی (اللہ آپ سے راضی ہو) نے فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے ایسے

گناہوں کی طرف نسبت کرنی بالکل جائز نہیں ہے جو گناہ ہماری اپنی سمجھ کی حد میں آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں جو معصیت اور خطا کے الفاظ تجویز کئے ہیں تو وہ ان کے بلند ترین مقام کے پیش نظر ہیں جس کا کسی ولی کو بھی ذوق نہیں ہے خواہ اس کا درجہ کتنا ہی بلند ہو جائے تو چہ جائیکہ ہمارے جیسے لوگوں کو اس کا ذوق حاصل ہو جائے۔"

۱۴۔ امام شعرانی ایک سوال کے جواب میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کی تحقیق پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ السوال: فان قلت فما معنى قوله تعالى وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبى الا اذا تمنى القى الشيطان فى امنيته: فالجواب: كماقال الشيخ فى الباب السادس من الفتوحات ان الانبياء عليهم السلام انما عصموا من العمل بوسوسة الشيطان فقط فهو يلقى اليهم ولايعملون بقوله لعصمتهم فليس له على قلوب الانبياء من سبيل فالعصمة حقيقة انما هى من العمل بما يلقى ولامن الالقاء لاجل الآية المذكورة فى السوال" (اليواقيت والجواهر)

(سوال) اگر تو کہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے۔"اور ہم نے آپ کے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے کچھ پڑھا (تب ہی) شیطان نے اس کے پڑھنے میں (کفار کے قلوب میں) شبہ ڈالا پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو نیست و نابود کردیتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو زیادہ مضبوط کردیتا ہے۔ (سورۃ الحج ع ۷)

(تو اس کا جواب یہ ہے کہ شیخ ابن عربی نے فتوحات مکیہ باب ششم میں فرمایا ہے کہ بلاشک انبیاء کرام علیہم السلام شیطان کے وسوسہ پر عمل کرنے سے

معصوم ہیں اور وہ اپنی عصمت کی وجہ سے شیطان کے قول (وسوسہ) پر عمل نہیں کرتے اور انبیاء کے قلوب پر شیطان کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے، پس حقیقت میں وہ شیطان کے وسوسہ پر عمل کرنے سے معصوم ہیں نہ کہ اس کے وسوسہ ڈالنے سے بوجہ مذکورہ آیت کے جو سوال میں مذکور ہے) مطلب یہ ہے کہ شیطان اپنا وسوسہ انبیاء پر بھی ڈالتا ہے لیکن وہ اس کے وسوسہ پر عمل نہیں کرتے اور شیطان اپنے اس حملہ میں ناکام ہوجاتا ہے اس لئے انبیاء کرام علیہم السلام بہرحال معصوم ہی رہتے ہیں۔

۱۵۔ حضرت سید عبدالعزیز دباغ قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

فان المنع من المعصية ذاتي في الانبياء عرضي في الاولياء ولايمكن زواله عن الانبياء الخ (الابریز، ص۲۲۶)

"کیونکہ معصیت (گناہ) کا ممتنع اور محال ہونا انبیاء کے حق میں ذاتی ہے اور اولیاء کے حق میں عرضی۔ پس اولیاء میں تو عصمت زائل ہوسکتی ہے لیکن انبیاء میں اس کا زائل ہونا ناممکن ہے (کیونکہ ذاتی صفت ہمیشہ قائم رہتی ہے اور عرضی صفت ہمیشہ نہیں رہتی اس لئے اولیاء سے گناہوں کا صدور ہوسکتا ہے۔ خواہ ان سے کبھی گناہ واقع نہ ہو۔ لیکن انبیاء سے گناہ کا صدور محال ہے اس لئے وہ ہر وقت ہمیشہ معصیت سے معصوم رہتے ہیں)۔"

۱۶۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: عقیدہ سوم یہ ہے کہ انبیاء گناہوں سے معصوم ہیں اور یہی مذہب اہل السنّت والجماعت کا ہے لیکن اس کے ساتھ ایک تفصیل ہے کہ کلام اللہ اور حدیثوں سے سمجھی جاتی ہے کہ گناہ کبیرہ اور صغیرہ عمداً اور قصداً سے تو معصوم ہیں لیکن سہواً صغیرہ ان سے صادر ہوتے ہیں کہ اس کو زلت کہتے ہیں جس کو ہندی میں پاؤں ڈگ جانا کہتے ہیں اور یہ صغیرہ اس صورت میں ان سے صادر ہوتا

ہے کہ مثلاً قصد کسی طاعت یا مباح شئی کا کیا اور اس کے قرب اور پاس ہی کوئی گناہ (ذنب) لگا ہوا ہے اور اس گناہ میں اتفاقاً پڑ گئے اور یہ ایسا ہے جیسے کوئی راہ گیر راہ چلا جاتا ہے اور اس راہ کے ساتھ پتھر یا کیچڑ لگی ہو اور اس سے ٹھوکر کھائی یا پاؤں پھسل گیا اس سبب سے اس کو زلت کہتے ہیں اور نیز اہل السنّت کہتے ہیں کہ وہ صغیرہ بھی کہ جس سے ناچیزی اور خست طبع کی پائی جاتی ہے مثلاً ایک حبہ (دانہ) چرالینا یا کسی کے حق سے ایک دانہ کم کرنا۔ پیغمبروں سے یہ صغیرہ بطریق سہو کے صادر نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہو تو لوگ ان سے نفرت کریں اور پیروی سے منحرف ہوں اور جو غرض کہ انبیاء کے پیدا کرنے سے ہے اس میں نقص لازم آئے اور ٹوٹ جائے (تحفہ اثنا عشریہ مترجم ص ۳۰۹)

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ حضرت شاہ صاحب نے جو سہواً صدور صغیرہ کو جائز قرار دیا ہے تو اس سے مراد معصیت کی صورت ہے نہ کہ حقیقت۔ اسی لئے اس کو زلت سے تعبیر کیا گیا، یہ اور زلت، معصیت صغیرہ اور کبیرہ دونوں سے جدا ہے۔ چنانچہ خود حضرت شاہ صاحبؒ محدث نے فرمایا ہے۔ ترک اولیٰ کا بھی انبیاء کے حق میں حکم معصیت اور ظلم کا رکھتا ہے نہ عوام الناس کے حق میں (تحفہ اثنا عشریہ ص ۳۱۵)

(ب) انبیاء کے متعلق عقائد میں افراط و تفریط پر بحث کرتے ہوئے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں: اور اس قسم کے علم کو علم نبوت کہتے ہیں اور افراط اور تفریط اس قسم میں وہ ہے کہ بالکل ان کے مرتبوں اور منصبوں کا انکار کرے یا ان کی عصمت کا اور محفوظ رہنے کا گناہوں سے اور خطاؤں سے اعتقاد نہ کرے اور مثل اپنے آلودہ ساتھ غرضوں دنیاوی اور طلب کرنے مطلبوں کے اور مغلوب حاجتوں نفسانیہ کا جانے یا رتبہ اماموں اور اولیاؤں کا برابر رتبہ انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کے مقرر کرے" (تفسیر عزیزی مترجم، پارہ اول سورۃ الفاتحہ ص ۲۹) اس سے معلوم ہوا کہ افراط و تفریط سے

پاک اور معتدل مذہب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو گناہوں اور خطاؤں اور دنیوی غرضوں اور نفسانی خواہشوں سے (جیسا کہ دوسرے لوگوں میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں) پاک اور معصوم تسلیم کیا جائے۔

۱۷۔ مجاہد جلیل حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ فرماتے ہیں: انبیاء علیہم السلام کی عصمت یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے ان کے اقوال، افعال، عبادات، عادات، معاملات، اخلاق واحوال کو نفس امارہ اور شیطان رجیم کی دخل اندازی اور خطا ونسیان سے محفوظ کر دیتا ہے اور نگرانی اور حفاظت کرنے والے فرشتے ان پر مسلط فرما دیتا ہے حتیٰ کہ بشریت کا غبار بھی ان کے دامن پاک تک نہ پہنچ سکے۔" (منصب امامت مترجم اردو، ص۸، طبع ۱۹۴۹ء)

۱۸۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا السید حسین احمد مدنی ؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند قدس سرہٗ حقیقت عصمت بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "وہ اعمال جو کہ سہواً یا خطأً یا غلط فہمی سے صادر ہوں وہ درحقیقت معصیت نہ ہوں گے (جبکہ نیت میں فساد اور نافرمانی نہ ہو) اگرچہ صورت معصیت پر کبھی مواخذہ بھی ہو جائے فان حسنات الابرار سیئات المقربین ... عصمت تو معصیت سے تحفظ کی ضمانت کرتی ہے، سہو، خطا، غلط فہمی کی محافظ نہیں ہے۔
(مکتوبات شیخ الاسلام جلد۳ ص۳۰)

(ب) ایضاً فرماتے ہیں: بلانیت معصیت، معصیت کا ارتکاب خطائے اجتہادی اور زلت ہے اور جو افعال ان (یعنی انبیاء) سے معاصی سمجھے گئے ہیں وہ حقیقتاً معاصی نہیں ہیں وہ صرف صورتاً ہی معاصی اور خطائے اجتہادی اور زلت ہیں" (مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت ص ۲۹)

۱۹۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں:

"احقر کے نزدیک انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام صغائر وکبائر ہر دو قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں اپنی نبوت سے قبل بھی اور بعد بھی۔ میری یہ رائے اگرچہ بظاہر اقوال اکابر کے خلاف نظر آتی ہے لیکن مسئلہ کی پوری تقریر کے بعد انشاء اللہ موافق نظر آئے گی۔" (مکتوب قاسمی بحوالہ ترجمان السنۃ ج۳ ص ۳۵۹)

اور عصمت انبیاء کے سلسلہ میں یہ جامع اور مدلل مکتوب حضرت نانوتویؒ کے مجموعہ مکاتیب "قاسم العلوم" میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

(۲۰) آخر میں ہم القاضی الامام عیاض محدث قدس سرہٗ کی تحقیق پر اس اہم بحث کو ختم کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں: (ا) اور منجملہ ان امور کے جو اس شخص پر واجب اور لازم ہیں جو ان امور میں کلام کرے جو نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جائز اور ناجائز ہیں اور جو ان حالات کو بر سبیل مذاکرہ اور تعلیم ذکر کرے جن کو کہ ہم اس سے پہلی فصل میں ذکر کر آئے ہیں ایک یہ ہے کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر کرے اور آپ کے حالات کو بیان کرنا چاہے تو وہ آپ کی تعظیم اور توقیر کا التزام کرے اور اپنی زبان کو نگاہ رکھے اور اس کو مطلق العنان نہ کرے بلکہ جب وہ آپ کا ذکر کرے تو آپ کے ذکر کے وقت اس پر آپ کے ادب کی علامتیں ظاہر ہوں الخ (شمیم الریاض اردو[۱] ترجمہ شفا قاضی عیاض ج۲ ص ۳۰۱، الشفاء عربی جلد دوم ص ۵۴۴)

(ب) اور جب ابواب عصمت میں کلام کرے اور آپ کے اقوال

---

(۱) شفا قاضی عیاض محدث کا اردو ترجمہ شمیم الریاض کے نام سے حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کاندھلوی نے لکھا ہے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہٗ نے اس کی تقریظ حسب ذیل لکھی ہے
حامداً ومصلیاً احقر اشرف علی عفی عنہ کہتا ہے کہ میں نے اس ترجمہ کو کہیں سے اصل کے ساتھ ملا کر اور کہیں سے خود ترجمہ کو دیکھا ماشاء اللہ اصل وفرع کا یہ تطابق اور عبارت کی متانت اور سلاست قابل تحسین ہے۔ امید ہے کہ ناظرین اس سے متمتع ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول ونافع فرمائیں اور حضرت مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ فقط مقام تھانہ بھون ۲۷ شوال ۱۳۲۶ھ

اور افعال میں بحث کرے تو جہاں تک ممکن ہو ڈھونڈ ڈھونڈ کر عمدہ عمدہ اور پاکیزہ الفاظ استعمال کرے اور مطالب کو مؤدبانہ الفاظ میں ادا کرے اور حتی الوسع برے شنیع الفاظ سے احتراز کرے اور عبارات قبیحہ کو ترک کرے جیسے جہل، اور کذب اور معصیت (کہ انبیاء کرام کی شان میں ان الفاظ کا استعمال نہ کرے)۔" (ایضاً ص ۳۰۱)

(ج) آیت: اما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ کے تحت فرماتے ہیں: اور علی ہذا آپ کے حق میں یہ امر بھی صحیح نہیں ہوسکتا کہ آپ کے لئے شیطان فرشتہ کی صورت میں متمثل ہوسکے اور آپ پر کسی قسم کا شک یا شبہ ڈال سکے، نہ رسالت سے قبل اور نہ رسالت کے بعد اور اس باب میں جس دلیل پر اعتماد کیا گیا ہے وہ دلیل معجزہ ہے بلکہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں شک نہیں ہوتا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کے پاس آتا ہے وہ حقیقتاً فرشتہ اور اس کا رسول ہی ہے خواہ تو یہ علم کسی علم ضروری کے سبب ہو جس کو اللہ عزوجل اپنے نبی کے لئے پیدا کردیتا ہے یا کسی ایسی دلیل کے سبب ہو جس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کے لئے ظاہر فرماتا ہوتا کہ راستی اور انصاف میں تیرے رب کی بات پوری ہو اس کی باتوں کا کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔" (شمیم الریاض جلد دوم ص ۱۳۲ الشفاء عربی ص ۲۸۰ جلد دوم)

(د) اور فقہاء اور متکلمین محققین کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ وہ (یعنی انبیاء کرام علیہم السلام) صغائر سے بھی ویسے ہی پاک اور معصوم ہیں جیسے کہ وہ کبائر سے پاک اور معصوم ہیں اور کہا ہے کہ دلیل اس کی یہ ہے کہ تعین صغائر اور کبائر میں علماء کے درمیان اختلاف واقع ہے اور ان پر ان دونوں کا باتعین

جدا کرنا مشکل پڑ رہا ہے اور ابن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ جس چیز کے ساتھ خدا کی نافرمانی کی جائے وہی کبیرہ ہے اور ان میں سے جو بعض معاصی کو صغیرہ کہا گیا ہے تو وہ بہ نسبت اس کے مافوق کے ہے اور باری تعالیٰ کی مخالفت چاہے جس امر میں ہو وہ اس کے کبیرہ ہونے کو مستلزم ہے۔ اور بعض ائمہ نے انبیاء کرام کے صغائر سے معصوم ہونے پر اس امر کے ساتھ استدلال کیا ہے کہ امت پر انبیاء کرام کے افعال کا بجالانا اور ان کے آثار جمیلہ اور سیر حمیدہ کا اقتداء کرنا مطلقاً واجب اور لازم ہے اور فقہاء مالکی اور شافعی اور حنفی بدوں اس کے کہ وہ کسی قرینہ کا التزام کریں سب کے سب اس پر متفق ہیں بلکہ بعض کے نزدیک ان کا اتباع اور اقتداء کرنا مطلقاً واجب اور لازم ہے، گو ان کے درمیان اس کے حکم میں اختلاف واقع ہو۔ (اور بعض نے کہا کہ) : اگر ہم ان پر صغائر کو جائز رکھیں گے تو ان کے افعال میں ان کا اقتداء کرنا ممکن نہ رہے گا کیونکہ اس وقت ان کے افعال میں سے ہر ہر فعل کی نسبت یہ تمیز کرنا کہ یہ فعل آپ نے قربتاً کیا ہے یا اباحتاً یا حظراً ممکن نہ ہوگا اور نہ امتثال آپ کے امر کا حکم کرنا صحیح ہوگا کیونکہ ممکن ہے کہ وہ معصیت ہو الخ۔

(شمیم الریاض، جلد۲، ص۱۶۴، الشفاء عربی ج ۲ ص ۳۲۴)

خلاصہ کلام!

محققین اہل السنّت والجماعت کے مذکورہ بالا ارشادات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے مطلقاً پاک اور معصوم ہیں اور عصمتِ انبیاء کی یہی حقیقت ان آیات مقدسہ سے بھی ثابت ہوتی ہے جو بندہ نے ابتداءً پیش کی ہیں، اللہ تعالیٰ ان معصوم انبیاء کرام علیہم السلام کے طفیل میرے گناہوں کو معاف

فرمائے۔ ہمیشہ طاعت وعبادت کی توفیق دے۔ ذکر دوام نصیب ہو۔ حضور رحمۃ للعالمین خاتم النبیین شفیع المذنبین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت واطاعت میں یہ فانی زندگی گزرے۔ مذہب اہل السنّت والجماعت کی اتباع، خدمت اور نصرت کی ہمیشہ توفیق عطا ہو۔ امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ کرام، اہل بیت عظام، ازواج مطہرات بالخصوص خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین اور حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہم اجمعین کی محبت و عظمت کامل طور پر نصیب ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ تمام صحابہ کرامؓ کی شرعی عظمتوں کے تحفظ کی ہمیشہ توفیق ملے اور مسلمانانِ اہل سنت والجماعت کو ہر محاذ پر کامیابی نصیب ہو۔

آمین بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم.

خادم اہل سنت الاحقر مظہر حسین غفرلہٗ
مدنی جامع مسجد چکوال۔ پاکستان
٧ رجب ١٣٩٦ھ -- ٦ جولائی ١٩٧٦ء

(ضمیمہ نمبر ٢)

"منصب رسالت اور بشری کمزوریاں"

"علمی محاسبہ" میں* حسب ضرورت مسئلہ عصمت انبیاء پر مفصل بحث کرکے یہ ثابت کردیا گیا ہے کہ مودودی صاحب کی بعض تحریرات عقیدہ عصمت انبیاء کے خلاف ہیں جن سے منصب نبوت کی تنقیص لازم آتی ہے۔ ابھی علمی محاسبہ کی کتابت مکمل نہیں ہوئی کہ مودودی صاحب کا ایک تازہ قلمی شاہکار سامنے آگیا ہے جس میں منصب نبوت کو واضح طور پر مجروح کیا گیا ہے۔

چنانچہ اپریل ١٩٧٦ء کے آغاز میں اسلامک کونسل آف یورپ کی طرف سے لندن کی ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں مودودی صاحب کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ آپ خود تو اس کانفرنس میں شریک نہیں ہوسکے لیکن اپنا ایک مقالہ بھیج دیا جس کا عنوان ہے "اسلام کس چیز کا علمبردار ہے" یہ مقالہ اس اسلامی کانفرنس میں ٤-اپریل کو پڑھ کر سنایا گیا ہے اور یہی مقالہ مودودی صاحب کے ماہنامہ ترجمان القرآن ماہ اپریل میں شائع ہوگیا ہے جو کتابی شکل میں علیحدہ بھی شائع ہوچکا ہے۔ مذکورہ مقالہ میں مودودی صاحب نے اشھد ان محمدًا عبدہ ورسولہ کی تشریح میں لکھا ہے کہ:

"رسول ایک انسان ہے اور خدائی (Divinity) میں اس کا ذرہ برابر بھی کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ نہ فوق البشر ہے۔ نہ بشری کمزوریوں سے بالاتر ہے۔ نہ خدا کے خزانوں کا مالک ہے نہ عالم الغیب ہے کہ اس کو خدا کی طرح سب کچھ معلوم ہو۔ وہ دوسروں کے لئے نافع وضار ہونا تو درکنار خود اپنے لئے بھی کسی نفع وضرر کا اختیار نہیں رکھتا۔ الخ مقالہ ص ١٠

علامہ بنوری کی تنقید:

حضرت علامہ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری دام فضلہم شیخ الحدیث مدرسہ

اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی، صدر مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان نے مودودی صاحب کے ان الفاظ پر سخت گرفت کی ہے کہ ''(رسول) نہ بشری کمزوریوں سے بالاتر ہے'' چنانچہ ماہنامہ ''بینات'' کراچی جولائی ۱۹۷۶ء میں حضرت مولانا بنوری نے فرمایا ہے کہ:

''ان حقائق کی روشنی میں ترجمان القرآن جلد ۸۵ شمارہ اپریل ۱۹۷۶ء میں بعنوان ''اسلام کس چیز کا علمبردار ہے'' مودودی صاحب کا مقالہ مطالعہ کیجئے ص ۳۰ پر موصوف یوں رقمطراز ہیں:

''وہ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نہ فوق البشر ہے۔ نہ بشری کمزوریوں سے بالاتر ہے۔''

کس جاہل نے کہا ہے کہ وہ فوق البشر ہے، ہاں تمام اولین وآخرین اور حق تعالیٰ جو خالق الانبیاء والمرسلین ہیں ان کا فیصلہ ہے کہ وہ (اتقی) بشر ہیں۔ سید البشر ہیں۔ تمام نسل انسانی میں سب سے بڑھ کر متقی اور کامل ترین افراد بشر میں سے ہیں۔ آفتاب عالمتاب اور بدر منیر کے انوار کو ان کے انوار سے کیا نسبت ہے، آسمان ہو یا زمین، چاند ہو یا سورج حتی کہ عرش رحمٰن بھی آپ کی منزلت سے قاصر ہے۔ تمام مخلوقات خداوندی میں افضلیت وکمال کا تاج آپ کے ہی سر پر باندھا گیا ہے۔ ''نہ فوق البشر ہے''۔ یہ جملہ بھی جو غمازی کرتا ہے کہ فوق البشر کہنا بھی ناقابل برداشت ہے لیکن ''نہ بشری کمزوریوں سے بالاتر ہے'' کے فقرے سے جو کچھ دل میں تھا ابھر کر آ گیا۔ جو شخص بشری کمزوریوں میں ملوث ہے وہ بشر کی ہدایت کے لئے کیسے موزوں ہوسکتا ہے۔

اردو کے عرف میں اور عام تعبیرات کے پیش نظر بشری کمزوریوں کا اطلاق ان صفاتِ بشریہ پر ہوتا ہے جو صفات ذمیمہ وقبیحہ ہیں۔ لوازم بشریت مراد ہو ہی نہیں سکتے۔ لوازمِ بشریت کھانا پینا۔ سونا جاگنا۔ خوشی غمی، صحت و مرض، وفات وغیرہ بلاشبہ یہ لوازم بشریت ہیں، خواص بشریت ہیں اور صفات

بشریت ہیں۔ عرف میں ان کو بشری کمزوریوں سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔ لوازم بشریت سے تو ملائکۃ اللہ اور حق تبارک وتعالیٰ منزہ ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ یہ جملہ خطرناک حقیقت کی غمازی کررہا ہے۔ اسلام کی پوری بنیاد منہدم ہوجاتی ہے۔ حق تعالیٰ تو ان کو یہ شرفِ قبولیت عطا فرماتا ہے کہ کلمہ اسلام میں، کلمہ شہادت میں، اذان واقامت میں حق تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ کا نام آئے۔ نماز میں درود وسلام بھیجنے کا حکم ہو اور اس انداز سے ہو کہ چونکہ حق تعالیٰ اور اس کے فرشتے آپ پر درود بھیجتے ہیں۔

''اے ایمان والو! تم بھی درود بھیجو۔'' بارگاہ اقدس سے اتنا اونچا منصب عطا کیا گیا ہو اور مودودی صاحب کی نگاہ میں وہ بشری کمزوریوں سے بالاتر نہیں۔ جو شخصیت بشری کمزوریوں میں مبتلا ہو، کیا وہ اس منصب جلیل کی مستحق ہوسکتی ہے۔ بظاہر تو یہ ایک جملہ ہے لیکن اس ایک جملہ سے ان کے تمام کمالات اور منصب نبوت پر پانی پھر جاتا ہے اور ہر ناقد کے لئے تنقید کا راستہ ہموار ہوجاتا ہے۔ بشری کمزوریوں میں جھوٹ بولنا، خودغرضی، بقایا جاہلیت کے آثار کا نمایاں ہونا۔ مصلحت اندیشی کا کارفرما ہونا۔ بنی عبد مناف اور بنی ہاشم کو بنی امیہ پر ترجیح دینا۔ قریش ومہاجرین کو وہ مقام عطا کرنا جس سے انصار محروم تھے وغیرہ وغیرہ۔ کونسی کمزوری ہے جو اس اجمال میں نہیں آسکتی۔ کیا اچھا ہوتا کہ مودودی صاحب ان کمزوریوں کی نشاندہی خود فرمادیتے کہ وہ کونسی کمزوریاں ہیں جو آپ کی ذات گرامی میں موجود ہیں۔

۲۔ حضرت مولانا بنوری موصوف مودودی صاحب کی زیر بحث عبارت سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ ماہنامہ ''بینات'' ماہ اگست میں پھر ردمودودیت پر قلم اٹھایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''مودودی صاحب کی بہت سی چیزیں پسند بھی آئیں اور بہت سی ناپسند

بھی۔ لیکن عرصہ دراز تک جی نہ چاہا کہ ان کو مجروح کیا جائے اور ان کے جدید انداز بیان سے جی چاہتا تھا کہ جدید نسل فائدہ اٹھائے۔ اگرچہ بعض اوقات ان کی تحریرات میں ناقابل برداشت باتیں بھی آئیں مگر دینی مصلحت کے پیش نظر برداشت کرتا رہا اور خاموش رہا۔ لیکن اتنا اندازہ نہ تھا کہ یہ فتنہ عالمگیر صورت اختیار کرے گا اور اکثر عرب ممالک میں یہ فتنہ بری صورت اختیار کرے گا اور دن بدن ان کے شاہکار قلم سے نئے نئے شگوفے پھوٹتے رہیں گے۔ صحابہ کرام اور انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں ناشائستہ الفاظ استعمال ہوں گے۔ آخر تفہیم القرآن، خلافت وملوکیت اور ترجمان القرآن میں روز بروز ایسی چیزیں نظر آئیں کہ اب معلوم ہوا کہ بلاشبہ ان کی تحریرات وتالیفات عہد حاضر کا سب سے بڑا فتنہ[1] ہیں۔ اگرچہ چند مفید ابحاث بھی آ گئی ہیں اثمھما اکبر من نفعھما[2] والی بات ہے۔ اب حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ سکوت جرم عظیم معلوم ہوتا ہے اور چالیس سال جو مجرمانہ سکوت اختیار کیا اس پر بھی افسوس ہوا اور اب وقت آ گیا ہے کہ بلاخوف لومۃ لائم، الف سے یاء تک

---

(۱) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی محدث دیوبندؒ کو حق تعالیٰ نے مودودی فتنہ کے متعلق جو خصوصی بصیرت عطا فرمائی تھی اس کی بنا پر سالہا سال پہلے جب کہ خلافت وملوکیت وغیرہ کا وجود بھی نہ تھا حضرتؒ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ: ''اسلام کے نام پر بہت سی جماعتیں وجود میں آئیں لیکن یہ جماعت جو جماعت اسلامی کے نام سے ہے ان تمام جماعتوں سے بہت زیادہ خطرناک ہے۔'' نیز فرمایا کہ ''حدیث میں جوامت کے بہتر (۷۲) فرقوں کی خبر آئی ہے اور صرف ایک فرقہ کو ناجی اور دوسرے تمام فرقوں کو غیر ناجی فرمایا گیا ہے میں دلائل و براہین کی روشنی میں شرح صدر سے کہتا ہوں کہ یہ جماعت اسلامی بھی انہیں غیر ناجی فرقوں میں سے ہے۔'' (الجمعیت دہلی کا شیخ الاسلام نمبر ۱۵۹)

(۲) یہ آیت شراب اور جوئے کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''ان دونوں کا گناہ (اور ضرر) انکے نفع کی بنسبت بہت زیادہ ہے۔'' یعنی باوجود اس کے کہ ان میں نفع بھی ہے قرآن نے شراب اور جوئے کو ان کے ضرر کثیر کے تحت حرام فرما دیا ہے۔ اس اصول کی بنا پر مودودی صاحب کی تحریرات کو عظیم فتنہ قرار دیا گیا ہے گو اس میں کچھ فائدہ بھی کسی کو پہنچ جائے۔

ان کی تالیفات اور تحریرات کا مطالعہ کر کے جو حق وانصاف اور دین کی حفاظت کا تقاضا ہو وہ پورا کیا جائے۔ واللہ سبحانہ ولی التوفیق.

مودودی صاحب کا جواب:

حضرت مولانا بنوری کی علمی تنقید کے جواب میں مودودی صاحب نے اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن جون ۱۹۷۶ء میں زیر بحث جملہ کی یہ تاویل کی ہے کہ:۔

''ان کمزوریوں سے میری مراد بھوک پیاس لگنا، تھکنا، آرام کی ضرورت محسوس کرنا، سونا، بیمار ہونا، زخمی ہونا، خوشی اور رنج کے اسباب سے متاثر ہونا اور ایسے ہی دوسرے امور ہیں جو بتقاضائے بشریت ہر انسان کی طرح رسول کو بھی لاحق ہوتے ہیں۔''

(ایضاً ملاحظہ ہو شائع کردہ مقالہ ص ۱۴)

مودودی صاحب کا بیجا اصرار:

پھر ترجمان القرآن ماہ اگست ۷۶ء میں ''بشری کمزوریاں'' کے عنوان کے تحت حسب ذیل سوال وجواب شائع کیا گیا ہے:

(سوال) ایک عالم دین کو اصرار ہے کہ لندن کی اسلامی کانفرنس والے مقالے میں آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ''بشری کمزوریوں سے بالاتر نہ ہونے'' کے الفاظ جو استعمال کئے ہیں وہ درحقیقت عیب اور نقص کے معنی میں ہیں۔ کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے کہ ان الفاظ سے خود آپ کی مراد کیا تھی؟

(جواب) (مودودی صاحب نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ) اگرچہ ماہ جون کے ترجمان القرآن میں اپنی مراد وضاحت کے ساتھ بیان کر چکا ہوں مگر اس کے بعد بھی اس الزام پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ

قائل جب اپنے قول کی صاف صاف وضاحت کردے تب بھی الزام لگانے والا یہی کہتا رہے گا کہ تیرے قول کا اصل منشاء وہ نہیں ہے جو تو بیان کرتا ہے بلکہ وہ ہے جو ہم بیان کرتے ہیں۔ یہ عجیب رویہ ہے جو متقی اور خدا ترس لوگوں نے کبھی اختیار نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر میری طرف سے کوئی وضاحت نہ بھی ہوتی اور صرف اس مضمون کی متعلقہ عبارات ہی کو صاف ذہن کے ساتھ پڑھا جاتا تو اس غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہ ہوتی کہ اس سلسلہ کلام میں بشری کمزوریوں سے مراد عیوب اور نقائص ہو سکتے ہیں۔ اس میں تو ساری بحث یہ ہے کہ دوسری قوموں نے اپنے انبیاء کے حق میں جو مبالغے کئے ہیں ان کو خدا یا خدا کی اولاد، یا خدا کا اوتار تک بنا ڈالا ہے۔ قرآن مجید نے ان سب سے مسلمانوں کو بچا لیا ہے اور خدائی و رسالت کے درمیان ایک ایسا خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے جس سے ہر انسان یہ جان سکتا ہے کہ رسول کیا ہے اور کیا نہیں؟ آخر اس بحث کے دوران میں یہ کہنے کا کیا موقع ہو سکتا ہے کہ رسول عیوب اور نقائص سے بالاتر نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں اگر کوئی شخص الفاظ کے معانی کی سمجھ رکھتا ہو تو وہ بشری کمزوریوں کا مطلب عیوب اور نقائص ہرگز نہیں لے سکتا۔ انسان کے لئے عیب کا لفظ ایسے موقعہ پر بولا جاتا ہے جب وہ مثلاً بدزبان ہو، جھوٹا ہو، چغل خور ہو، فریبی ہو اور خائن و بدکار ہو۔ "نقص" کا لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب وہ یا تو کسی جسمانی نقص میں مبتلا ہو مثلاً بدشکل یا ناقص الاعضاء ہونا یا وہ کسی ذہنی یا اخلاقی نقص میں مبتلا ہو مثلاً کند ذہن، کم فہم یا خواہشات نفس سے مغلوب ہونا۔ ان دونوں کے برعکس بشری کمزوریاں یہ ہیں کہ انسان اپنی سلامتی کے لئے غذا اور پانی کا محتاج ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وخلق الانسان ضعیفا (النساء آیت ۲۸) "اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے" (ترجمان القرآن ص ۳۸، اپریل ۱۹۷۶ء)

الجواب: مودودی صاحب نے اپنی زیر بحث عبارت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے جو تاویلات و توجیہات پیش کی ہیں وہ سب باطل ہیں کیونکہ:

(۱) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے یہ فرمایا ہے کہ:

لوازم بشریت کھانا پینا، سونا جاگنا، خوشی، غمی، صحت و مرض وفات وغیرہ۔ بلاشبہ یہ لوازم بشریت ہیں، خواص بشریت ہیں اور صفات بشریت ہیں۔ عرف میں ان کو بشری کمزوریوں سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔ مودودی صاحب کو چاہیئے تھا کہ وہ یہ بات ثابت کرتے کہ عرف میں کھانے پینے کو بشری کمزوریاں قرار دیا جاتا ہے۔

(۲) مودودی صاحب کا یہ کہنا بھی یہاں کافی نہیں ہے کہ میری مراد بشری کمزوریوں سے کھانا پینا وغیرہ ہے۔ کیونکہ بشری کمزوریوں سے کھانا پینا مراد ہو ہی نہیں سکتا۔ مراد تو قائل کی وہ قابل قبول ہو سکتی ہے جو الفاظ سے ثابت ہو سکے اور مودودی صاحب کی یہ تاویل بھی بالکل غلط ہے کہ اس سلسلہ کلام میں بشری کمزوریوں سے مراد عیوب اور نقائص نہیں ہو سکتے بلکہ مراد ان سے کھانا پینا وغیرہ ہی ہو سکتا ہے اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے رسول کے بشر ہونے کا اعلان فرمادیا تو اس سے خود ظاہر ہو جاتا ہے کہ رسول بوجہ بشر ہونے کے کھاتے پیتے تھے اور جن قوموں نے انبیاء کو خدا یا خدا کا بیٹا اور خدا کا اوتار تسلیم کیا ہے وہ بھی ان کے کھانے پینے کی نفی نہیں کرتے تھے۔ تو اس مقام پر بشری کمزوریوں کے الفاظ سے کھانا پینا مراد لینا ان کا جواب نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ خود انبیاء کے کھانے پینے کے قائل تھے اور کھانا پینا انسانی حاجت ہے کمزوری نہیں۔ ایک فطری حاجت کو کمزوری سے تعبیر نہیں کیا جاتا، بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کے دودھ کا محتاج ہوتا ہے اور فطری رہنمائی سے وہ ماں کا دودھ پینے لگ جاتا ہے لیکن کوئی صاحب عقل و فہم اس کو بچے کی بشری کمزوری نہیں

قرار دیتا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریمؑ کی الوہیت کی نفی میں جو اللہ تعالیٰ نے یہ دلیل قائم فرمائی ہے کہ وہ دونوں طعام کھاتے تھے (کـــانـــا یاکلان الطعام) تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کھانے پینے کے محتاج تھے اور محتاج خدا نہیں ہوسکتا، یہ مراد نہیں کہ وہ بشری کمزوری رکھتے تھے اس لئے خدا نہیں۔

۳۔ مودودی صاحب نے جو سورۃ النساء کی آیت وخلق الانسان ضعیفاً ط سے بشری کمزوریوں پر استدلال کیا ہے وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ آیت میں ضعف سے مراد کھانے پینے کی کمزوری نہیں ہے اگر مودودی صاحب اس سے پہلی آیت کو دیکھ لیتے تو یہ مضحکہ خیز استدلال نہ کرتے چنانچہ پوری آیت یہ ہے:۔

یرید اللہ ان یخفف عنکم و خلق الانسان ضعیفاً ط

ترجمہ: ''اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان بنایا ہے کمزور'' (حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ) آیت میں چونکہ احکامِ شریعت میں تخفیف کا بیان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس کے لئے ایسے احکام نہیں رکھے گئے جو اس کے لئے ناقابل برداشت ہوں۔ یہاں کھانے پینے کی کمزوری سے تو اس آیت کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے، چنانچہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ:

''یعنی انسان کو اللہ تعالیٰ نے ضعیف بنایا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ یہ شہوات و مرغوبات سے کہاں تک صبر کرسکتا ہے تو اس لئے ہر حکم میں تخفیف کا بھی لحاظ فرمایا گیا ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ انسان کے حق میں جو مفید ہے وہ اس کے ذمہ لگادیا۔ سہل ہو یا دشوار۔ مثلاً عورتوں اور شہوت سے صبر کرنا آدمی کو بہت دشوار تھا اس لئے اس کی خواہش پورا کرنے کے لئے طریقے جائز اپنانے بتلادیئے کہ اس سے اپنا مطلب حاصل کرسکے یہ نہیں کہ قضائے شہوت سے بالکل روک دیا گیا'' الخ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ لکھتے ہیں کہ:

''اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ تخفیف منظور ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آدمی بہ نسبت اور مکلفین کے بدن اور ہمت دونوں میں کمزور پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس کے ضعف کے مناسب احکام مقرر فرمائے ہیں ورنہ باعتبار رعایت و مصلحت کے اعمال شاقہ کا تجویز کیا جانا بھی مضائقہ نہ تھا۔''

۴۔ خود مودودی صاحب کی دوسری تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ بشری کمزوریوں سے مراد عیوب ہیں نہ کہ کھانا پینا وغیرہ چنانچہ جیل سے انہوں نے اپنے خط بنام نذر الرحمٰن صاحب حافظ آبادی میں یہ لکھا تھا کہ:

''انسان کے لئے اصل خوبی یہ ہے کہ جب کبھی بشری کمزوری سے کوئی قصور اس سے سرزد ہوجائے تو جلدی سے جلدی وہ سنبھلے اور اس پر شرمسار اور نادم ہو'' (مکاتیب زندان ۱۳ جنوری ۱۹۵۰ء ص ۱۱) فرمایئے! کیا یہاں بشری کمزوری کا یہ مطلب ہے کہ جب انسان کھائے پئے یا بیمار ہوجائے تو نادم اور شرمسار ہو۔

۵۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ انسان کے لئے عیب کا لفظ بولا جاتا ہے جب وہ مثلاً بدزبان ہو جھوٹا ہو الخ ٹھیک ہے لیکن مودودی صاحب کو یہ یاد نہیں رہا کہ ایسے موقع پر کہ انہوں نے خود بشری کمزوریوں کے تحت جھوٹ کو بھی شمار کیا ہے۔ چنانچہ اصحابِ رسول اللہ ﷺ کے متعلق لکھا ہے کہ:

''ان سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہوجاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے تھے۔ ابن عمرؓ نے سنا کہ ابوہریرہؓ وتر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ فرمانے لگے ابوہریرہؓ جھوٹے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر انس اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیث رسول اللہ کو کیا جانیں وہ تو اس زمانہ میں بچے تھے۔ حضرت حسنؓ بن علیؓ سے ایک مرتبہ شاھد و مشھود کے معنی پوچھے گئے

انہوں نے اس کی تعبیر بیان کی۔عرض کیا گیا کہ ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ تو ایسا ایسا کہتے ہیں، فرمایا دونوں جھوٹے ہیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر مغیرہؓ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیا۔عبادہ بن الصامت نے ایک ایسا مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعودؓ بن اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگادیا حالانکہ وہ بدری صحابہ میں سے ہیں'' (تفہیمات جلد اول ص ۲۹۴ طبع چہارم مئی ۱۹۴۶ء)

(نوٹ) یہ حوالہ میری کتاب ''مودودی مذہب'' میں بھی درج ہے۔

یہاں تو مودودی صاحب نے خود جھوٹ بولنے اور ایک دوسرے کو جھوٹا کہنے اور چوٹیں کرنے کو بشری کمزوریوں کی فہرست میں شمار کردیا ہے پھر اب ان کی تاویل کیسے صحیح ہوسکتی ہے کہ بشری کمزوریوں سے مراد عیوب نہیں بلکہ کھانا پینا وغیرہ ہے۔

۶۔ اگر وہ یہ کہیں کہ غیر نبی کے لئے تو عیوب بشری کمزوریوں میں شمار ہوسکتے ہیں لیکن انبیاء کرام چونکہ معصوم ہیں اس لئے ان کے لئے بشری کمزوریوں کا اطلاق صرف کھانے پینے وغیرہ پر کیا جائیگا تو یہ جواب بھی ان کا کارگر نہیں ہوسکتا کیونکہ انہوں نے انبیاء کرام کے لئے بھی بشری کمزوری کا مصداق کھانے پینے کے علاوہ دوسری کمزوریاں قرار دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''حضرت نوح بیٹے کو ڈوبتے دیکھ کر چیخ اٹھے رب ان ابنی من اھلی خدایا! یہ میرا بیٹا ہے، یہ بشری کمزوری تھی۔اللہ نے اسی وقت یہ حقیقت ان پر واضح کردی کہ وہ تیرے نطفے سے ہوتو ہوا کرے مگر تیرے اہل سے نہیں۔ کیونکہ عمل غیر صالح ہے، بشریت نے محبت پدری کے جوش میں ذرا سی دیر کے لئے نبی کی نظر سے اس حقیقت کو چھپادیا تھا کہ حق کے معاملہ میں باپ بیٹا بھائی کوئی چیز نہیں ہے الخ (تفہیمات جلد اول ص ۲۴۳)

۷۔ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں بھی یہی

بات لکھ دی ہے کہ:

''بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی جیسا اعلیٰ و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہوجاتا ہے لیکن جونہی کہ اسے یہ احساس ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے احساس کرادیا جاتا ہے کہ اس کا قدم معیار مطلوب سے نیچا جارہا ہے وہ فوراً توبہ کرتا ہے اور اپنی غلطی کی اصلاح کرنے میں اسے ایک لحہ کے لئے بھی تامل نہیں ہوتا۔حضرت نوح کی اخلاقی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ اپنا جان جوان بیٹا آنکھوں کے سامنے غرق ہوا ہے اور اس نظارہ سے کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔لیکن جب اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ فرماتا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا اس کو محض اس لئے اپنا سمجھنا کہ وہ تمہاری صلب سے پیدا ہوا ہے محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے۔تو وہ فوراً اپنے دل کے زخم سے بے پروا ہوکر اس طرز فکر کی طرف لوٹ آتے ہیں جو اسلام کا مقتضی ہے''

(تفسیر تفہیم القرآن جلد دوم سورۃ ھود ص ۳۴۴ طبع نہم مئی ۱۹۷۵ء)

یہاں مودودی صاحب نے بشری کمزوری کے الفاظ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں استعمال کئے ہیں اور اس کی مراد بھی بیان کردی ہے کہ انہوں نے العیاذ باللہ جاہلیت کے جذبہ کے تحت اپنے بیٹے کے لئے دعا کی۔یہ دعا اسلام کے مقتضی کے خلاف تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہ فرمائی۔اب کوئی اہل فہم و دیانت شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے لئے بشری کمزوری سے مراد ان کا کھانا پینا ہے، نہ ہی مودودی صاحب خود ہی یہ مراد لے سکتے ہیں۔لہٰذا مودودی صاحب ہی یہ بتائیں کہ جاہلیت کے جذبہ کے تحت ایک کام کرنا اور اسلام کے مقتضی کے خلاف کرنا اور اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کا وارد ہونا کیا یہ باتیں عیوب و قبائح میں شامل نہیں ہیں؟

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ مودودی صاحب نے خود سورۃ المائدہ کی آیت افحکم

الجاهلية يبغون کی تفسیر میں یہ لکھ دیا ہے کہ :

جاہلیت کا لفظ اسلام کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے کیونکہ اس کی طرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے اور اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے جاہلیت کا طریقہ ہے الخ (تفہیم القرآن جلد اول سورۃ المائدہ ص ۴۷۹)

جاہلیت کے لفظ کا جو مطلب مودودی صاحب نے خود بیان کیا ہے اس کے تحت حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق مودودی صاحب کا یہ نظریہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اسلام کے طریقے کے خلاف ایک بات کی۔ العیاذ باللہ۔ یہ سب کچھ لکھنے کے باوجود بھی مودودی صاحب یہی کہتے جاتے ہیں کہ رسول کے متعلق بشری کمزوریوں سے میری مراد صرف کھانا پینا اور بیمار ہونا وغیرہ ہے اس پر سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ

؎ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

(ب) حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کا منشا بھی مودودی صاحب نے غلط سمجھا ہے اور اسی اپنی کج فہمی کی بنا پر بلا کھٹک حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کو جاہلیت کے جذبہ کے تحت قرار دیا ہے حالانکہ حضرت نوح علیہ السلام نے اس لئے دعا نہیں کی تھی کہ چونکہ یہ میرا بیٹا ہے اس لئے اسے غرق ہونے کے بعد بھی نجات دیدی جائے۔ یہ ایک بہتان ہے جو مودودی صاحب نے ایک پیغمبر معصوم پر تراشا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے محض بیٹا ہونے کے جذبہ کے تحت یہ دعا نہیں کی بلکہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے پیش نظر یہ دعا کی تھی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

قلنا احمل فيها من كل زوجين اثنين واهلك الا من سبق عليه القول ومن آمن وما آمن معه الا قليل . (سورۃ ہود آیت ۴۰)

اس کا ترجمہ خود مودودی صاحب نے یہ لکھا ہے:

"ہم نے کہا ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو۔ اپنے گھر والوں کو بھی سوائے ان اشخاص کے جن کی نشان دہی پہلے کی جا چکی ہے۔ اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے۔" (تفہیم القرآن، جلد دوم ص ۳۳۹)

واهلك کی تفسیر میں مودودی صاحب نے یہ لکھا ہے کہ :

یعنی تمہارے گھر کے جن افراد کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمۃ کے مستحق نہیں ہیں انہیں کشتی میں نہ بٹھاؤ۔ غالباً یہ دو ہی شخص تھے ایک حضرت نوح کا بیٹا جس کے غرق ہونے کا ابھی ذکر آیا ہے دوسری حضرت نوح کی بیوی جس کا ذکر سورۃ التحریم میں آیا ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا تھا کہ ان کا بیٹا کافر رہے گا اور اس کو کشتی میں نہ بٹھانا۔ کیونکہ اگر واضح طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بیٹے کے متعلق ہوتا تو حضرت نوح علیہ السلام طوفان کے دوران میں اپنے بیٹے سے یوں نہ فرماتے کہ :

يا بنی ارکب معنا ولا تكن مع الكافرين.

"نوح نے پکار کر کہا بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جا۔ کافروں کے ساتھ نہ رہ" (ترجمہ مودودی)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو نہیں بتایا تھا کہ وہ بیٹا آخر تک کافر ہی رہے گا۔ اس لئے آپ نے اس امید پر کہ شاید عذاب الٰہی کو دیکھ کر ایمان قبول کر لے۔ کشتی میں سوار ہونے کے لئے اس کو فرما دیا اور وحی کے الفاظ میں اهلك سے یہ سمجھا کہ آپ کے سب گھر والے مراد ہیں تو اس وعدہ خداوندی کے پیش نظر آپ نے اپنے بیٹے کے لئے دعا فرمائی اور دعا میں اس وعدہ خداوندی کا ذکر بھی کر دیا چنانچہ قرآن مجید میں ہے ونادى نوح ربه فقال رب ان ابنی من اهلی وان وعدك الحق وانت احكم الحاكمين.

"نوح نے اپنے رب کو پکارا، کہا اے رب میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور

تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے'' (ترجمہ مودودی)

اور خود مودودی صاحب نے اس آیت کی تشریح میں یہ لکھ دیا ہے کہ:

''یعنی تو نے وعدہ کیا تھا کہ میرے گھر والوں کو اس تباہی سے بچالے گا تو میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں ہی میں سے ہے لہٰذا اسے بھی بچالے'' تو آیت کے الفاظ ان وعدک الحق اور خود مودودی تشریح سے ثابت ہوا کہ آپ نے اپنے بیٹے کے لئے نجات کی دعا اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کی بنا پر کی تھی کہ آپ کے گھر والوں کو بچالیا جائے گا لہٰذا اب مودودی صاحب کا یہ مفروضہ کتنا بے بنیاد اور خلافِ قرآن ہے کہ حضرت نوح نے محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے یہ دعا کی تھی اور یہ ایک جاہلیت کا جذبہ تھا العیاذ باللہ۔

جب ایک بات انہی آیات سے واضح طور پر ثابت ہوتی ہے اور مودودی صاحب کا اپنا ترجمہ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے تو پھر اس کے خلاف ایک ایسی تشریح گھڑنا جو بالکل عصمت انبیاء کے منافی ہے یہ تحقیق کی کونسی قسم ہے جس کی بنا پر مودودی صاحب کو ان کی جماعت محقق دوراں تسلیم کرتی ہے اور یہ فہم قرآن کی کونسی قسم ہے جس کی بنا پر ان کو مفکر اسلام، مفسر قرآن اور داعی حق منوانے کی سرتوڑ کوشش کی جاتی ہے۔

جس شخص کو یہ فہم بھی حاصل نہیں کہ قرآنی آیات کا جو ترجمہ وہ لکھ رہا ہے اس کی تشریح وہ اپنے تحریر کردہ ترجمہ کے مطابق کر رہا ہے یا مخالف اس کو مصلحِ امت اور مجددِ ملت سمجھنا قرآن اور اسلام کے ساتھ ایک مذاق ہے۔ اسی بنا پر اصحابِ علم اور اہل بصیرت کے نزدیک مودودیت عصرِ حاضر کا ایک عظیم فتنہ ہے جس سے بچنا اور بچانا اس وقت کا اہم اسلامی تقاضا ہے۔

حضرت آدمؑ کی بشری کمزوریاں:

۸۔ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں:

''یہاں اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی پوزیشن صاف کرنے کے لئے یہ قصہ نہیں بیان کر رہا ہے بلکہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ بشری کمزوری کیا تھی جس کا صدور ان سے ہوا اور

جس کی بدولت صرف وہی نہیں بلکہ ان کی اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہات کے باوجود اپنے دشمن کے پھندے میں پھنسی اور پھنس رہی ہے (تفسیر تفہیم القرآن سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۵)

(ب) اسی سورۃ طٰہٰ کی آیت وعصی آدم ربہ فغوی کے تحت ''آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا'' (ترجمہ مودودی) لکھا ہے۔

یہاں اس بشری کمزوری کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے جو آدم علیہ السلام سے ظہور میں آئی۔ اللہ تعالیٰ کو وہ اپنا خالق اور رب جانتے تھے اور دل سے مانتے تھے۔ جنت میں ان کو جو آسائشیں حاصل تھیں ان کا تجربہ انہیں خود ہر وقت ہو رہا تھا۔ شیطان کے حسد اور عداوت کا بھی ان کو براہ راست علم ہو گیا تھا۔۔۔۔ بس ایک فوری جذبے جو شیطانی تحریص کے زیر اثر ابھر آیا تھا ان پر ذہول طاری کر دیا اور ضبطِ نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مقام بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرے الخ۔

(ج) مگر اس عہد پر مستقل تقرر ہونے سے پہلے امتحان لینا ضروری سمجھا گیا تاکہ امیدوار کی صلاحیتوں کا حال کھل جائے کہ اس کی کمزوریاں کیا ہیں اور خوبیاں کیا، چنانچہ امتحان لیا گیا اور جو بات کھلی وہ یہ تھی کہ یہ امیدوار تحریص واطماع کے اثر میں آکر پھسل جاتا ہے، اطاعت کے عزم پر مضبوطی سے قائم نہیں رہتا اور اس کے علم پر نسیان غالب آجاتا ہے الخ۔

(تفسیر تفہیم القرآن جلد سوم ص ۱۳۰۔۱۳۳۔۱۳۴ طبع ہشتم اکتوبر ۱۹۷۵ء)

سورۃ طٰہٰ کی آیات تفسیر کے تحت مودودی صاحب نے حضرت آدم علیہ السلام کی بشری کمزوریاں خود بیان کر دی ہیں۔

(۹) نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا تھا (رسائل ومسائل جلد اول ص ۳۱، مطبوعہ بار دوم ۱۹۵۴ء)

(ب) آیت عجلت الیک رب لترضی کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے:

ان کی مثال اس جلد باز فاتح کی سی ہے جو اپنے اقتدار کا استحکام کئے بغیر مارچ

کرتا ہوا چلا جائے اور پیچھے جنگل کی آگ کی طرح مفتوحہ علاقہ میں بغاوت پھیل جائے (رسالہ ترجمان القرآن جلد ۲۹ عدد ۴ ص ۵، ستمبر ۱۹۴۶ء اشارات از امین احسن اصلاحی)

(ج) اس کی (یعنی قوم کی گمراہی کی) ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عجلت پسندی پر ڈالی

(ایضاً رسالہ ترجمان القرآن و دعوت دین اور اس کا طریق کار، از اصلاحی ص ۱۱۳)

(تبصرہ): یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک جلد باز اور غیر مدبر فاتح ظاہر کر کے ایک اولوالعزم پیغمبر کی سخت توہین کی گئی ہے یہ مضمون اشارات رسالہ ترجمان القرآن میں مودودی صاحب کی ترتیب و تالیف کے تحت بلا تنقید و جرح شائع ہوا ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا بھی یہی نظریہ ہے۔ العیاذ باللہ۔

۱۰۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''یہ وہ تنبیہ ہے جو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بلندی درجات کی بشارت دینے کے ساتھ حضرت داؤد کو فرمائی۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو فعل ان سے صادر ہوا تھا اس کے اندر خواہش نفس کا کچھ دخل تھا اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا۔

(تفہیم القرآن، جلد ۴ سورۃ ص، صفحہ ۳۲۷ طبع ششم جون ۱۹۷۴ء)

۱۱۔ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں ۔۔۔ پس جب نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کر گیا۔۔۔۔ الخ

(تفہیم القرآن جلد دوم سورۃ یونس حاشیہ ص ۳۱۲ پہلا ایڈیشن)

(ب) پس جب نبی نے اس قوم کی مہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود ہی ہجرت کر گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا کیونکہ اس پر اتمام حجت کی

قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔'' (ایضاً ص ۳۱۳، طبع نہم مئی ۱۹۷۵ء)

خلاصہ کلام:

انبیاء کرام علیہم السلام کی بشری کمزوریوں کے تحت مندرجہ بالا عبارات میں مودودی صاحب نے یہ باتیں لکھی ہیں:

جاہلیت کے جذبہ کے تحت کوئی کام کرنا، شیطانی تحریص سے کوئی کام کرنا۔ طاعت کے مقام بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرنا، حرص و طمع میں آ کر پھسل جانا۔ طاعت کے عزم پر مضبوطی سے قائم نہ رہنا۔ کوئی بہت بڑا گناہ ہو جانا، اپنے اقتدار کا استحکام نہ کرنا اور کام میں جلد بازی کرنا، خواہش نفس کے تحت کوئی کام کرنا۔ فریضہ رسالت میں کوتاہیاں کرنا، اتمام حجت نہ کر سکنا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے متعلق بشری کمزوریوں میں ایک دوسرے پر چوٹیں کرنا، ایک دوسرے کو جھوٹا کہنا وغیرہ۔

ہمارا سوال:

مندرجہ بالا عبارات میں مودودی صاحب نے انبیاء عظام یا صحابہ کرام کی جن بشری کمزوریوں کا ذکر کیا ہے ان میں ان کمزوریوں کا تو کوئی نام و نشان ہی نہیں ملتا جو مودودی صاحب نے اپنے مقالہ مذکورہ کی زیر بحث عبارت وہ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بشری کمزوریوں سے بالاتر ہیں'' سے مراد لی ہیں۔ یعنی بھوک پیاس لگنا، تھکنا، آرام کی ضرورت محسوس کرنا۔ سونا، بیمار ہونا، زخمی ہونا۔ تو اب ہمارا سوال مودودی صاحب سے یہ ہے کہ آپ جب خود اپنی مشہور تصنیف تفہیمات اور اپنی مشہور تفسیر تفہیم القرآن میں بشری کمزوریوں سے مراد جھوٹ وغیرہ بیان کر چکے ہیں تو اب کس اسلامی اصول کی بنا پر آپ اپنی سابقہ تحریرات اور عرف عام کے خلاف حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کے جواب میں یہ لکھ رہے ہیں کہ بشری کمزوریوں سے میری مراد بھوک پیاس لگنا وغیرہ ہے اور یہ بھی فرما رہے ہیں کہ:

اگر کوئی شخص الفاظ کے معانی کی سمجھ رکھتا ہو تو وہ بشری کمزوریوں کا مطلب عیوب اور

نقائص ہرگز نہیں لے سکتا'' اور یہ بھی فرمائیں کہ جب بشری کمزوریوں کے تحت آپ نے صحابہ کرامؓ کے متعلق ایک دوسرے کو چوٹیں کرنا اور ایک دوسرے کو جھوٹا کہنا لکھ دیا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی دعا میں جاہلیت کا جذبہ تسلیم کرلیا ہے تو آپ کے نزدیک جھوٹ اور جاہلیت کا جذبہ اور خواہش نفس کے تحت کام کرنا وغیرہ امور عیوب اور نقائص میں شمار نہیں ہوتے، کیا مودودی صاحب ہمارے سوال کا صحیح علمی جواب دے سکتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب اپنی ایک خطرناک غلطی پر ڈٹ گئے ہیں جس سے حضور رحمۃ اللعالمین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء ورسل کی رسالت کی حیثیت ہی ختم ہوجاتی ہے۔ کیا یہی حق پرستی اور خداخوفی ہے جس کا آپ دوسروں کو درس دیا کرتے ہیں۔ کیا ایک داعی حق، مصلح وقت اور امام دوراں کا کردار یہی ہونا چاہیے؟ بات صاف تھی جب شیخ الحدیث حضرت مولانا بنوری دام مجدہم کا ایک صحیح علمی اعتراض آپ کو معلوم ہوگیا تھا تو آپ رسالت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والتحیۃ پر اپنے جاہلانہ تبصرہ سے رجوع کرلیتے اور اپنی پاکدامنی کی بجائے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکدامنی کا تحفظ کرتے۔

مودودی صاحب کی تضاد بیانیاں:

مودودی صاحب کی تصانیف کو اگر ناقدانہ نظر سے دیکھا جائے تو ان میں بیسیوں متضاد اقوال کا ثبوت ملتا ہے جن کی کوئی صحیح توجیہ وتطبیق نہیں ہوسکتی مثلاً:

مدح صحابہؓ: مودودی صاحب کی تصانیف اور مضامین میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وتعظیم بھی پائی جاتی ہے اور ذم وتوہین بھی چنانچہ ایک جگہ شیعہ نظریہ کے متعلق ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''باقی رہا کسی گروہ کا خلفائے ثلثہ اور تمام صحابہ کرام کو (باستثناء چند) مسلم بلاایمان قرار دینا تو حقیقت میں یہ ان پر نہیں بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چوٹ ہے وہ دراصل ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ معاذ اللہ حضور ﷺ ایک انتہائی ناکام نبی تھے۔

کیونکہ آپؐ پر خود آپؐ کے چند اہل بیت اور تین چار صحابیوں کے سوا کوئی سچے دل سے ایمان نہ لایا۔ حتیٰ کہ آپ کی اکثر بیویاں بھی آپ کی مخلص پیرو نہ تھیں اور اس کے ساتھ وہ حضورؐ کو نعوذ باللہ سخت بے بصیرت اور سادہ لوح بھی ثابت کرتے ہیں کیونکہ ان کے بقول سب منافق ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ ظالم اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ۲۳ سال تک تمام عرب کے مقابلہ میں جدوجہد کر کے جو عظیم الشان کامیابی حضورؐ کو حاصل ہوئی وہ آخر کیسے حاصل ہوسکتی تھی۔ اگر آپ کے یہ تمام ساتھی مخلص ووفادار اور جانثار فدائی نہ ہوتے۔ سالہا سال تک عرب کی پوری قوم حضور ﷺ سے برسرپیکار تھی اور یہی صحابہ آپ کے دست وبازو بنے ہوئے تھے۔ معاذ اللہ یہ اگر منافق ہوتے تو عرب کیسے مسخر ہوجاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ بغض اور تعصب میں جب آدمی اندھا ہوجاتا ہے تو سورج کی طرح روشن حقائق بھی اس کو نظر نہیں آتے''

(ماہنامہ ترجمان القرآن نومبر ۱۹۶۳ء ص ۱۳۱)

(۲) ہفت روزہ ''آئین'' لاہور ص ۹ مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۷۰ء پر حسب ذیل سوال وجواب شائع ہوا ہے:

سوال: صحابہ کرامؓ کو برا بھلا کہنے والا۔ ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنے والا جو دینداروں کی شان سے بعید نہیں فاسق وگناہگار ہے یا نہیں؟

جواب از مودودی: صحابہ کرام کو برا بھلا کہنے والا میرے نزدیک صرف فاسق ہی نہیں بلکہ اس کا ایمان بھی مشتبہ ہے۔ من ابغضهم فببغضي ابغضهم

(ایضاً ترجمان القرآن اگست ۱۹۶۱ء)

(۳) آیت ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین امنوا ربنا انک رء وف رحیم. اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لئے کوئی بغض نہ رکھ، اے ہمارے رب تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ (ترجمہ مودودی) نمبر ۲۱ کی تشریح میں لکھتے ہیں:۔'' ان سب سے بڑھ کر شدید

برائی یہ ہے کہ کوئی شخص ان لوگوں کے حق میں بدگوئی کرے جنہوں نے سخت آزمائشوں کے دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا حق ادا کیا تھا اور اپنی جانیں لڑا کر دنیا میں اسلام کا وہ نور پھیلایا تھا جس کی بدولت آج ہمیں نعمت ایمان میسر ہوئی ہے، ان کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے ان میں اگر ایک شخص کسی فریق کو حق پر سمجھتا ہو اور دوسرے فریق کا موقف اس کی رائے میں صحیح نہ ہو تو وہ یہ رائے رکھ سکتا ہے اور اسے معقولیت کے حدود میں بیان بھی کر سکتا ہے مگر ایک فریق کی حمایت میں ایسا غلو کہ دوسرے فریق کے خلاف دل بغض ونفرت سے بھر جائے اور زبان وقلم سے بدگوئی کی تراوش ہونے لگے ایک ایسی حرکت ہے جو کسی خداترس انسان سے سرزد نہیں ہوسکتی۔

(تفسیر تفہیم القرآن جلد ۵ سورۃ الحشر ص ۴۰۴ طبع پنجم دسمبر ۱۹۷۳ء)

مذمت وتوہین صحابہؓ:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت صحابہ کے متعلق مودودی صاحب نے مندرجہ بالا عبارات میں مدح کی ہے۔ اب مودودی صاحب کے قلم سے حسب ذیل عبارات بھی ملاحظہ فرمالیں:

(۱) بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہوجاتا تھا اور ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے۔ ابن عمرؓ نے سنا کہ ابوہریرہؓ وتر کو ضروری نہیں سمجھتے، فرمانے لگے ابوہریرہؓ جھوٹے ہیں، حضرت حسن بن علیؓ سے ایک مرتبہ شاھد ومشھود کے معنی پوچھے گئے انہوں نے اس کی تفسیر بیان کی۔ عرض کیا گیا ابن عمر اور ابن زبیر تو ایسا ایسا کہتے ہیں، فرمایا دونوں جھوٹے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر مغیرہ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیا۔ عبادہ بن الصامت نے ایک ایسا مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعودؓ بن اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگا دیا حالانکہ وہ بدری صحابہ میں سے ہیں"

(تفہیمات جلد اول ص ۲۹۳)

(۲) سورۃ آل عمران کی آیت الذین ینفقون فی السرآء والضرآء کی تفسیر میں جنگ

احد کی شکست کا سبب بیان کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں:

"سود خوری جس سوسائٹی میں موجود ہوتی ہے اس کے اندر سود خوری کی وجہ سے دو قسم کے اخلاقی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ سود لینے والوں میں حرص وطمع۔ بخل اور خود غرضی اور سود دینے والوں میں نفرت، غصہ اور بغض وحسد، احد کی شکست میں ان دونوں قسم کی بیماریوں کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل تھا الخ

(تفسیر تفہیم القرآن جلد اول سورۃ آل عمران ص ۲۸۸ تیرہواں ایڈیشن جنوری ۱۹۷۲ء)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک باوجود رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یافتہ ہونے اور جانبازی ونصرت کے انصار مدینہ میں ابھی حرص، طمع، بخل اور خود غرضی، نفرت، غصہ، بغض وحسد جیسی سود خوری کی نفسانی دنیوی خطرناک بیماریاں باقی تھیں جن کی وجہ سے جنگ احد میں شکست ہوئی، العیاذ باللہ۔

(۳) مودودی صاحب نے اپنی مایہ ناز تحقیقی کتاب "خلافت وملوکیت" میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی جو مجموعی تصویر کھینچی ہے اس کو اگر کوئی شخص مودودی عینک سے دیکھے تو العیاذ باللہ اس کو صحابہ کرامؓ سے وہ حسن ظن باقی نہیں رہتا جن کے وہ مستحق ہیں اور جن کے فضائل و خصوصیات اسلامیہ پر کتاب وسنت گواہ ہیں۔ چنانچہ خود مفتی محمد یوسف صاحب (جو مودودی صاحب کی طرف سے دفاع کا فریضہ سرانجام دینے والے ہیں) خلافت وملوکیت سے متاثر ہو کر مودودی صاحب کو اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

(ا) "مگر یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آپ کے اس مضمون کے آخری حصہ کے مطالعہ سے ایک قاری کے ذہن میں بعض صحابہ کرام کے متعلق جو تصور قائم ہوجاتا ہے وہ انتہائی غلط بلکہ بہت برا تصور ہے جو یقینی طور پر اس اعتقاد کو متزلزل کر دیتا ہے جو دین کے بارے میں پوری امت کو حضرات صحابہ کرام کی ذوات قدسیہ پر حاصل ہے، خاص کر مضمون کے بعض حصوں میں سیرت وکردار کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس سے ان لوگوں کے اذہان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو صحابہ کرام کے متعلق انتہائی پاکیزہ

بلکہ معصومانہ تصور رکھتے ہیں۔"

(ب) اسی طرح تحکیم کے معاملہ میں بھی حضرت عمروؓ بن العاص کا جو طرز عمل پیش کیا گیا ہے اس سے بھی عمروؓ بن العاص کے متعلق ذہن میں یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ وہ اپنے امیر کی طرح معاذ اللہ بڑے دھوکہ باز، چالاک اور حد درجہ کے سازشی آدمی تھے۔ نیز مغیرہؓ بن شعبہ کی طرف یزید کی ولی عہدی کے متعلق جو تجویز منسوب کی گئی ہے اس سے بھی حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں یہ گندہ تصور ذہن میں قائم ہوجاتا ہے کہ وہ معاذ اللہ انتہائی جاہ پسند، لالچی اور مفاد پرست تھے۔ کیا یہی وہ پاکیزہ تصورات ہیں جو امت کو صحابہ کرامؓ کے بارے میں حاصل ہونے چاہئیں۔ یہی اس مضمون کا وہ مضر پہلو ہے جس کے زہریلے اثرات سے دور حاضر کے مسلمان ذہنوں کو محفوظ رکھنا بڑا دشوار ہے۔"

(نوٹ) مفتی محمد یوسف صاحب کے ان خطوط کی تفصیل علمی محاسبہ میں دوبارہ ملاحظہ فرمائی جائے۔

حضرت معاویہؓ کی مذمت:

اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے زیادہ کھل کر جن کے خلاف زہر اگلا ہے وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ چنانچہ ابوالاعلیٰ صاحب رقمطراز ہیں۔

(۱) ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے حتی کہ مسجد نبویؐ میں منبر رسول پر عین روضہ نبوی کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے، کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین واخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا الخ

(خلافت وملوکیت ص ۱۷۴، اشاعت اول ۱۹۶۶ء)

۲۔ مال غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی" (ایضاً ص ۱۷۴)

۳۔ زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ زیاد طائف کی ایک لونڈی سمیہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت میں حضرت معاویہؓ کے والد جناب ابوسفیانؓ نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور اس سے وہ حاملہ ہوئی۔ حضرت ابوسفیانؓ نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زیاد انہی کے نطفہ سے ہے۔ جوان ہوکر یہ شخص اعلیٰ درجہ کا مدبر، منتظم، فوجی لیڈر اور غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ثابت ہوا۔ حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں وہ آپ کا زبردست حامی تھا اور اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں۔ ان کے بعد حضرت معاویہؓ نے اس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زناکاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد انہی کا ولد الحرام ہے پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دیدیا[(۱)] الخ

(ایضاً ص ۱۷۰)

---

(۱) مودودی کی طرف سے حضرت معاویہؓ پر بہتان کا جواب مختصر طور پر تو میں نے اپنی کتاب "مودودی مذہب" میں دے دیا ہے اور مفصل جواب جناب مولانا تقی صاحب عثمانی مدیر ماہنامہ "البلاغ" کراچی نے اپنی کتاب "حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق" میں دیا ہے۔ ماشاء اللہ مولانا موصوف کی یہ کتاب قابل مطالعہ ہے جس میں علمی طور پر مودودی تلبیسات کا جواب بہت متانت سے دیا گیا ہے، مجموعی اعتبار سے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

(ب) روافض کی طرف سے جو بہتان حضرت معاویہؓ پر لگایا جاتا ہے کہ آپ منبر رسول ﷺ پر حضرت علی المرتضیٰؓ کو گالیاں دیتے تھے اسی کو مودودی صاحب نے خلافت وملوکیت میں پُرزور طور پر دُہرایا ہے، لیکن مودودی صاحب نے تاریخ کا یہ حوالہ کیوں نہیں نقل کیا کہ لعنت کرنے کی ابتداء حضرت علیؓ کی طرف سے ہوئی تھی۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت معاویہؓ کی منقبت:

مندرجہ بالا تین نمبروں میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جو الفاظ مودودی صاحب نے استعمال کئے ہیں کیا یہ مہذب گالیاں نہیں ہیں۔ کیا ایسے افعال کا مرتکب شرعاً فاسق نہیں ہوگا۔ کیا ایسا شخص قابل احترام سمجھا جاتا ہے لیکن مودودی صاحب یہ سب کچھ لکھنے کے باوجود اسی کتاب ''خلافت وملوکیت'' میں لکھتے ہیں کہ:

(۱) البتہ ان واقعات کے بیان میں یہ احتیاط ملحوظ رہنی چاہئے کہ بات کو صرف بیان واقعہ تک محدود رکھا جائے اور کسی صحابی کی بحیثیت مجموعی تنقیص نہ ہونے پائے۔ یہی احتیاط میں نے امکانی حد تک پوری طرح ملحوظ رکھی ہے'' (ص ۳۰۵)

تبصرہ: ماشاء اللہ کیا احتیاط ہے! اگر احتیاط بھی ملحوظ نہ رکھتے تو خدا جانے کن کن الفاظ سے وہ حضرت معاویہؓ کو یاد کرتے۔

(۲) مدح صحابہ کے عنوان کے تحت نمبر ۲ میں مودودی صاحب کا یہ بیان گزر چکا ہے

کیا حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ پر لعنت کی:

چنانچہ تاریخ ابن خلدون میں واقعہ تحکیم کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ: ابوموسیٰؓ (اشعری) مجلس حکم سے نکل کر مکہ چلے گئے اور عمرو بن العاص مع اہل شام، شام کی طرف واپس ہوئے، معاویہؓ سے کل ماجرا بیان کر کے خلافت سپرد کی۔ ابن عباس اور شریح، امیر المؤمنین علیؓ کی خدمت میں آئے اور کل واقعہ بیان کیا۔ امیر المؤمنین علیؓ نماز میں قنوت پڑھنے اور بددعا کرنے لگے اَللّٰھُمَّ الْعَنْ معاویة وعمروا وحبیبا وعبدالرحمٰن بن مخلص والضحاک بن قیس واباالاعور (ترجمہ) اے اللہ! لعنت بھیج اوپر معاویہ، عمرو بن العاص........ کے الخ۔ معاویہؓ کو جب اس کی خبر لگی تو وہ بھی حضرت علیؓ وابن عباس وحسن وحسین واشتر پر لعن کرنے لگے (تاریخ ابن خلدون مترجم جلد اول ص ۵۳۹، اشاعت اول جون ۱۹۶۶ء مطبوعہ نفیس اکیڈمی) ہم نے یہاں ابن خلدون کی عربی عبارت بخوف طوالت ترک کردی ہے۔ اس روایت میں تصریح ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ پر لعن کرنے میں سبقت کی اور حضرت معاویہؓ نے پھر جوابی کارروائی شروع کی۔ لیکن مودودی صاحب حضرت علیؓ کی لعنت کرنے کی روایت کا ذکر نہیں کرتے۔ صرف وہ روایات پیش کرتے ہیں جن سے حضرت معاویہؓ کی شخصیت مجروح ہو۔ کیا یہ دیانت داری ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ''دونوں قسم کی روایتیں غلط ہیں، نہ حضرت علیؓ نے لعنت کی ہے نماز میں اور نہ معاویہؓ نے خطبہ جمعہ میں۔ علامہ ابن کثیر نے ان دونوں قسم کی روایتوں کو غلط قرار دیا ہے۔

کہ: ''صحابہ کرام کو بُرا بھلا کہنے والا میرے نزدیک صرف فاسق ہی نہیں بلکہ اس کا ایمان بھی مشتبہ ہے۔'' تو اب ناظرین خود ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ مودودی صاحب کا ایمان مشتبہ ہے یا نہیں؟

(۳) اسی خلافت وملوکیت میں حضرت معاویہؓ کی مدح سرائی ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ: ''حضرت معاویہؓ کے محامد ومناقب اپنی جگہ پر ہیں، ان کا شرف صحابیت بھی واجب الاحترام ہے۔ ان کی یہ خدمت بھی ناقابل انکار ہے کہ اُنہوں نے پھر سے دُنیائے اسلام کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا اور دنیا میں اسلام کے غلبہ کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع کردیا۔ ان پر جو شخص لعن طعن کرتا ہے وہ بلاشبہ زیادتی کرتا ہے۔ لیکن ان کے غلط کام کو تو غلط کہنا ہی ہوگا۔ اُسے صحیح کہنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنے صحیح وغلط کے معیار کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔'' (خلافت وملوکیت ص ۱۵۳)

(ب) ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت معاویہؓ غلطی سے پاک تھے اور آپ سے غلطی نہیں ہوئی، لیکن مذکورہ تین نمبروں میں اُنہوں نے جو حضرت معاویہؓ کے متعلق لکھا ہے کیا یہ عام غلطی ہے یا فسق وفجور کے افعال، سیاسی اغراض کے لئے کتاب وسنت کے صریح احکام کی خلاف ورزی کرنا، منبر رسول ﷺ پر خطبہ جمعہ کے دوران حضرت علی المرتضیٰؓ کو گالیاں دینا اور بقول مودودی زیاد جیسے ولد الحرام کو اپنا بھائی بنانے کے لئے والد ماجد کی زنا کاری پر شہادتیں لینا، کیا یہ صرف غلطیاں ہیں اور اگر اس قسم کے افعال کے ارتکاب کے باوجود بھی حضرت معاویہؓ واجب الاحترام ہیں تو مودودی صاحب کی اس تقیہ آمیز تحریر نے صحیح وغلط اور فاسق وفاجر اور واجب الاحترام کے معیار کو خود خطرے میں نہیں ڈال دیا؟ پھر یہ بھی تو قابل لحاظ امر ہے کہ حضرت معاویہ سے حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صلح کی اور یہ صلح حضور ﷺ کی پیش گوئی کا مصداق تھی۔ پھر تمام اُمتِ مسلمہ حضرت معاویہؓ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئی اور آپ کے دورِ خلافت میں غلبہ اسلام کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہوگیا۔ تو کیا یہ محامد ومناقب اس شخص کے ہیں جن کا کردار مودودی صاحب نے مذکورہ

تین نمبروں میں پیش کیا ہے۔ عبرت، عبرت، عبرت۔

مجبوری میں متعہ حلال ہے:

مودودی صاحب نے سورۃ المومنون کی پہلی آیت کے تحت متعہ کے بارے میں یہ لکھا تھا کہ: ''دوم یہ کہ متعہ کو مطلقاً حرام قرار دینے یا مطلقاً مباح ٹھہرانے میں سُنیوں اور شیعوں کے درمیان جو اختلاف پایا جاتا ہے اس میں بحث ومناظرہ نے بے جا شدت پیدا کردی ہے، ورنہ امرِ حق معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ انسان کو بسا اوقات ایسے حالات سے سابقہ پیش آجاتا ہے جن میں نکاح ممکن نہیں ہوتا اور وہ زنا یا متعہ میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ایسے حالات میں زنا کی بہ نسبت متعہ کرلینا بہتر ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے اور ایک مرد و عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے ایک ایسے سُنسان جزیرے میں پہنچتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو، وہ ایک ساتھ رہنے پر بھی مجبور ہیں اور شرعی شرائط کے مطابق ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہم خود ہی ایجاب وقبول کرکے عارضی نکاح کرلیں۔ جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں یا آبادی ان تک پہنچ جائے، کم وبیش ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہوسکتی ہیں۔ متعہ اس قسم کی اضطراری حالتوں کے لئے ہے۔'' (ماہنامہ ترجمان القرآن، اگست ۱۹۵۵ء)

متعہ مطلقاً حرام ہے:

جب مودودی صاحب کی مندرجہ عبارت پر علماء کی طرف سے اعتراض ہوا تو بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے مودودی صاحب نے جوابی مضمون میں یہ بیان دیا کہ میں خودتو متعہ کو مطلقاً حرام سمجھتا ہوں۔ میں نے اضطراری حالت میں متعہ کے حلال ہونے کی بات صرف شیعوں کی اصلاح کے لئے کہی تھی۔ چنانچہ ماہنامہ ترجمان القرآن نومبر ۵۵ء میں یہ لکھ دیا کہ: اس مسئلے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کا مُدعا دراصل یہ بتانا ہے کہ

صحابہ وتابعین اور فقہاء میں سے جو چند بزرگ جوازِ متعہ کے قائل ہوئے ہیں۔ ان کا منشاء اس فعل کا مطلق جواز نہ تھا بلکہ وہ اسے حرام سمجھتے ہوئے بحالت اضطرار جائز رکھتے تھے اور ان میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہ تھا کہ عام حالات میں متعہ کو نکاح کی طرح معمول بنایا جائے۔ اضطرار کی ایک فرضی مثال جو میں نے دی ہے اس سے محض اضطراری حالات کا ایک تصور دلانا مقصود تھا۔ تاکہ ایک شخص یہ سمجھ سکے کہ شیعہ حضرات کو اگر قائلینِ جواز کا مسلک ہی اختیار کرنا ہے تو انہیں کس قسم کی مجبوریوں تک اسے محدود رکھنا چاہئے۔ اس سے میں تو دراصل ان لوگوں کے خیال کی اصلاح کرنا چاہتا تھا جنہوں نے اضطرار کی شرط اُڑا کر متعہ کو مطلقاً حلال ٹھہرایا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ میرے طرزِ بیان سے آپ کی طرح بعض اصحاب کو یہ غلط فہمی لاحق ہوگئی کہ میں خود حالت اضطرار میں اس کو جائز قرار دے رہا ہوں، حالانکہ میں اس کی قطعی حرمت کا قائل ہوں اور اب سے کئی سال پہلے رسائل ومسائل حصہ دوم (صفحہ ۲۰-۲۳) میں اس کی تصریح کرچکا ہوں۔ بہرحال مطمئن رہیں کہ نظرثانی کے موقع پر اس عبارت میں اصلاح کردی جائے گی کہ اس طرح کی کسی غلط فہمی کا امکان نہ رہے الخ (ص ۶۱)

امرِ حق کیا ہے؟

متعہ کے متعلق مودودی صاحب کی دونوں تحریریں ہم نے یہاں پیش کردی ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کی دونوں عبارتوں میں تضاد ہے۔ اور مودودی صاحب نے بعد میں جو اپنی مراد ظاہر کی ہے وہ ان کی سابقہ عبارت کے خلاف ہے۔ یہاں حرمت متعہ کی بحث کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ بلکہ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ مودودی صاحب نے پہلی عبارت میں جو کچھ اضطراری حالت میں متعہ کے حلال ہونے کے متعلق لکھا تھا وہ امرِ حق کے تحت لکھا تھا۔ ان کے ان الفاظ کو ملحوظ رکھا جائے کہ: متعہ کو مطلقاً حرام قرار دینے یا مطلقاً مباح ٹھہرانے میں سُنیوں

اور شیعوں کے درمیان جو اختلاف پایا جاتا ہے اس میں بحث و مناظرہ نے بے جا شدت پیدا کر دی ہے۔ ورنہ امرِ حق معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے الخ۔ اس عبارت کا واضح مطلب یہ ہے کہ اہل سنت کا متعہ کو مطلقاً حرام قرار دینا بھی بے جا شدت ہے اور شیعوں کا مطلقاً متعہ کو مباح ٹھہرانا بھی بے جا شدت ہے۔ ورنہ امرِ حق یہ ہے کہ اضطراری حالت میں یہ حلال ہے۔

اب جو بات مودودی صاحب نے امرِ حق کے الفاظ سے بیان کی ہے کیا اس امرِ حق کو خود مودودی صاحب تسلیم نہیں کرتے تھے یا ان کے لئے یہ امرِ حق نہ تھا بلکہ یہ امرِ حق صرف شیعوں کے لئے تھا۔ کیا امرِ حق کی یہی تعریف ہے کہ وہ امرِ حق کے خلاف ہو۔ اور ایک داعی حق کا یہی مؤقف ہونا چاہئے کہ جو بات امرِ حق ہے وہ خود اس کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ مخالف حق کے لئے ہے **لاحول ولا قوۃ الا باللہ.** مودودی صاحب کا یہ جواب تو اس قسم کا ہے کہ ایک آدمی کا اپنا یہ عقیدہ ہے کہ زنا حرام ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بدکاروں کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ امرِ حق یہ ہے کہ وہ مجبوری میں زنا کر لیا کریں، العیاذ باللہ۔

(۲) پھر اضطراری صورت میں جس متعہ کو مودودی صاحب حلال اور مباح قرار دے رہے ہیں اور اس کو عارضی نکاح بھی کہہ رہے ہیں وہ بلا گواہوں کے ہے، حالانکہ اسلام میں حرمت متعہ کے اعلان سے پہلے بھی کسی درجہ میں اگر متعہ کی اباحت کا ثبوت ملتا ہے تو وہ نکاح موقت ہے جس میں با قاعدہ گواہ ہوتے تھے، لیکن جس میں گواہ ہی نہ ہوں وہ زنا ہے۔ اس کو نکاح قرار دینا خواہ عارضی ہی ہو مودودی صاحب کی ایک تاریخی جہالت ہے بلکہ ظلمِ عظیم ہے جس کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے اور مفتی محمد یوسف صاحب مصنف علمی جائزہ نے خود یہ لکھا ہے کہ ”ہم تو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ ضلالت اور گمراہی پر وہ عقیدہ اور قول و عمل ہے جو کتاب اللہ سے بھی ثابت نہ ہو اور سنت رسول سے بھی اور صحابہ کرام اور سلف صالحین کے تعامل میں بھی اس کا ثبوت موجود نہ ہو۔“

(علمی جائزہ حصہ دوم ص ۳۵۰، اشاعت اول جنوری ۱۹۶۸ء) مفتی صاحب موصوف نے گمراہی کی جو حقیقت یہاں بیان فرمائی ہے اس کی بنا پر ہم پوچھتے ہیں کہ مودودی صاحب نے اضطراری حالت میں جو متعہ بلا گواہوں کے حلال لکھا ہے اور اس کو عارضی نکاح بھی قرار دیا ہے وہ نہ کتاب اللہ سے ثابت ہے اور نہ سنت رسول اور صحابہ کرامؓ سے اور نہ ہی سلف صالحین کے تعامل سے۔ تو کیا آپ مودودی صاحب کے اس قول کو گمراہی مانتے ہیں؟

کتمانِ حق اور مفتی محمد یوسف:

مفتی صاحب نے علمی جائزہ حصہ دوم میں خلع اور متعہ وغیرہ ان فروعی مسائل پر بحث کی ہے جس میں علماء نے مودودی صاحب پر اعتراضات وارد کئے ہیں۔ ہم نے طوالت کے خوف سے ان مسائل سے علمی محاسبہ میں بحث نہیں کی۔ البتہ مودودی صاحب کی تضاد بیانی کے تحت مسئلہ متعہ کے متعلق یہاں کچھ عرض کر دیا۔ مفتی صاحب نے مودودی صاحب کی طرف سے مسئلہ متعہ میں پوری طرح دفاع کرنے کی کوشش کی ہے اور مودودی صاحب کے جوابی مضمون اور تفسیر تفہیم القرآن حصہ سوم کی عبارت سے یہ ثابت کیا ہے کہ مودودی صاحب خود متعہ کی قطعی حرمت کے قائل ہیں اور اضطراری حالت میں بھی مباح نہیں سمجھتے۔ لیکن ترجمان القرآن اگست ۱۹۵۵ء کی جس عبارت سے واضح ہوتا تھا کہ مودودی صاحب اضطراری حالت میں متعہ کو جائز قرار دیتے ہیں اس کو مفتی محمد یوسف صاحب نے بالکل درج نہیں کیا۔ حالانکہ وہی عبارت محلِ اعتراض تھی جس کی کسی طرح تاویل نہیں ہو سکتی، تو کیا یہ کتمانِ حق کا جرم نہیں ہے؟ کیا حق پرستی اور حق گوئی اسی کو کہتے ہیں؟ مفتی صاحب اصل معاملہ کی حقیقت کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:

”ترجمان القران ماہِ اگست ۱۹۵۵ء کے پرچے میں سورۃ مومنین کی ایک آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا مودودی نے ضمناً اس نزاع کا بھی ذکر کیا تھا جو متعہ کے مسئلہ پر شیعوں اور سنیوں کے مابین عرصہ دراز سے چلا آیا ہے اور فرمایا تھا کہ: ”انسان کو

بسا اوقات ایسے حالات پیش آتے ہیں جن میں نکاح ممکن نہیں ہوتا اور وہ زنا یا متعہ میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں زنا کی بہ نسبت متعہ کر لینا بہتر ہے۔" (علمی جائزہ حصہ دوم ص ۲۶۰) اس سے پہلی عبارت جو امرِ حق کے الفاظ سے ہے وہ مفتی صاحب نے یہاں بالکل ترک کر دی ہے، حالانکہ قابلِ اعتراض عبارت وہی ہے جو اس بحث کی ابتداء میں درج کر دی گئی ہے اور وہ یہ ہے:

"دوم یہ کہ متعہ کو مطلقاً حرام قرار دینے یا مطلقاً مباح ٹھہرانے میں سُنیوں اور شیعوں کے درمیان جو اختلافات پایا جاتا ہے اس میں بحث و مناظرہ نے بے جا شدت پیدا کر دی ہے، ورنہ امرِ حق معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ بسا اوقات ایسے حالات پیش آتے ہیں" الخ

کیا مفتی صاحب یہ بتا سکتے ہیں کہ اُنہوں نے یہ عبارت کیوں نہیں لکھی: ورنہ امرِ حق معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے؟ اس کو کتمان امرِ حق نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ بینوا توجروا۔

ناکام کے متضاد معنی:

(۱) مولوی محمد چراغ صاحب (گوجرانوالہ) کے جواب میں مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ: "حضرت نوحؑ کی مساعی اصلاح کے لئے اگر میں نے "ناکافی" کا لفظ استعمال کیا ہوتا تو البتہ یہ گستاخی بھی ہوتی اور خلاف واقعہ بھی۔ لیکن "ناکام" کا لفظ استعمال کرنے میں نہ تو ذم کا کوئی پہلو ہے اور نہ یہ خلافِ واقعہ ہے۔ اگر کوئی شخص کسی گمراہ آدمی یا قوم کی اصلاح کے لئے سعی کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھے اور وہ اصلاح قبول نہ کرے تو یہی کہا جائے گا کہ اس کی سعی اصلاح کارگر نہ ہوئی۔ اس میں ساعی کی توہین کا پہلو کہاں سے نکل سکتا ہے۔ رہے عیب چین حضرات تو ان کا منہ کسی حال میں بند نہیں کیا جا سکتا۔"

(مکاتیب مودودی حصہ دوم ص ۴۵، اشاعت اول ۱۹۷۲ء)

(۲) آغا شورش کشمیری مرحوم کے جواب میں لکھتے ہیں: "آپ کے عنایت نامے سے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ انتخابات کے خلاف توقع نتائج کے فوری اثر نے آپ کے

ذہن پر یاس و قنوط کی کیفیت طاری کر دی ہے، حالانکہ آپ جیسے پختہ عزم اور قوی زندگی کا طویل تجربہ رکھنے والے آدمی کو اس کا اتنا اثر قبول نہ کرنا چاہئے تھا۔ اگر دنیا حق کو نہیں مانتی تو حق ناکام نہیں ہے۔ بلکہ ناکام وہ دُنیا ہے جس نے اُسے نہ مانا اور باطل کو قبول کر لیا۔ مصائب حق پر نہیں بلکہ اہلِ حق پر آتے ہیں لیکن جو لوگ سوچ سمجھ کر کامل قلبی اطمینان کے ساتھ یہ فیصلہ کر چکے ہوں کہ اُنہیں بہر حال حق ہی پر قائم رہنا اور اسی کا بول بالا کرنے کے لئے اپنا سرمایۂ حیات لگا دینا ہے، وہ مصائب میں تو مبتلا ضرور ہو سکتے ہیں لیکن ناکام کبھی نہیں ہو سکتے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انبیاء ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ساری عمر دین کی طرف دعوت دینے میں کھپا دی اور ایک آدمی بھی ان پر ایمان نہ لایا۔ کیا ہم انہیں ناکام کہہ سکتے ہیں؟ یا نہیں "ناکام" وہ قوم ہوئی جس نے انہیں رد کر دیا اور باطل پرستوں کو اپنا رہنما بنایا۔" (ایضاً مکاتیب مودودی جلد دوم ص ۲۹۰، ۱۹ دسمبر ۱۹۷۰ء)

چونکہ مودودی صاحب حضرت نوح علیہ السلام کے لئے پہلے "ناکام" کا لفظ استعمال کر چکے ہیں اس لئے مولوی محمد چراغ صاحب کے اعتراض کے جواب میں یہ کہہ دیا کہ "ناکام" کے لفظ میں حضرت نوح علیہ السلام کی کوئی مذمت اور توہین نہیں ہے اور شورش صاحب نے غالباً یہ لکھا ہے کہ انتخابات میں مودودی صاحب کی جماعت ناکام ہوئی ہے تو ناکام کا لفظ اپنے لئے توہین آمیز سمجھا، اس لئے جواب میں فرما دیا کہ اہلِ حق ناکام نہیں ہوتے، بعض ایسے نبی بھی گزرے ہیں کہ ایک آدمی بھی ان پر ایمان نہیں لایا، لیکن باوجود اس کے ان کو ناکام نہیں کہہ سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مودودی صاحب کے نزدیک "ناکام" کے لفظ میں توہین پائی جاتی ہے۔ کیا یہ کھلی تضاد بیانی نہیں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے لئے تو ناکام کا لفظ گوارا کر لیا لیکن اپنے لئے برداشت نہ کر سکے ؎

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

تحریک آزادئ ہنداور پاکستان:

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے لے کر برصغیر (ہندوستان) کے آزاد ہونے تک انگریزی استبداد کے خلاف اکابر علمائے دیوبند کی قربانیوں کی تاریخ ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گی۔[۱] شیخ المشائخ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کی امارت میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانئ دارالعلوم دیوبند نے ۵۷ء میں فرنگی حکومت کے خلاف مسلح جہاد کیا تھا۔ بعد ازاں شیخ الہند حضرت مولانا محمودالحسن صاحبؒ اسیر مالٹا[۲] کی تحریک نے انگریزی حکومت کی بنیادیں ہلادیں۔ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے موقع پر ترکوں کی حمایت اور انگریزوں کی مخالفت کے جرم میں حضرت شیخ الہندؒ[۳] معہ اپنے جانثار تلامذہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ اور حضرت مولانا عزیز گل صاحب سرحدیؒ تقریباً چار سال جزیرہ مالٹا میں جنگی قیدی کی حیثیت سے نظر بند رہے۔ ان حضرات نے ہر قسم کا تشدد برداشت کیا، لیکن پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں پیدا ہوئی۔ اسارت مالٹا کے بعد بھی حضرت مولانا مدنی وغیرہ علمائے حق (رحمہم اللہ) نے انگریزی اقتدار کے دوران جیلوں میں حق گوئی اور جانبازی کے سُنہری نقوش یادگار چھوڑے ہیں۔[۴]

تحریک پاکستان:

جب آزادئ ہند کا مرحلہ قریب آیا تو مسلمانانِ ہند میں یہ اختلاف پیدا ہوگیا کہ انگریزی تسلط سے آزادی متحدہ ہندوستان کی صورت میں ہو یا ہندو مسلم دو مختلف قوموں کی بنا پر ملک تقسیم ہوجائے اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ

---

(۱) ملاحظہ ہو علماء ہند کا شاندار ماضی مؤلفہ حضرتِ مولانا محمد میاں صاحب مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) اسارت مالٹا کے مستند حالات معلوم کرنے کے لئے کتاب "اسیر مالٹا" مؤلفہ حضرت مدنی قابل مطالعہ ہے۔

(۳) ملاحظہ ہو "تحریک شیخ الہند" مؤلفہ حضرت مولانا محمد میاں صاحب۔ اس کتاب میں تحریک شیخ الہند اور تحریک ریشمی رومال کے متعلق انڈیا آفس لنڈن میں سی آئی ڈی کی دستاویزات کا ترجمہ بھی شائع کردیا گیا ہے۔ یہ کتاب حال ہی میں مکتبہ رشیدیہ شاہ عالم مارکیٹ لاہور نے شائع کی ہے۔

(۴) چنانچہ کراچی کیس کے دوران حضرت مدنیؒ نے عدالت میں انگریزوں کے خلاف جو سرفروشانہ بیان دیا تھا اس پر مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے حضرت مدنی کے پاؤں چوم لئے تھے۔ کراچی کیس کتابی شکل میں بھی شائع ہوچکا ہے۔

پاکستان کے نام پر مسلم سٹیٹ بن جائے۔ کانگریس اور جمعیت علمائے ہند تقسیم ہند یعنی نظریۂ پاکستان کے خلاف تھیں اور مسلم لیگ نظریۂ پاکستان کی حامی۔ مسلمانوں کی اکثریت نے نظریۂ پاکستان کی حمایت کی۔ تقسیم ہند یعنی نظریہ پاکستان کے بارے میں اکابر دیوبند میں بھی اختلاف واقع ہوگیا۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے نظریہ پاکستان کی حمایت کی اور جمعیت علمائے اسلام کی بنیاد رکھی۔ اس دور میں جمعیت علمائے ہند کے صدر جانشینِ شیخ الہند حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند تھے۔ لیکن یہ اختلاف چونکہ سیاسی تھا، اور دونوں طرف کے اکابر اپنی اپنی رائے میں مخلص تھے، اس لئے یہ حضرات ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے۔ چنانچہ مسلم لیگ کانفرنس میرٹھ کے خطبہ صدارت میں علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے حضرت مولانا مدنی کے متعلق یہ فرمایا کہ "بعض مقامات پر جو ناشائستہ برتاؤ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے ساتھ کیا گیا ہے، اگر اس کے متعلق اخبارات کی روایات صحیح ہیں تو میں اس پر اظہار بیزاری کئے بدوں نہیں رہ سکتا۔ مولانا کی سیاسی رائے خواہ کتنی ہی غلط ہو ان کا علم و فضل بہر حال مسلّم ہے اور اپنے نصب العین کے لئے ان کی عزیمت و ہمت اور اَن تھک جدوجہد ہم جیسے کاہلوں کے لئے قابلِ عبرت ہے۔ اگر مولانا کو اب مسلم لیگ کی تائید کی بنا پر میرے ایمان میں خلل بھی نظر آئے یا میرے اسلام میں شبہ ہو تو مجھے ان کے ایمان اور بزرگی میں کوئی شبہ نہیں الخ (خطبۂ صدارت ص ۲۷، مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۵ء)

(ب) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری دام فضلہم شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی نے فرمایا ہے کہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے دارالعلوم دیوبند کے ایک اجلاس میں حضرت مدنیؒ کی موجودگی میں یہ فرمایا تھا کہ:

"بھائیو! اس سے زیادہ میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ میرے علم میں بسیط ارض پر

شریعت وطریقت وحقیقت کا حضرت مولانا مدنی سے بڑا کوئی عالم موجود نہیں۔"

(شیخ الاسلام نمبر ص ۲۸)

(ج) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے ممتاز خلیفہ حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ صاحب امرتسری بانی جامعہ اشرفیہ لاہور نے ایک مرتبہ مجھے یہ بتایا تھا کہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی بیمار پُرسی کے لئے حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ بانی مدرسہ خیر المدارس ملتان (خلیفہ حضرت تھانویؒ) بہاولپور ہاؤس میں تشریف لے گئے تھے۔ وہاں بھی اکابر دیوبند کے باہمی سیاسی اختلاف کا تذکرہ ہوا تو حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے فرمایا کہ: مجھے اپنے خلوص میں تو شبہ ہوسکتا ہے لیکن مولانا مدنیؒ کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں ہے۔"

بہرحال آخرکار ۱۹۴۷ء میں جب تقسیم ہند کی سکیم منظور ہوئی اور پاکستان قائم ہوگیا تو پھر حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ پاکستان کی ترقی اور استحکام کے لئے دعائیں کرتے رہے۔

پاکستان اور مودودی:

ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے شعبان ۱۳۶۰ھ اگست ۱۹۴۱ء میں اپنی جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی ہے۔ اس دَور میں آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں سیاسی اختلافات زوروں پر تھے۔ لیکن مودودی صاحب نے کسی جماعت سے بھی اشتراک اور تعاون نہیں کیا۔ اُنہوں نے مسلم لیگ، جمعیت علمائے ہند، مجلسِ احرار اور کانگریس، سب جماعتوں پر سخت تنقید کی اور مودودی صاحب گو کانگریس اور جمعیت علمائے ہند کی پالیسی کے سخت خلاف تھے لیکن اُنہوں نے مسلم لیگ اور نظریہ پاکستان کی بھی تائید نہیں کی، بلکہ لیگ اور مطالبہ پاکستان کے خلاف بھی بھرپور مضامین لکھتے رہے۔ اب پاکستان میں جب کبھی اس قسم کے مباحث اخبارات و رسائل میں چھڑ جاتے ہیں تو مودودی صاحب پر بھی

پاکستان کی مخالفت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ مہینوں میں بھی جب یہ بحث اخبارات میں آئی اور مودودی صاحب کی حمایت یا مخالفت میں مضامین شائع ہوئے تو روزنامہ نوائے وقت کے ایڈیٹر صاحب کے استفسار پر نوائے وقت ۱۴-اگست ۱۹۷۶ء میں ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ایک جوابی مضمون بعنوان "تحریک پاکستان اور جماعت اسلامی" شائع ہوا ہے، جس میں مودودی صاحب نے تاویلات کے پردوں میں باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے مخالف نہ تھے۔ چنانچہ اپنی جماعت اسلامی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ خیال کرنا کہ اس جماعت کا قیام مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے اور تحریک پاکستان کے خلاف ایک دوسری تحریک اُٹھانے کے لئے کیا گیا تھا، محض ایک بے جا بدگمانی ہے۔"

"علاوہ بریں یہ بدگمانی صرف اسی صورت میں صحیح ہوسکتی تھی جبکہ جماعت نے تحریکِ پاکستان کے خلاف کوئی مہم چلائی ہوتی یا کوئی جلسہ کیا ہوتا یا کوئی قرارداد پاس کی ہوتی یا اس کے اجتماعات میں مخالفانہ تقریریں کی گئی ہوتیں۔ لیکن اگست ۴۱ء سے اگست ۴۷ء تک جماعت کی پوری کارروائیوں میں ایسی کسی چیز کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو وہ بس یہ کہ ہم نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اسے اگر کوئی شخص مخالفت سمجھتا ہے تو غالباً وہ اس نظریے کا قائل ہے کہ "جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا مخالف ہے" الخ۔

مودودی صاحب کا تاریخی جھوٹ:

ہم نہیں جانتے کہ مودودی صاحب نے پاکستان کے خلاف کوئی قرارداد پاس کی تھی یا نہ، لیکن مودودی صاحب نے اپنے قلم سے مسلم لیگ اور نظریہ پاکستان کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس کے بعض اقتباسات حسب ذیل ہیں:

(۱) ''پاکستانی خیال کے لوگ'' کے عنوان کے تحت مودودی صاحب نے یہ لکھا تھا کہ: ''دوسرا گروہ زیادہ تر اس طبقہ پر مشتمل ہے جس نے تمام تر مغربی طرز پر ذہنی تربیت پائی ہے۔ یہ لوگ سیاسی فکر تو مغربی مآخذ سے لیتے ہیں مگر چونکہ موروثی طور پر اسلام کے حق میں ایک تعصب ان کے اندر موجود ہے اور ''مسلمان قوم'' ہونے کا شعور ان کے اندر بیدار ہو گیا ہے اس لئے جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں، مسلمان قوم کے لئے اسلام کے نام ہی کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اقوال اور افعال میں اسلامی اصطلاحات اور مغربی طرزِ فکر و عمل عجیب طریقہ سے خلط ملط ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس مضمون میں یہ موقع نہیں ہے کہ میں اس غلط مبحث کا تجزیہ کر کے تفصیل کے ساتھ اس مخلوطہ کے ایک ایک جز کی اصل نوعیت کا نشان دے سکوں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پہلے گروہ کی طرح اس گروہ کا راستہ بھی راہِ راست کے تینوں اجزاء سے منحرف ہے۔

(۱) پہلے دعوت کو لیجئے: ان کے ذمہ دار لیڈروں کی تقریریں، ان کی نمائندہ مجالس کی قراردادیں، ان کے کارکنوں کی باتیں، ان کے اہلِ قلم کی تحریریں، سب کی سب اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ ان کی دعوت اصل میں ایک قوم پرستانہ دعوت ہے۔ یعنی ان کی پکار اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں ہے بلکہ اس طرف ہے کہ ان کی قوم متفق و متحد ہو کر ہندو قوم کے مقابلہ میں اپنے دُنیوی مفاد کی حفاظت کرے۔ گویا جس طرح آزادی پسند لوگوں نے انگریزوں کو اپنا قومی حریف بنایا ہے اسی طرح اُنہوں نے ہندوؤں کو اپنا قومی حریف بنا لیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اور ''آزادی پسند'' حضرات ایک سطح پر کھڑے ہیں۔ لیکن جس چیز نے ان کی بہ نسبت ان کی روش کو اسلام کے لئے اور زیادہ مضر بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تو وطن اور وطن مفاد کے نام پر لڑتے ہیں۔ مگر یہ اپنی قومی اور دُنیوی لڑائی میں بار بار اسلام کا اور مسلم کا نام لیتے ہیں، جس کی وجہ سے اسلام خواہ مخواہ ایک فریقِ جنگ بن کر رہ گیا ہے۔ اور غیر مسلم قومیں اس کو اپنا سیاسی اور معاشی حریف سمجھنے لگی ہیں'' (سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۱۰۴، ۱۰۴، بار ششم)

(۲) اور اوپر چلئے۔ آپ کی سب سے بڑی قومی مجلس مسلم لیگ جس کو نو کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے۔ ذرا اس کو دیکھئے کہ اس وقت وہ کس روش پر چل رہی ہے۔ موجودہ جنگ کے آغاز میں اس نے اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا اور پھر وائسرائے کے اعلان پر جس رائے کا اظہار کیا اس کو پڑھئے اور بار بار پڑھئے۔ اگر آپ ایک اصول پرست جماعت کے طرزِ عمل اور ایک ایسی جماعت کے طرزِ عمل میں جو محض اپنی قوم کی سیاسی اغراض کی خدمت کے لئے بنی ہو، فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو اول نظر میں آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ جنگ کے موقع پر جو پالیسی لیگ نے اختیار کی ہے وہ اصول پرستی کے ہر نشان سے خالی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ در حقیقت یہی پالیسی مسلمانوں کے ذہن کی ترجمانی کرتی ہے تو اس کے آئینے میں ہر صاحبِ نظر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ ان نام نہاد مسلمانوں پر پوری طرح اخلاقی موت وارد ہو چکی ہے (ایضاً ص ۲۹۷)

(۳) اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اس کے ان کی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے پیشِ نظر ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں، مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بالفاظِ دیگر ان کو مطمئن کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے۔ باقی رہا نظام حکومت[1] تو وہ پاکستان میں بھی ویسا ہی ہوگا

---

(۱) یہاں تو مودودی صاحب یہ لکھ رہے ہیں کہ لیگ کے ذمہ دار لیڈروں نے یہ بات واضح نہیں کی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے اور یہ کہ پاکستان میں بھی ہندوستان کی طرح جمہوری حکومت ہوگی اور اس بنا پر مجوزہ پاکستان کو ''مسلمانوں کی کافرانہ حکومت'' اور ناپاکستان قرار دے رہے تھے لیکن اب نوائے وقت ۱۴-اگست ۱۹۷۶ء میں اس کے برعکس یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ: اس تحریک کے آغاز ہی سے عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی تمناؤں کا مرکز پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگا جس میں اسلام کا قانون جاری ہوگا۔ اور اسلامی تہذیب زندہ کی جائے گی۔ اسی لئے ان کا نعرہ یہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ. مسلم لیگ کے لیڈر بھی اپنی تقریروں میں یہی خیال ظاہر کر رہے تھے اور سب سے بڑھ کر قائد اعظم مرحوم و مغفور نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان کا دستور قرآن ہوگا۔ فرمایئے ان دونوں میں سے مودودی صاحب کی کونسی بات سچی ہے اور کونسی جھوٹی؟

جیسا ہندوستان میں ہوگا۔ ان کے اس نصب العین پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطہ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابل ترجیح نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل لعنت ہے الخ (حاشیہ ص ۱۰۶)

(۴) جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح سوسائٹی اگر بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسرِ اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشاتِ نفس سے سند قبولیت حاصل کر سکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہیہ قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومت الٰہیہ رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔" (ص ۱۰۸)

(۵) مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہوں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک جو سوال سب سے اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس پاکستان میں نظامِ حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریہ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ پاکستان ہوگا، ورنہ بصورت دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان" جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپ کی سکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کریں گے بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک۔" (ص ۷۶)

(۶) اس نام نہاد "مسلم حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جس کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لئے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِّ راہ ثابت ہوگی" (ص ۱۳۷)

مودودی صاحب کی معرکۃ الآراء کتاب سیاسی کشمکش حصہ سوم کی جو عبارتیں ہم نے اوپر درج کی ہیں ان سے ہر صاحب علم وفہم انسان یہی نتیجہ نکالے گا کہ مودودی صاحب کھلم کھلا مسلم لیگ اور نظریۂ پاکستان کے مخالف تھے اور ہر پہلو سے اُنہوں نے نظریہ پاکستان کی خرابیاں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسلم لیگ کے مجوزہ پاکستان کو ناپاکستان اور جمہوری کافرانہ حکومت قرار دینا بھی اگر مخالفت نہیں ہے تو پھر لغت میں سرے سے لفظ مخالفت کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ کیا مودودی صاحب کا یہ کہنا عظیم الشان تاریخی جھوٹ نہیں ہے کہ انہوں نے پاکستان کی مخالفت نہیں کی اور زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ بس یہ کہ ہم نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا تھا۔"
(نوائے وقت، ۱۴۔ اگست ۱۹۷۶ء)

تاریخی جھوٹ نمبر ۲:

نوائے وقت ۱۴۔ اگست ۱۹۷۶ء میں بعنوان "قائد اعظم اور میں" مودودی صاحب کا ایک خط شائع ہوا ہے جو اُنہوں نے یکم اگست ۱۹۷۶ء کو نوائے وقت کے ایڈیٹر صاحب کے نام لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ:

"آپ کی معلومات کے لئے اتنا ہی کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد جب سے میں نے ملکی سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی تھی میرے دل میں مسلمانوں کے جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا ان میں سے ایک قائد اعظم مرحوم بھی تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کو ایک بااُصول، راست باز اور مضبوط سیرت و کردار کا مالک انسان سمجھا اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کبھی میرے دل میں ان کے متعلق یہ بدگمانی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف بھی کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔ رائے کا اختلاف تو بڑے سے بڑے آدمیوں سے بھی ہو سکتا ہے خواہ وہ زندہ ہوں یا اپنے رب کے پاس جا چکے ہوں۔ اس قسم کا اختلاف مجھے جس کسی سے بھی ہوا ہے میں نے دلیل اور شائستگی کے ساتھ اس کا اظہار

کیا ہے۔ لیکن اس کو مخالفت کا ہم معنی سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ جس کی رائے سے میں اختلاف کرتا ہوں اس کو بدنیت اور غیر مخلص سمجھتا ہوں، یہ دراصل ایک بے بنیاد سوءِ ظن ہے۔ قائداعظم مرحوم کے متعلق مجھے کبھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے معاملے میں مخلص نہ تھے۔ البتہ ان کے پس ماندگان کے متعلق مجھے یہ شبہ ضرور ہے کہ وہ ان کی ہم نوائی میں مخلص نہ تھے اور یہ شبہ ان حضرات کے ان اعمال کی بنا پر ہے جو اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ کرتے رہے۔ ان پر تنقید کے معنی قائداعظم پر تنقید کے نہیں ہیں اور نہ ان کے عدم اخلاص کا شکوہ قائد کی ذات تک پہنچتا ہے۔''

تصویر کا دوسرا رُخ:

مندرجہ بالا عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے دل میں مسلم لیگ کے قائداعظم محمد علی جناح کا بڑا احترام ہے اور اُنہوں نے ان پر کبھی تنقید نہیں کی۔ لیکن قیامِ پاکستان سے پہلے مودودی صاحب کے دل میں ان کا جو کچھ احترام تھا وہ ان کی حسبِ ذیل تحریر سے واضح ہو جاتا ہے:

''اگر لیگ کے رہنماؤں میں اسلامی حس کا شائبہ بھی موجود ہوتا تو وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے اور اس کا جو گہرا اخلاقی اثر مرتب ہوتا اس کی قدر و قیمت کے مقابلہ میں کوئی نقصان جو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی وجہ سے حاصل ہونے کی توقع ہے قطعاً کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مگر افسوس کہ لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان بھی ویسی ہی ایک قوم ہیں جیسی دُنیا میں دوسری اور قومیں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ممکن سیاسی چال اور ہر مفید مطلب سیاسی تدبیر سے اس قوم کے مفاد کی حفاظت کر دینا ہی بس اسلامی سیاست ہے، حالانکہ ایسی ادنیٰ درجہ کی سیاست کو اسلامی سیاست کہنا اسلام کے لئے ازالہ

حیثیت عرفی سے کم نہیں۔'' (سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۱۳۱ بار ششم)

مودودی صاحب کی ان دونوں تحریروں کو پیشِ نظر رکھ کر قارئین فیصلہ کریں کہ کیا مودودی صاحب نے نوائے وقت ۱۴-اگست کے مضمون میں یہ صریح جھوٹ نہیں بولا کہ انہوں نے لیگ کے قائداعظم پر تنقید نہیں کی، بلکہ ان کے پسماندگان پر کی ہے۔

(ب) اگر مودودی صاحب کے نزدیک لیگ کے قائداعظم بھی اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر نہیں رکھتے اور وہ مسلمان کے معنی و مفہوم کو بھی نہیں سمجھتے تو وہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی کیونکر اہلیت رکھ سکتے ہیں۔ اور کیا اسلامی ذہنیت سے محروم ہونے کی بنا پر بھی آپ نے یوں مدح سرائی کی ہے کہ: ''میرے دل میں مسلمانوں کے جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا ان میں ایک قائداعظم مرحوم بھی تھے۔'' یقیناً یہ کھلی تضاد بیانی اور صریح جھوٹ ہے جو مودودی صاحب کے قلم سے صادر ہو رہا ہے۔ اور جھوٹ جھوٹ ہی ہے خواہ وہ مودودی صاحب سے بحیثیت ایک مفکر اسلام، داعیٔ حق اور بانیٔ جماعت اسلامی سے سرزد ہو یا کسی جرائم پیشہ ادنیٰ انسان سے۔

تقیہ اور مودودی:

مسلم لیگ اور اس کے قائداعظم محمد علی جناح کے متعلق مودودی صاحب کے مذکورہ متضاد بیانات کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ صحیح تاویل و توجیہ نہیں پیش کی جا سکتی۔ البتہ صرف ایک صورت شیعہ مذہب کے تقیہ کی ایسی ہے جس کی بنا پر مودودی صاحب کا دامن جھوٹ کے داغ سے پاک صاف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور شیعہ مذہب کی رو سے ان کا تقیہ بجائے گناہ کے کارِ ثواب بن جاتا ہے۔ چنانچہ شیعہ مذہب کی سب سے زیادہ صحیح کتابِ حدیث اصول کافی میں تقیہ کی روایات میں سے بطورِ نمونہ حسب ذیل روایات ملاحظہ ہوں:

قال ابو عبدالله عليه السلام يا ابا عمروا رأيت لو حدثتك

بحدیث او افتیتک بفتیا ثم جئتنی بعد ذلک فسألتنی عنه فاخبرتک بخلاف ذلک بایهما کنت تاخذ قلت باحدثهما وادع الآخره فقال حق اصبت یا ابا عمرو ابی الله الا ان یعبد سرًا اما والله لئن فعلتم ذلک انهٔ خیرٌ لی ولکم وابی الله عزوجل لنا ولکم فی دینه الا التقیة.

شیعوں کے ادیب اعظم مولوی ظفر حسین صاحب نے اس کا یہ ترجمہ لکھا ہے:

''فرمایا حضرت ابوعبداللہ (یعنی امام جعفر صادق) علیہ السلام نے، اے ابوعمرو! اگر میں تجھ سے ایک بات بیان کروں یا ایک فتویٰ دوں پھر تم دوبارہ مجھ سے وہی سوال کرو اور میں پہلے کے خلاف جواب دوں تو تم کس پر عمل کرو گے۔ میں نے کہا نئی بات پر اور دوسری کو چھوڑ دوں گا۔ فرمایا تم نے ٹھیک کہا۔ اللہ چاہتا ہے کہ اس کی عبادت پوشیدہ طور پر کی جائے۔ خدا کی قسم! اگر تم نے ایسا کیا تو میرے اور تمہارے دونوں کے لئے بہتر ہوگا۔ اور اللہ نے امر دین میں تمہارے اور ہمارے لئے ''تقیہ'' چاہا ہے۔''

(الشافی ترجمہ اصول کافی جلد دوم ص ۲۴۱)

(۲) قال ابوعبداللہ علیه السلام ما بلغت تقیّة احد تقیّة اصحاب الکهف انهم کانوا یشهدون الاعیاد ویشدون لزنانیر فاعطاهم الله اجرهم مرّتین.

ترجمہ: فرمایا حضرت ابوعبداللہ (یعنی امام جعفر صادق) علیہ السلام نے نہیں پہنچا کسی کا تقیہ اصحابِ کہف کے تقیہ کو کہ وہ قوم کی عیدوں میں حاضر ہوتے تھے اور از روئے تقیہ زنار باندھتے تھے۔ پس اللہ نے ان کو دوبارا اجر عطا فرمایا۔'' (شافی شرح اصول کافی ج ۲، ص ۲۴۱)

ان روایات سے ثابت ہوا کہ ایک سوال کے دو متضاد جوابات دینے اور اپنے مذہب کو چھپا کر شعائر کفر کو ظاہر کرنے کا نام تقیہ[1] ہے اور مودودی صاحب نے بھی مذکورہ متضاد اقوال میں غالباً تقیہ پر عمل کیا ہے۔

(۱) تقیہ وغیرہ مسائل کی تفصیل کے لئے میرے والد حضرت مولانا محمد کرم الدین صاحب مرحوم کی کتاب ''آفتاب ہدایت'' قابلِ مطالعہ ہے۔

حضرت مدنیؒ کا گرامی نامہ

مفتی محمد یوسف صاحب کو مدرسے سے الگ کردیں

''علمی جائزہ'' کے مصنف مفتی محمد یوسف صاحب دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں مدرس رہے ہیں۔ اس دوران میں وہ طلبہ کو مودودیت سے متاثر کرنے کی درپردہ کوشش کرتے رہے ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب (ایم.این.اے) دامت فیوضھم بغرضِ اصلاح ان سے نرمی کا برتاؤ کرتے رہے۔ لیکن مفتی صاحب اندر ہی اندر اپنے مشن میں سرگرم رہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کو جب مفتی محمد یوسف صاحب کی مودودیت کی اطلاع ملی تو حضرت نے مولانا سید گل بادشاہ صاحب مرحوم ساکن طورو ضلع مردان (صدر جمعیت علمائے اسلام صوبہ سرحد) کو مفتی محمد یوسف صاحب کے متعلق حسب ذیل گرامی نامہ ارسال فرمایا:

محترم المقام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بعافیت ہوں گا۔ مجھ کو بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مولوی محمد یوسف صاحب فاضل مدرسہ امینیہ دہلی جو کہ آج کل مدرسہ دارالعلوم حقانیہ میں مدرس ہیں، سخت قسم کے مودودی ہیں۔ مولانا عبدالحق صاحب چشم پوشی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ مولانا یوسف صاحب کو اوّل سمجھائیں۔ اگر وہ تائب ہوجائیں اور ان کی توبہ پر یقین ہوجائے تو خیر[1] ورنہ ان کو مدرسہ سے الگ کردیں۔ مولانا عبدالحق صاحب کو بھی یقین ہے کہ وہ ایسے ہیں مگر تساہل سے کام لے رہے ہیں۔

والسلام (۱۳ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ)

(۱) شیخ العرب والعجم حضرت مولانا مدنی قدس سرہٗ کے اس کرامت نامہ کی نقل مجھے حضرت مولانا سید گل بادشاہ صاحب مرحوم (سابق صدر جمعیت علمائے اسلام سرحد) نے بھیجی تھی۔ سید صاحب مرحوم اور یہ خادم اہل سنت دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۵۸ھ کے دورۂ حدیث میں شریک رہے ہیں۔
سید گل بادشاہ صاحبؒ عموماً اپنے گرامی نامہ سے مشرف فرماتے رہتے تھے۔ آپ ایک مجاہد اور جانباز عالم تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی آپ نے چند سال جیل میں گزارے ہیں۔ عموماً ارباب اقتدار کے زیر عتاب رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس نصیب فرمائیں۔ آمین بجاه النبی الکریم ﷺ۔

(نـــوٹ: حضرت مدنی کا یہ گرامی نامہ ترجمانِ اسلام لاہور ۲۹ نومبر ۱۹۶۸ء میں بھی شائع ہو چکا ہے) گرامی نامہ میں حضرت مدنی ؒ کے مفتی محمد یوسف صاحب کے متعلق یہ الفاظ کہ: ''اور ان کی توبہ پر یقین ہوجائے'' حضرت کی مودودیت کے متعلق خداداد بصیرت پر مبنی ہیں۔ ایک عالم و مدرس جو مفتیٔ اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے شاگرد ہیں، مدرسہ امینیہ دہلی کے سند یافتہ ہیں۔ وہ بظاہر مودودیت سے توبہ بھی کریں تو قابلِ اعتماد نہیں۔ کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ وہ از روئے تقیہ توبہ کریں اور اندر سے وہ مودودی ہی رہیں اور بانی جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی کی مندرجہ بالا متضاد تحریرات سے واقف ہونے کے بعد تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تحریکِ مودودیت میں تقیہ بھی کارفرما ہے، تو کیا ایسی تحریک اہل سنت والجماعت کے نزدیک قابلِ اعتماد ہوسکتی ہے؟

خادم اہل سنت الاحقر مظہر حسین غفرلہٗ

مدنی جامع مسجد چکوال (پاکستان)

ضمیمہ علمی محاسبہ (۳)

''امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فریضۂ رسالت میں کوتاہیاں کیں۔''

مودودی، جماعت اسلامی کے بانی اور امیر اوّل ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد دوم طبع اول سورۃ یونس کی تفسیر میں حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں یہ لکھا تھا: ''تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یونسؑ سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں الخ۔''

بندہ کی طرف سے اس پر اعتراض اور مفتی محمد یوسف صاحب کی طرف سے جواب الجواب کی تفصیلات علمی محاسبہ میں بیان کردی گئی ہیں۔ قارئین حضرات دوبارہ ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ اب یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کا مذکورہ باطل نظریہ صرف حضرت یونسؑ تک محدود نہ تھا بلکہ اس سلسلے میں ترقی کرتے کرتے ان کا بے باک قلم یہاں تک پہنچ گیا کہ انہوں نے امام الانبیاء ﷺ کے بارے میں بھی پوری وضاحت سے یہ لکھ دیا کہ آنحضرت ﷺ سے بھی فریضہ رسالت میں کوتاہیاں ہوگئی تھیں اور یہ باطل نظریہ انہوں نے قرآن ہی سے اخذ کیا ہے، العیاذ باللہ. چنانچہ اُنہوں نے اپنے ایک کتابچہ بنام ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' چودھویں ایڈیشن، نومبر ۱۹۸۱ء کے آخر میں ص ۱۵۶، ۱۵۷ پر سورۃ النصر کے ترجمہ اور تفسیر کے تحت اپنے اس باطل نظریے کا اظہار کیا ہے۔ اُنہوں نے پہلے اس سورۃ کا حسب ذیل ترجمہ لکھا ہے:

''جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح نصیب ہوچکی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہورہے ہیں تو اب اپنے رب کی حمد وثنا اور اس سے درگذر کی

درخواست کرو، وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔" (ص ۱۵۶)

پھر اس سورۃ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "(مذکورہ) آیت میں نبی ﷺ سے اس موقع پر خطاب کیا گیا ہے۔ جب کہ ۲۳ سال مسلسل جدوجہد سے عرب میں اللہ کے دین کی تکمیل ہو چکی تھی۔ اسلام اپنی پوری تفصیلی صورت میں ایک اعتقادی و فکری، اخلاقی و تعلیمی، تمدنی و معاشرتی اور معاشی اور سیاسی نظام کی حیثیت سے عملاً قائم ہو گیا تھا اور عرب کے مختلف گوشوں سے وفد پر وفد آ کر اس نظام کے دائرے میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس طرح جب وہ کام تکمیل کو پہنچ گیا جس پر محمد ﷺ کو مامور کیا گیا تھا تو آپ سے ارشاد ہوتا ہے کہ اس کارنامے کو اپنا کارنامہ سمجھ کر کہیں فخر نہ کرنے لگنا۔ نقص سے پاک بے عیب ذات اور کامل ذات صرف تمہارے رب ہی کی ہے، لہٰذا اس کارِ عظیم کی انجام دہی پر اس کی تسبیح اور حمد و ثنا کرو اور اس ذات سے درخواست کرو کہ مالک اس ۲۳ سال کے زمانۂ خدمت میں اپنے فرائض کے ادا کرنے میں جو خامیاں اور کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہو گئی ہوں انہیں معاف فرمادے۔" (ص ۱۵۷)

مودودی صاحب خود بے داغ ہیں:

(۱) ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنی خاص شان بلند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "خدا کے فضل سے میں کوئی کام یا کوئی بات جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کیا اور کہا کرتا۔ ایک ایک لفظ جو میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے تول تول کر کہا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا حساب مجھے خدا کو دینا ہے نہ کہ بندوں کو۔ چنانچہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے کوئی ایک لفظ بھی خلافِ حق نہیں کہا۔"

(رسائل و مسائل، حصہ اول ص ۳۶، طبع دوم وطبع تیسویں، ص ۱۹۳، اگست ۱۹۹۸ء)

(۲) لاہور میں منعقدہ جماعت اسلامی کی کل پاکستان چار روزہ کانفرنس ۲۵ تا ۲۸-اکتوبر ۱۹۶۲ء میں مودودی صاحب نے اپنی جماعت کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں اپنے سب مخلص بھائیوں کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اللہ کے فضل سے مجھے کسی مدافعت کی حاجت نہیں۔ میں کہیں خلا میں سے یکا یک نہیں آ گیا ہوں۔ اس سرزمین میں سالہا سال سے کام کر رہا ہوں۔ میرے کام سے لاکھوں آدمی براہِ راست واقف ہیں۔ میری تحریریں صرف اس ملک میں نہیں، دُنیا کے ایک اچھے خاصے حصے میں پھیلی ہوئی ہیں اور میرے رب کی مجھ پر یہ عنایت ہے کہ اس نے میرے دامن کو داغوں سے محفوظ رکھا ہے۔"

(روزنامہ مشرق لاہور، ۲۹-اکتوبر ۱۹۶۲ء) یہ تقریر مودودی جماعت ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع کر چکی ہے۔

تنقیدی نشتر

مودودی صاحب نے اپنے سالہا سال کے کام کی تعریف کرتے ہوئے اپنے بارے میں یہ وضاحت کر دی کہ میرے رب کی مجھ پر یہ عنایت ہے کہ اس نے میرے دامن کو داغوں سے محفوظ رکھا ہے۔ یعنی ان کی سالہا سال کی زندگی بے داغ ہے، لیکن جب انہی مودودی صاحب نے آنحضرت ﷺ کی ۲۳ سالہ رسالت کی زندگی کا تجزیہ کیا تو بلا کسی تأمل کے یہ لکھ دیا کہ آنحضرت ﷺ سے ۲۳ سالہ زمانۂ خدمت میں اپنے فرائض ادا کرنے میں جو کوتاہیاں اور خامیاں سرزد ہو گئی تھیں، اللہ تعالیٰ آپ کو ان سے توبہ کرنے کا حکم دے رہا ہے، العیاذ باللہ. مودودی صاحب نے یہ ناپاک، زہریلا تنقیدی نشتر اس ذاتِ قدسی صفات پر چلایا ہے جو امام کائنات ہیں، سرورِ کون و مکان ہیں، رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین اور شفیع المذنبین ہیں اور مقامِ محمود پر سرفراز اور قیامت میں خصوصی طور پر شفاعت کبریٰ کا استحقاق رکھتے ہیں اور یہ تحریر اس مودودی کے ناپاک قلم نے لکھی ہے جس کا نہ تفسیر قرآن میں کوئی اُستاد ہے نہ ہی صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں۔ لیکن تعجب ہے ان تعلیم یافتہ لوگوں پر جو اس قسم کی تحریرات سے واقف ہونے کے باوجود ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو نہ صرف مفسرِ قرآن اور مفکرِ اسلام بلکہ امامِ وقت مانتے ہیں۔

اور مودودی جماعت میں سب سے زیادہ وہ سرمایہ دار شخص بد بخت ہے جس نے مودودی صاحب کا یہ ناپاک قلم غالباً تیرہ چودہ لاکھ روپے میں خریدا ہے (العیاذ باللہ)

آیت کا صحیح مطلب:

(۱) زیر بحث آیت میں واستغفرہ کا مطلب بیان کرتے ہوئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی ایسے اُمور جو خلافِ اولیٰ واقع ہوئے ہیں ان سے مغفرت مانگیے۔'' (تفسیر بیان القرآن)

(۲) شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سورۃ محمد کی آیت ۱۹ واستغفر الخ کے تحت لکھتے ہیں: ''ہر ایک کا ذنب (گناہ) اس کے مرتبہ کے موافق ہوتا ہے۔ کسی کا بہت اچھا پہلو چھوڑ کر کم اچھا پہلو اختیار کرنا گو وہ حدود جواز واستحسان میں ہو بعض اوقات مقربین کے حق میں ذنب (گناہ) سمجھا جاتا ہے۔ حسنات الابرار سیئات المقربین کے یہی معنی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ دن میں سو بار استغفار فرماتے تھے۔'' (فوائد عثمانی حواشی قرآن مجید) تو کیا مودودی صاحب کے نظریہ کے تحت نبی کریم ﷺ دن میں سو بار اپنے فرائض رسالت میں کوتاہیاں کرتے تھے، العیاذ باللہ۔

(۳) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مفتیٔ اعظم پاکستان رحمہ اللہ سورۃ یونس کی تفسیر میں مذکورہ مودودی باطل نظریہ (یعنی حضرت یونس علیہ السلام سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوگئی تھیں) کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''اس اَمر میں کسی فرد اور کسی شخص کا اختلاف نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب ادائے رسالت کے فریضہ میں کبھی کوتاہی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انبیاء کے لئے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں کہ جس منصب کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب فرمایا وہ خود اس میں کوتاہی کر بیٹھیں۔''

(معارف القرآن، سورۃ یونس)

(۴) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ ہی حضرت آدم علیہ السلام کے استغفار کے

تحت مسئلہ عصمت انبیاء علیہم السلام کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ایسے واقعات کا حاصل باتفاقِ اُمت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطا ونسیان کی وجہ سے اُن کا صدور ہو جاتا ہے۔ کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا۔ غلطی اجتہادی ہوتی ہے یا خطا ونسیان کے سبب قابلِ معافی ہوتی ہے جس کو اصطلاحِ شرع میں گناہ نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ سہو ونسیان کی غلطی ان سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ وتعلیم اور تشریع سے ہو، بلکہ ان سے ذاتی افعال واعمال میں ایسا سہو ونسیان ہو سکتا ہے (تفسیر بحر محیط) مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے اور بڑوں سے چھوٹی غلطی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس پر عتاب بھی کیا گیا، اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ نہیں (تفسیر معارف القرآن جلد دوم)

اور حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں سورۃ طٰہٰ آیت نمبر ۱۲۱ میں جو فرمایا ہے: وعصیٰ آدمُ ربهٗ فغویٰ. (۱) اور آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا، سو غلطی میں پڑ گئے (ترجمہ حضرت تھانویؒ) (۲) اور آدم نے (نادانستہ) اپنے رب کا قصور کیا، پس وہ غلطی میں پڑ گیا۔ (ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین مفسر دہلوی) (۳) اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں: یعنی حکمِ الٰہی کے امتثال میں غفلت وکوتاہی ہوئی تو اپنی شان کے موافق عزم واستقامت کی راہ پر ثابت قدم نہ رہے۔ اس کو غوایت وعصیان سے تغلیظاً تعبیر فرمایا۔ حسنات الابرار سیئات المقرّبین (فوائد عثمانی) غرضیکہ حضرت آدم اور حضرت حوّا کو جو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: فلا تقربا هٰذهِ الشّجرة (تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا) تو اس حکم کا تعلق اُمت کی تعلیم وتبلیغ سے نہیں تھا، اس لئے اس میں لغزش کا صدور ہو گیا اور وہ بھی نسیان کی وجہ سے چنانچہ فرمایا۔

فنسی آدم (حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے) تو حضرت آدم علیہ السلام کا

یہ فعل حقیقتاً کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں تھا، بلکہ اس کو جو عصیان اور غوایت سے تعبیر فرمایا تو وہ صورتاً عصیان تھا نہ کہ حقیقتاً۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

مودودی صاحب نے تفسیر تفہیم القرآن میں واستغفرہ کے تحت لکھا ہے:

"یعنی اپنے رب سے دُعا مانگو کہ جو خدمت اس نے تمہارے سپرد کی تھی اس کو انجام دینے میں تم سے جو بھول چوک یا کوتاہی بھی ہوئی ہو اس سے چشم پوشی اور درگذر فرمائیں (تفہیم القرآن جلد ششم، طبع پنجم، اگست ۱۹۷۵ء، ص ۵۱۷)

گو اس سے بھی فریضہ رُسالت کی ادائیگی میں کوتاہی ثابت ہوئی ہے کیونکہ جو خدمت اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ کے سپرد کی وہی رسالت کا فریضہ ہے، لیکن اس میں چونکہ فریضۂ رسالت کے الفاظ نہیں ہیں اس لئے مودودی جماعت کی طرف سے یہ تاویل پیش کی جاسکتی ہے کہ مودودی صاحب نے "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" کے الفاظ سے رجوع کرلیا تھا، لیکن یہ بھی محض مغالطہ ہی ہے، کیونکہ تفسیر تفہیم القرآن، طبع پنجم والی عبارت اگست ۱۹۷۵ء کی ہے، اور قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں والی عبارت اس کے چھ سال بعد ۱۹۸۱ء کی ہے۔ اس لئے رجوع کرنے کی تاویل بھی یہاں کام نہیں دے سکتی۔ اور بہرحال مودودی صاحب کا امام الانبیاء ﷺ کی طرف فرائضِ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں منسوب کرنا ایک بہتانِ عظیم ہے، جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی رسالت بھی مشکوک ہوجاتی ہے، العیاذ باللہ۔ كبرت كلمة تخرج من افواههم ان يقولون الا كذبا. (سورۃ الکہف) بڑی بھاری بات ہے جو اُن کے منہ سے نکلتی ہے اور وہ لوگ بالکل ہی جھوٹ بکتے ہیں۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

حضرت مدنیؒ کا ارشاد

(۱) شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ارشاد فرمایا:

اسلام کے نام پر بہت سی جماعتیں وجود میں آئیں لیکن یہ جماعت جو جماعتِ اسلامی کے نام سے ہے ان تمام جماعتوں سے بہت زیادہ خطرناک ہے۔ (۲) حدیث میں جو اُمت کے تہتر (۷۳) فرقوں کی خبر آئی ہے اور صرف ایک فرقہ کو ناجی اور دوسرے تمام فرقوں کو غیر ناجی فرمایا گیا ہے میں دلائل و براہین کی روشنی میں پورے شرح صدر سے کہتا ہوں کہ یہ جماعتِ اسلامی انہی غیر ناجی فرقوں میں سے ہے۔ (شیخ الاسلام نمبر، مطبوعہ الجمعیۃ دہلی)

حضرت مدنیؒ نے مودودی جماعتِ اسلامی کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے یہ محض قیاس آرائی نہیں بلکہ اس کی بنیاد وہ وہبی علم ہے جو حق تعالیٰ نے اس عظیم مودودی فتنے کے بارے میں آپ کو عطا فرمایا تھا۔ اور یہ جماعتِ اسلامی حصولِ اقتدار کے لئے گوناگوں نئے نظریات تراشتی رہتی ہے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مودودی جماعتِ اسلامی کے موجودہ امیر قاضی حسین احمد نے یہاں عیسائیوں کو بھی جماعتِ اسلامی کا ممبر بنایا ہے اور جماعتِ اسلامی کے فارم اُن سے پُر کرائے ہیں اور بنگلہ دیش میں جماعتِ اسلامی نے جماعتِ اسلامی کا ممبر بنانے کے لئے ہندوؤں سے فارم پُر کرائے ہیں۔ یہ ہے مودودی کی جماعتِ اسلامی کی حیثیت وحقیقت کہ ایک غیر مسلم بھی جماعتِ اسلامی کا ممبر بن سکتا ہے۔

خمینی اور مودودی بھائی بھائی:

(۱) ایران کے خمینی صاحب نے اپنی کتاب کشف الاسرار بزبان فارسی میں لکھا ہے کہ "امامت یک اصل مسلّم است کہ خدا آں را در قرآن ذکر کردہ" (کشف الاسرار، ص ۱۱۱) یعنی امامت دین کے مسلّمہ اصولوں میں سے ایک اصل ہے جس کا ذکر خدا نے قرآن میں کیا ہے۔

(۲) شیعیان بعد از گزشتن پیغمبر اسلام باسنیاں دراین دو موضوع کہ حکم ہر دوراازخرد گرفتیم مخالفت داشتند (کشف الاسرار، ص ۱۱۲) یعنی پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد ان

دونوں موضوعوں میں جن کا تعلق امامت سے ہے، جن کا حکم ہم نے عقل سے دریافت کیا ہے، سنیوں سے مخالفت رکھتے تھے، اور اسی سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ''بشہادت تواریخ معتبرہ اینان بکار دفن پیغمبر مشغول بودند کہ جلسہ سقیفہ ابوبکر را بحکومت انتخاب کرد وایں خشت کج بنا نہادہ شد پس از دورۂ اول اسلام باز ایں گفتگو در بین این دو دستہ بود شیعیان کہ پیروان علی ہستند میگویند کہ امامت را باید خدا تعیین کند بحکم خرد و خلفاء و سلاطین لائق آن نیستند وعلی واولادِ معصومین او اولوا الامر ند کہ خلاف گفتہ ہای خدا ہیچگاہ نگفتہ ونگویند واین نیز بتعیین پیغمبر اسلام است (ایضاً ص۱۱۲) اور معتبر تواریخ کی شہادت ہے کہ یہ مذکورہ بزرگ اصحاب یعنی حضرت علی وغیرہ پیغمبرِ اسلام کے دفن کے کام میں مشغول تھے کہ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجلاس نے حضرت ابوبکر کو خلافت کے لئے منتخب کر دیا۔ اور اس دن اس ٹیڑھی اینٹ کی بنیاد رکھی گئی۔ اسلام کے دورِ اوّل کے بعد پھر ان دونوں (سنی، شیعہ) گروہوں کے مابین یہ گفتگو جاری رہی ہے۔ شیعہ جو حضرت علی کے پیرو ہیں، یہ کہتے ہیں کہ عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ امامت کا تعیّن خدا کے ذمّہ ہے اور خلفاء وسلاطین اس کے لائق نہیں اور حضرت علی اور اُن کی معصوم اولاد ہی اولی الامر ہیں کہ احکامِ خدا کے خلاف نہ اُنہوں نے کوئی بات کہی ہے اور نہ کہتے ہیں۔ اور اس کی تعیین پیغمبر اسلام کی طرف سے بھی ہے۔

(۳) خمینی صاحب بارہ اماموں کے بارے میں لکھتے ہیں: **وان من ضروریات مذہبنا ان لائمتنا مقامًا لا یبلغہ ملک مقرب ولا نبی مرسل.**

(الحکومت الاسلامیہ ص ۵۶، طبع ایران)

ایک شیعہ عالم سید صفدر حسین نجفی سابق پرنسپل جامعۃ المنتظر لاہور نے مذکورہ عبارت کا ترجمہ حسب ذیل لکھا ہے: ''اور یہ بات ہمارے مذہب کی بدیہیات میں سے ہے کہ کوئی شخص (ہمارے) ائمہ علیہم السلام کے مقدّس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہاں تک کہ ملک مقرّب اور نبی مرسل بھی۔''

(۴) اور خمینی صاحب کی کشف اسرار میں ایک عنوان ہے ''مخالفت ہائے ابو

باقرآن'' اور ایک دوسرا عنوان ہے: ''مخالفت عمر باقرآن خدا'' امام الخلفاء حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو ان کا مذکورہ بالا عقیدہ یہ ہے کہ اُنہوں نے قرآن کی مخالفت کی ہے، العیاذ باللہ۔ لیکن یہی خمینی سید ابوالاعلیٰ مودودی کے انتقال پر اپنے تعزیت نامے میں لکھتے ہیں: ''سید مودودی صرف پاکستان میں ہی نہیں پورے عالمِ اسلام کے قائد تھے۔ ان کی اسلامی فکر نے پوری اسلامی دنیا میں اسلامی انقلاب کی تحریک برپا کر دی۔ ان کے مشن کو آگے بڑھانے کی بہت ضرورت ہے۔'' (ہفت روزہ شیعہ لاہور، یکم تا ۸-اکتوبر ۱۹۷۹ء)

نتیجہ:

خمینی صاحب حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو تو قرآن کا مخالف قرار دیتے ہیں، العیاذ باللہ۔ لیکن اس کے برعکس مودودی صاحب کو عالمِ اسلام کا قائد مانتے ہیں۔ اس سے وہی نتیجہ نکلتا ہے جو عارف باللہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں دلائل و براہین کی روشنی میں پورے شرح صدر سے کہتا ہوں کہ یہ جماعتِ اسلامی انہی غیر ناجی فرقوں میں سے ہے، سچ ہے۔ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔

حق تعالیٰ ہم سب اہل السنۃ والجماعۃ کو عصر حاضر کے گوناگوں خلافِ اسلام فتنوں سے محفوظ رکھیں اور اس فانی زندگی میں اپنی مرضیات کی توفیق دیں۔ آمین بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم۔

خادم اہلسنت مظہر حسین غفرلہٗ

یکم شعبان ۱۴۲۲ھ، ۱۹-اکتوبر ۲۰۰۱ء

خُدام اہلِ سنت کی دُعا

از: حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب، بانی و امیر تحریک خدام اہل سنت پاکستان

خُدایا اہلِ سُنت کو جہاں میں کامرانی دے
خلوص و صبر و ہمت اور دیں کی حکمرانی دے

تیرے قرآن کی عظمت سے پھر سینوں کو گرمائیں
رسول اللہ کی سُنت کا ہر سُو نور پھیلائیں

وہ منوائیں نبی کے چار یاروں کی صداقت کو
ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ کی خلافت کو

صحابہ اور اہل بیت سب کی شان سمجھائیں
وہ ازواجِ نبی پاک کی ہر شان منوائیں

حَسنؓ اور حُسینؓ کی پیروی بھی کر عطا ہم کو
تو اپنے اولیاء کی بھی محبت دے خدا ہم کو

صحابہ نے کیا تھا پرچم اسلام کو بالا
انہوں نے کر دیا تھا رُوم و ایراں کو تہ و بالا

تیری نصرت سے پھر ہم پرچم اسلام لہرائیں
کسی میدان میں بھی دشمنوں سے ہم نہ گھبرائیں

تیرے کُن کے اشارے سے ہو پاکستان کو حاصل
عروج و فتح و شوکت اور دین کا غلبہَ کامل

ہو آئینی تحفظ ملک میں ختمِ نبوّت کو
مٹا دیں ہم تیری نُصرت سے انگریزی نبوّت کو

تو سب خُدام کو توفیق دے اپنی عبادت کی
رسول پاکؐ کی عظمت، محبت اور اطاعت کی

ہماری زندگی تیری رضا میں صرف ہو جائے
تیری راہ میں ہر اک سُنّی مسلماں وقف ہو جائے

تیری توفیق سے ہم اہل سنت کے رہیں خادم
ہمیشہ دینِ حق پر تیری رحمت سے رہیں قائم

نہیں مایوس تیری رحمتوں سے مظہرؔ ناداں
تیری نصرت ہو دنیا میں قیامت میں تیری رضواں

(۲ محرم الحرام ۱۳۹۳ھ مطابق ۶ فروری ۱۹۷۳ء)

